عہد ساز لڑکیاں

مُصنّفہ

ایلیا فورسی

مترجمہ

محمود ہاشمی

پبلشر: دفتر خاتونِ مشرق، اُردو بازار، دہلی ۶

Title of the original : WOMEN WHO REACHED FOR TOMORROW
Author : Aylesa Forsee
Original publisher : Macrae Smith Company, Philadelphia

بار ——————— اول
تعداد ——————— تین ہزار
طباعت ——————— سودلیتھوپریس دہلی
قیمت ——————— دوروپے پچاس پیسے

پبلشر
خاتون مشرق
اردو بازار
دھلی

فہرست

(۱)

اوڈرے ہیپ برن

اسٹیج اور بیرونِ اسٹیج کی باکمال شخصیت

سینما کے وہ شائقین جنھوں نے اوڈرے ہیپ برن کو "رومن ہالی ڈے" میں دیکھا ہے۔ اسے پردہ سیمیں پر دیکھ کر یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ اوڈرے ایک ایسی خوش بخت شخصیت ہے جو زیادہ محبوبیت حاصل ہونے کے باعث آسانی کے ساتھ بہترین اداکارہ بن گئی ہے لیکن اوڈرے نے اپنی ابتدائی عمر غربت، تنگ دستی اور خطرات میں بسر کی ہے یہاں تک کہ ہالی ووڈ کے زمانے میں بھی اس کے مصائب جھیلے ہیں۔

افریقہ میں "دی نَنس اسٹوری" کو فلمائے جانے کے دوران میں اوڈرے مقامی باشندوں کی ایک جماعت کے ساتھ گھنٹوں دھوپ کی شدید تمازت میں پیاسی تڑپتی رہی۔ اور جب پانی میسر آیا تو اوڈرے نے تمام تر سخاوت کے ساتھ گلاس بھر بھر کر اپنے ساتھیوں کو پانی پلا دیا، لیکن اپنے لئے کچھ نہ بچایا۔ وہ بے حد ستم رسیدہ تو نہیں ہے لیکن اس کی ابتدائی زندگی کے تجربات نے اسے اطاعت اور رحم دلی کا سبق سکھایا ہے۔

کرسٹی اوڈرے کیتھلین ہیپ برن، مئی سنہ ۱۹۲۹ء میں برسلز (بلجیم) میں پیدا ہوئی تھی، لیکن اپنے اینگلو آئرش باپ کی طرح وہ بھی خود بخود برطانی شہری بن گئی۔ اس کی حسین اور مضطرب ماں ہیمسٹرا کے ایک خطاب یافتہ معزز ڈچ گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ خاندان سیاسی حلقوں میں ممتاز تھا۔ جے۔ اے ہیپ برن رسٹن سے شادی کے وقت اوڈرے کی ماں ایک طلاق یافتہ خاتون تھیں اور پہلے شوہر سے دو لڑکے بھی تھے۔ جے۔ اے ہیپ برن اس وقت برسلز کے ایک بینک سے وابستہ تھے۔

شہر سے باہر ایک بڑی حویلی میں اوڈرے اور اس کے دو بڑے سوتیلے بھائیوں نے لانوں
میں دوڑیں لگائیں، درختوں پر چڑھے۔ ایک ساتھ کھیل کھیلے، ان سے اس کے جسم اور خیالات کی
تربیت ہوئی۔ اوڈرے کو گڑیوں سے بہت کم دلچسپی تھی، اسے جانور زیادہ پسند تھے کتے، بلیاں
اور خرگوش جو اس کی طرح چاق چوبند تھے، اسے بہت اچھے لگتے تھے۔

جب اوڈرے تنہا ہوتی تو کسی پوشیدہ گوشے میں کسی جھاڑی کے تلے جا بیٹھتی، جہاں وہ تصویریں
بناتی یا اپنے خیالوں میں کھو جاتی۔ چار برس کی ہو جانے کے بعد اس کی سردیاں انگلینڈ کے ایک بورڈنگ
اسکول میں گزریں۔ اس کے بعد اس کے خاندان نے کچھ عرصہ اسی ملک میں گزارا، لیکن اوڈرے کے
والدین کے درمیان کشیدگی شروع ہو گئی۔ مسٹر ہیپ برن، جو تجارتی ترقیات کے سرگرم کارکن تھے،
کمیونسٹوں کے شدید مخالف بن گئے اور جب وہ سر اوسوالڈ موزلیس بلیک شرٹس کی تحریک میں شامل ہو گئے
جو فاشسٹوں کی برطانوی تنظیم تھی تو اوڈرے کی ماں شوہر سے الگ ہو گئیں۔ اس وقت اوڈرے
دس برس کی ہو چکی تھی۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ مسز ہیپ برن نے سوچا کہ انگلینڈ کی
نسبت ہالینڈ زیادہ محفوظ رہے گا، چنانچہ وہ اپنے بے باپ کے بچوں کو اپنے والدین کے گھر لے آئیں جو
ارنہیم کے قریب ایک چھوٹے سے دیہات میں رہتے تھے۔ اوڈرے کو انگریزی اور فرانسیسی آتی تھی،
لیکن اب اسے اپنے ننہال کی زبان سیکھنی تھی۔ شروع شروع میں اس نے خود کو اپنے ہم جماعتوں اور
ساتھ کھیلنے والوں میں تنہا محسوس کیا۔ لیکن جب وہ کوئی غلط تلفظ بولتی تھی تو اس کے ساتھی اس کا
مذاق اڑاتے تھے۔

علمی موضوعات کے علاوہ اوڈرے نے پیانو اور موسیقی کے اصولوں کا بھی مطالعہ کیا۔
ڈرائنگ اور بیلے کے بھی سبق لئے۔ ایک روز اسے سیڈلرس ویلس بیلے کمپنی کا پروگرام دیکھنے کا
موقع ملا۔ بیلے دیکھ کر وہ اس قدر متاثر ہوئی کہ اس نے بیلے ڈانسر بننے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے آپ سے
وعدہ کیا کہ وہ اب اس سے زیادہ محنت کرے گی جتنی اب تک کرتی رہی ہے۔

دوسرے دن جرمن نازیوں نے نیدرلینڈ پر حملہ کر دیا۔ اوڈرے کو تو اس کا یقین نہیں آیا، لیکن
بڑے لوگ جس انداز سے جنگ کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے، اس سے اوڈرے کو یوں محسوس ہونے لگا

جیسے برسانے سے دہشت پھیلتی رہی ہے۔ جوں ہی انگریزوں نے اتحادیوں کی مدد سے جرمنوں کو ہالینڈ سے نکالنے اور ان کے جوابی حملوں کو روکنے کی کوشش کی، آسمانوں پر رات کے وقت بمبار گرجنے لگے شہری آبادی کی نقل و حرکت بند ہو گئی خوراک اور ایندھن کا کال پڑ گیا، اجتماعات ختم ہو گئے، نہ ریڈیو پروگرام رہے، اور نہ ہی کتابیں۔

جب شہر کے معاونین نے ارنہیم کو خالی کرنے کا حکم دیا تو سڑکیں اور شاہراہیں ان نوے ہزار بے گھر افراد سے کھچا کھچ بھر گئیں جو مایوسی کے عالم میں کسی جائے پناہ کی تلاش میں تھے، اوڈرے کے نانا اور نانی نے اپنے گھر میں چالیس پناہ گزینوں کو بسا لیا، حالانکہ ان کے پاس ان پناہ گزینوں کے لئے خوراک بہت کم تھی۔

ڈچ باشندوں نے ایک خفیہ تحریک کی تنظیم کی تاکہ توڑ پھوڑ کے کاموں کے ذریعہ نازیوں کے تسلط کو کمزور کیا جا سکے اور ان انگریز پائلٹوں کو چھپایا جا سکے جن کے جہاز مار گرائے گئے تھے، ہوشیار اور چاق چوبند اوڈرے اگرچہ ابھی چھوٹی تھی، لیکن اس نے خفیہ پیغامات کی ترسیل کے لئے خود کو رضاکارانہ طور پر پیش کر دیا۔ اس کے ہاتھوں میں بانی اتفاقیہ طور پر لٹکتے ہوئے بیلے کے جوتوں کے اندر کچھ ہونے کا شبہ نازیوں کو نہیں ہو سکتا تھا اس کے قلب نما چہرے اور بڑی بڑی اداس آنکھوں نے اسے معصومیت کا ایسا مظہر بنا دیا تھا کہ اس پر کسی نے کبھی شبہ نہیں کیا۔ اوڈرے نے سیکڑوں پیغامات پہنچائے اور سیکڑوں کتابچے لوگوں میں تقسیم کئے اور بعض اوقات دشمن کی نگاہوں سے چھپا کر انگریز پائلٹوں کو خوراک بھی پہنچائی۔

جب اسکولوں کی عمارتیں مسمار ہو گئیں تو کلاسیں بھی ختم ہو گئیں۔ اوڈرے نے ایک بڑھئی کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مکان کے ایک کمرے میں بیلے کے لئے ایک بار (اسٹیج) بنائے۔ اس کمرے میں ہاتھ سے بجنے والے ایک ریکارڈ پلیئر کے ساتھ اس نے چند سینٹ فی سبق کے حساب سے بیلے کی تعلیم دینا شروع کر دی۔ بیلے کے لئے جب مخصوص تنگ لباس خریدنا تقریباً ناممکن ہو گیا تو مسز ہیپ برن نے خود یہ لباس بنانے کے لئے پرانے سویٹر ادھیڑ کر اون فراہم کیا۔

جوں جوں جنگ بڑھتی رہی، اوڈرے کی سرد مہری اور دہشت میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے رشتے لاپتہ ہو گئے۔ نازیوں نے اس کے چچا کو ایک جرمن ٹرین اڑا دینے کی سازش کی پاداش میں

گولی سے مار دیا۔ اوڈرے کا یہ چچا ان چھ آدمیوں میں شامل تھا جو یرغمال کے طور پہ دشمن کے قبضہ میں آئے تھے۔ اوڈرے کے ایک رشتے کے بھائی کو بھی، جو ڈاک کھمسٹا کا نائب تھا، پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

ظلم و جور اور کشت و خون کے احساس سے نجات پانے کے لئے اوڈرے اور کچھ دیگر اشخاص نے اپنی جان پر کھیل کر جرمنوں کے اس قانون کی، کہ کسی ایک مقام پر زیادہ لوگ جمع نہ ہوں، خلاف ورزی کی اور خفیہ طور پہ ایک مکان میں جمع ہو گئے۔ مکان کے بند دروازوں پر پہرے دار مامور کر دیئے تاکہ جرمن سپاہیوں پہ نظر رکھی جا سکے۔ پھر انھوں نے مل کر رقص کیا، گانا گایا اور خفیہ تحریک کے لئے چندہ جمع کیا۔ اوڈرے اور اس کے ایک دوست نے پیانو بجایا۔ انھوں نے رفاہ عام کے لئے اپنے فن کے کئی مظاہرے کئے۔

بیلے کے مخصوص جوتے بازار سے غائب ہو چکے تھے۔ اس لئے پہلے تو مسز ہیپ برن نے وقت کے وقت بندے کے سلیپر بنا دیئے۔ لیکن آخر کار صرف کرملی کی کھڑاؤں پر ہی گزارہ کرنا پڑا۔ پوشاک اور بیلے سے متعلق اس کی یہ محرومیاں اس کرب کے مقابلے میں بہت ہی معمولی تھیں جس سے اوڈرے کو اس وقت سابقہ پڑا جب جرمن افسروں نے اس کے ننہال کے بزرگوں کو حکم دیا کہ وہ ان دوستوں کو جو ان کے ساتھ رہ رہے ہیں، گھر سے نکال دیں۔ بعد ازاں اس نے دیکھا کہ اس کے ایک بھائی کو گھسیٹ کر بیس کیمپ کی جانب لے جایا جا رہا تھا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا اور جنگ بڑھتی رہی، ویسے ویسے خوراک کا کال بڑھتا گیا اوڈرے کے خاندان نے کئی ہفتے صرف سیم کی پھلیوں پر بسر کئے۔ ایک بار تو ان کے پاس کئی دنوں تک خوراک کے لئے صرف گھاس ہی تھی۔

" اب میں گھاس کبھی نہیں کھاؤں گی " اوڈرے نے قسم کھائی۔ وہ اپنی عمر کی نسبت زیادہ لمبی اور کمزور تھی۔ اور اب تو اور بھی نحیف ہو گئی تھی۔ اس کے سوتے اور زرد رخساروں پر سلوٹے رہتے تھے اور وہ عمدہ پیسٹریاں اور چاکلیٹ کھانے کی خواہش کھلتی رہتی تھی۔

" اگلے برس جنگ ختم ہو جائے گی، لوگ کہتے رہے، لیکن مضمحل اوڈرے سوچتی تھی کہ ان میں سے کوئی اس وقت تک زندہ بھی رہے گا جو وہ تقریباً اتنی ناتواں ہو چکی تھی کہ اس کے لئے رقص کرنا

دور کنارا چلنا پھرنا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ خفیہ تحریک کے لئے کام کرتی رہی۔

اوڈرے اب چودہ برس کی ہو چکی تھی۔ ایک دن وہ گلی میں جا رہی تھی۔ اس نے نازی وردی میں ملبوس کچھ لوگوں کو دیکھا جو اس کے اور بہت سی دوسری لڑکیوں اور عمر عورتوں کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ کیا چاہتے ہیں، اس نے دہشت زدہ ہوکر خود سے سوال کیا۔ کیا انھیں خفیہ تحریک سے اس کے تعلق کا پتہ چل گیا ہے؟

"تمھیں ہمارا ملٹری کچن چلانے میں ہماری مدد کرنی ہے" ان میں سے ایک نے سختی سے کہا اسی لمحے ایک باوردی آدمی نے قریب ہی عورتوں کے ایک گروہ کی جانب اشارہ کیا۔ اس لمحے کی بے توجہی کا فائدہ اٹھا کر اوڈرے چپکے سے وہاں سے چل دی۔ اس کا دل خوف سے دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ اپنے گھر کی جانب دوڑی اور پھر ایک ماہ تک گھر سے باہر نہیں نکلی

۱۹۴۵ء کے موسم بہار میں خبر آئی کہ اتحادیوں نے ساحل پر فوجی چوکیاں قائم کر لی ہیں۔ اوڈرے اور اس کے ساتھی شدید بے چینی کے عالم میں مزید خبروں کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ کیا ان کے ہمدرد نازیوں کی انتقامی کارروائی سے قبل، بروقت ان تک پہنچ جائیں گے؟

کچھ ہی عرصہ بعد برطانوی سپاہی ارن ہیم میں داخل ہوگئے۔ لوگ انتہائی مسرت کے عالم میں زور زور سے چلانے لگے "ہم آزاد ہیں — ہم آزاد ہیں" اس فقرے کی روح کو کچھ ہی لوگ پا سکتے ہیں، جنھوں نے کبھی اپنی آزادی کھوئی ہے۔ اوڈرے کو تو یوں محسوس ہوا جیسے اس پر راحتوں کی بارش ہوگئی ہو۔ افلاس، کرب اور دہشت ناکی کے پانچ برس آخر کار ختم ہوگئے

اوڈرے نے جو مصائب جھیلے، ان کے سبب وہ وقت سے پہلے بالغ ہوگئی تھی۔ لیکن داخلی طور پر جنگ اس میں کوئی تبدیلی نہ لا سکی۔ اب وہ پندرہ برس کی تھی۔ لیکن بیلے کی رقاصہ بننے کی خواہش اس میں بدستور موجود تھی۔

جنگ کے بعد اوڈرے اور اس کی ماں نے جنگی محاذ سے واپس آنے والے فوجیوں کے لئے عارضی طور پر ایک آرام گاہ کھول کر اس سے روزی کمانی شروع کر دی۔ پانچ برس میں پہلی بار انھیں پیٹ بھر روٹی میسر آئی تھی۔ پھر اوڈرے کی بیلے کی تربیت کے خیال سے، ماں اسے

کے ریسٹر ڈم چلی آئی۔ یہاں اوڈرے نے سونیا گمیکل نامی ایک روسی استاد سے جو نیدر لینڈ بیلے منتقل ہو گئی تھی، بیلے کی تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی۔

ابتدا میں اوڈرے میں قوت برداشت بہت کم تھی اور وہ دن میں صرف نصف گھنٹے ہی مشق کر سکتی تھی، لیکن اس کے ارادوں میں لغزش نہیں آئی تھی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس نے ربط منضبط پیدا کر لیا۔ بیلے کی تربیت نے اس کے انداز میں ایک دلکشی اور حرکات میں ایک لاابالی جذبہ پیدا کر دیا لیکن وہ ابھی تک اپنی خواہش اور شدید لگن کے مطابق اچھی رقاصہ نہیں بنی تھی۔

تین برس تک بیلے کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے لندن کے ایک مشہور بیلے اسکول کی سرپرست، مادام میری ریمبر کو اپنی آواز کا امتحان دیا، چنانچہ مادام ریمبر نے اسے ایک وظیفہ پیش کر دیا۔

اس نے اپنی ماں سے کہا "لیکن وظیفہ کی اس رقم میں گزارہ نہیں ہو سکتا" ماں نے اسے سمجھایا کہ زرِمبادلہ کی پابندیوں کے سبب وہ ہالینڈ سے کوئی رقم نہیں منگا سکتی۔

اوڈرے نے وقتی طور پر وظیفہ لینے کا خیال ترک کر دیا۔ وہ غیر اطمینانی کیفیت اور احساسِ کمتری جو اس نے بچپن میں محسوس کیا تھا، اور جو والدین کے درمیان علیحدگی ہو جانے کے سبب اسے چھپانا پڑا تھا، جنگ کے زمانے میں اور بھی بڑھتا گیا تھا، ایک اجنبی اور بڑے شہر میں گزر اوقات کے لئے خود کچھ کمانے کی صلاحیت پر اسے کوئی اعتماد نہیں تھا۔

بالآخر بیلے کی تعلیم جاری رکھنے کی شدید خواہش نے اسے حوصلہ بخشا اور یہ حوصلہ اس حد تک بڑھا کہ ایسی حالت میں جب اس کی ماں بیمار تھی اور اسے کم از کم وقتی طور پر ماں کی خدمت کے لئے گھر پر رکنا چاہئے تھا، اس نے ہمت نہ ہاری۔ اور لندن چلی گئی۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ اس کے پاس بیلے اور موسیقی کا عشق۔ نقش کشی کی غیر معمولی صلاحیت اور شدید جانفشانی کی عادت کا انفرادی سرمایہ تھا۔ لیکن ابتدا میں یہ سرمایہ اس کے کسی کام نہ آیا اور وہ تنگ دستی کے عالم میں گزر کرتی رہی۔

بیلے کی کلاس میں پہنچ کر اوڈرے کو خوشی بھی ہوئی اور کچھ مایوسیوں سے بھی سابقہ پڑا۔ یہاں اس نے خود کو دوسرے طلبا کے مقابلے میں کم تر درجے کا پایا۔ ان طالب علموں نے کچھ خاص فنی نکتے اس عرصہ میں سیکھے تھے، جب وہ تعلیم میں شامل نہیں رہی تھی۔ چنانچہ اس نے کام کرنے

کی وزن بڑھائی اور سخت ترین محنت کو اپنا دستور بنالیا اور وہ باضابطہ طور سے اس پر کاربند رہی لیکن اس شدید کشاکش نے اسے مضمحل کر دیا۔

مادام ریمبر نے اس کی حالت دیکھ کر مشورہ دیا کہ وہ اپنی مشق میں کچھ کمی کر دے۔ اور اس کے ساتھ ہی اسے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا "لیکن کمی کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بے ڈھنگا پن پیدا ہو جائے بیلے کے طرز میں فرق نہیں آنا چاہئے۔" مادام ریمبر کی عادت تھی کہ جب کسی طالب علم میں سرد خامی پیدا ہوتی، تو وہ فوراً چلا اٹھتی، اور اس طالب علم کی انگلیوں کے جوڑوں پر ضرب لگاتی تھی

پھر اوڈرے کے مزاج میں بیلے اس قدر رچ بس گیا کہ اسٹوڈیو کے باہر بھی جب وہ کسی چیز کو اٹھانے کے لئے آگے بڑھتی تو ٹانگوں میں لچک پیدا کئے بغیر ہی پنجوں کے بل کھڑی ہو جاتی تھی۔ مادام ریمبر نے اس کے یہ جوہر دیکھے تو بے حد تعریف کی، لیکن اوڈرے کو اب بھی یہ فکر لاحق تھی کہ بیلے کی رقاصہ بننے کے لئے جتنا وقت اسے میسر تھا یا جتنی گنجائش وہ نکال سکتی تھی، اس سے کہیں زیادہ وقت درکار تھا۔ پھر جب اسے اپنے رقص سے تھوڑی سی آمدنی ہوئی تو اس نے اس کا کچھ حصہ گوشت، چاکلیٹ، بیسٹریوں جیسی چیزوں پر خرچ کر دیا۔ وہ جنگ کے زمانے میں ان چیزوں کے لئے ترستی رہی تھی۔ اب اس کا وزن کچھ بڑھ گیا تھا اور اسے اپنی وضع قطع کا فکر ستانے لگا تھا

ایک دن اوڈرے کی ایک ہم جماعت سہیلی اسے ہائی بٹن شوز میں آواز کے ٹیسٹ کے لئے اپنے ساتھ لے گئی۔ جب یہ دونوں لڑکیاں منزل مقصود پر پہنچیں تو انہیں اپنی کامیابی مشکوک نظر آئی وہاں کورس میں حصہ لینے کے لئے امیدوار سیکڑوں رقاص لڑکیاں موجود تھیں۔ انتخاب صرف اس کا ہونا تھا، پھر بھی اوڈرے اور اس کی سہیلی دونوں نے ٹیسٹ دیا۔

اوڈرے کا ٹیسٹ لینے کے بعد ڈائریکٹر نے کہا "اگر تم اپنا وزن کچھ کم کر لو تو تمہیں لے لیا جائے گا۔"

واپسی پر اوڈرے نے حسرتناک لہجے میں اپنی ناکام سہیلی سے کہا "میری خواہش تھی کہ تم بھی تربیں شامل ہو سکتیں!"

وزن گھٹانے کے لئے اوڈرے نے نشاستہ دار غذا اور مٹھائیوں کا استعمال ترک کر دیا، لیکن پہلی ریہرسل کے موقع پر اس نے تمام دوسرے پیشہ ور اور نیم پیشہ ور رقاصوں

کے مقابلے میں خود کو موٹا، بھدا اور کریہہ محسوس کیا۔ اگرچہ وہ موسیقی کا شعور رکھتی تھی لیکن اس موقع پر آہنگ اور سُر کا ساتھ نہیں دے سکی۔ ریہرسل کے بعد وہ رقاصوں کے مخصوص کمرے میں ہر چیز سے کتراتی ہوئی ادھر ادھر پھرتی رہی۔ کمرے میں بیٹھی ہوئی تمام لڑکیاں کچھ ایسے پرتصنع انداز سے گفتگو کر رہی تھیں جس سے وہ بالکل ناآشنا تھی۔ لڑکیاں قہقہے لگا رہی تھیں اور اوڈرے نے قہقہہ لگانا قریب قریب بھول گئی تھی۔

غذا میں تخفیف کرنے سے اوڈرے کا جسم پہلا ہی سنور گیا۔ آنا دم دوست لڑکیوں کی صحبت نے اس کی اس شگفتہ مزاجی کو بحال کر دیا جو بچپن ہی میں اس سے چھین گئی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سحر انگیز آنکھوں کی طرح، اس کے جادو کر دینے والے انداز نے دوستوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا۔ اس کے دوستوں میں ایک تجارت پیشہ نوجوان جیمس ہنسری تھا جو اس کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔

"بائی ہائی شوز" نے رقص و اداکاری کے کچھ دوسرے چھوٹے چھوٹے سلسلے بھی شروع کر دیئے۔ اوڈرے کے دوسرے ساتھیوں کے نزدیک یہ سلسلے اتنے معمولی تھے کہ انھوں نے ان پر اپنا وقت صرف کرنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن اوڈرے نے خود کو آگے بڑھانے کے لئے کریکٹر ایکٹر فیلکس ایلمر سے ڈرامہ کے فن کی تعلیم بھی شروع کر دی۔ فیلکس نے اس کے مزاج کے توازن اور اس کی دلکشی کو اور بھی نکھار دیا۔ چونکہ بیلے کی تربیت نے اس کے انداز میں ایک توازن پیدا کر دیا تھا اس لئے وہ اپنے مکالمے بھی جم کر ادا کرتی تھی۔

"ڈی موندر ہل میں" نامی ایک ڈرامے میں اوڈرے نے سگریٹ بیچنے والی لڑکی کا پارٹ ادا کیا۔ اس کی اداکاری دیکھ کر فلمی اداکاری کی صلاحیت رکھنے والوں کو تلاش کرنے والے ایک شخص نے اسے "مینیئنچ کا رلیبے بی" میں ایک چھوٹے سے پارٹ کی پیش کش کی۔ ایک مختصر سے منظر میں اوڈرے کو ہوٹل کے کاؤنٹر پر بیٹھ کر رجسٹر میں نام لکھنے اور صرف چند مکالمے ادا کرنے تھے۔ اس منظر کی فلم بندی کے لئے فلم سازنے حقیقی طور پر ہونے کا رلو کے ہوٹل ڈی پیرس کا انتخاب کیا تھا۔ فلم بندی کے دوران میں ہوٹل کے مہمانوں کو برآمدے میں ٹھہرنے کے لئے کہہ دیا گیا اشارہ پاتے ہی اندر سے کاؤنٹر پر پہنچنے کے لئے لپک لپک کر قدم رکھتی ہوئی کلیگ لائٹس[1] روشنیوں

[1] کلیگ لائٹس، فلموں کی شوٹنگ میں استعمال ہونے والی تیز روشنی۔

ی قطار میں داخل ہوئی، اسی لمحے ایک ادھیڑ آدمی پہیوں کی کرسی پر بیٹھی ہوئی ایک معمر عورت کو دھکیلتا
ہوا برآمدے میں داخل ہوا۔ اس معمر خاتون کی آنکھیں سیاہ اور تابناک تھیں، سر پر سفید خمدار بال تھے
یہ عالمگیر شہرت کی حامل اداکارہ اور ناول نگار سیڈونی گیبریل کولیتی تھی، جس کی عمر اس وقت اسی
برس تھی

کولیتی اور اس کے فلم ساز کچھ عرصہ سے ایک ایسی لڑکی تلاش کر رہے تھے جو کولیتی کے ڈرامے
میں منتقل کئے ہوئے ایک ناول "جیجی" (الھڑ دوشیزہ) میں ہیروئن کا رول کر سکے۔ تاہم یہ ڈرامہ
انگریزی زبان میں براڈوے میں بھی پیش کیا جانے والا تھا، اور کولیتی کو ایک تیز طرار اور خوش وضع
لڑکی کی ضرورت تھی جو فرانس کے پرانے خاندان کی دوشیزہ کی صحیح عکاسی کر سکے۔

کولیتی نے اپنی کرسی روکتے ہوئے اپنے شوہر سے سرگوشی کی "یہی جیجی ہے"

منظر کی فلم بندی کے بعد مسیئے گوڈیکے نے اوڈرے کو کولیتی کے کمرے میں مدعو کیا۔ انھوں
نے اوڈرے کو اس ڈرامے کے متعلق بتایا کہ اس کے لئے سولہ برس کی ایک ایسی لڑکی درکار ہے
جو ڈرامے میں اپنی شادی کے تصورات میں کھوئی رہتی ہے، پھر گوڈیکے نے کہا "میری بیوی چاہتی
ہے کہ جب جیجی براڈوے میں پیش کیا جائے تو اس کا خاص پارٹ تم ادا کرو۔"

اوڈرے حیرت زدہ ہو کر گوڈیکے کا منہ دیکھنے لگی، پھر اس نے عاجزی سے کہا، "میں اس
کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں ایک رقاصہ ہوں، اور......"

"تم نے رقاصہ بننے کے لئے سخت محنت کی ہے، اداکارہ بننے کے لئے بھی کر سکتی ہو۔" کولیتی
نے اوڈرے سے کہا۔

"لیکن میں نے اسٹیج پر ایک دفعہ میں ایک دو سے زیادہ مکالمے کبھی نہیں بولے" اوڈرے
نے جواب دیا۔ اسے اب بھی اپنی صلاحیتوں پر شبہ تھا۔

کولیتی نے اپنی انگشتِ شہادت تحکمانہ انداز سے اس کی جانب اٹھاتے ہوئے کہا "تمہاری
شکل بھی اچھی ہے، اور شخصیت بھی دلکش ہے۔ تم ہی میری "جیجی" ہو۔"

اوڈرے بدحواس ہو کر کمرے سے چلی آئی۔ سردست اس کا کولیتی سے معاہدہ نہیں
ہوا تھا، کیونکہ کولیتی نے اسے بتایا کہ پہلے نیویارک کے فلم سازوں سے معاہدہ ہونا ضروری ہے۔

لیکن اوڈرے اس تذبذب میں تھی کہ اگر اسے یہ پارٹ مل گیا تو کیا وہ اُسے ادا کر سکے گی؟
اوڈرے کو فلم ساز گلبرٹ ملر اور جگی کو ڈرامے میں منتقل کرنے والے ڈرامہ نویس انیتا لوز کا خط ملا کہ وہ دونوں اس سے انٹرویو کے لئے لندن آ رہے ہیں۔
انٹرویو کے بعد فلم ساز نے اوڈرے سے کہا: "اپنے پارٹ کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد نیویارک آ جاؤ۔"

نیویارک ابھی اس سے ہزاروں میل کے فاصلے پر تھا۔ لیکن اپنی نئی زندگی کے تصورات سے مستفید ہونے کے لئے اوڈرے کو وقت کم محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی وہ جگی کے مطالعے میں ہی مصروف تھی کہ پیرا ماؤنٹ اسٹوڈیو کے نمائندہ ولیم وائلر نے اس سے ملاقات کی اور کہا کہ ان کو نئے چہرے کی تلاش کرنے والے ان کے ایک نمائندے نے اس کے متعلق توجہ دلائی ہے۔ کیا وہ ان کی آنے والی فلم "رومن ہالی ڈے" میں شہزادی این کے پارٹ کے لئے اسکرین ٹیسٹ دینا پسند کرے گی؟"
اوڈرے نے "جگی" سے متعلق اپنے معاہدے کی تفصیلات بتائیں۔ لیکن وائلر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس ٹیسٹ سے اس کے معاہدے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اگر اسے پارٹ مل گیا تو فلم کی تیاری کے لئے اس کا انتظار کیا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے وہ شہزادی کے پارٹ کے لئے کسی چہرے کی تلاش میں کئی برس صرف کر چکا تھا۔
اسکرین ٹیسٹ کے دوران میں اوڈرے پر گھلا گئی آنہ چھینے لگی۔ اس آزمائشی منظر میں اوڈرے کو بستر میں لٹا دیا گیا۔ منظر مکمل ہونے پر جب وائلر نے "کٹ" کا لفظ کہا تو اوڈرے کی جان میں جان آئی اس جھمیلے سے چھٹکارا پاتے ہی وہ کھسیانی ہنسی ہنستی ہوئی اٹھی اور اپنے بازو گھٹنوں کے گرد حمائل کئے ہوئے بستر میں بیٹھ گئی۔ بعد میں اسے پتہ چلا کہ وائلر نے ٹیسٹ سے پہلے کیمرہ مین کو ہدایت کر دی تھی کہ اس کے "کٹ" کہنے کے بعد بھی وہ فلم بندی جاری رکھے۔ فلم بندی ہو جانے کے بعد اوڈرے نے سوچا کہ اب وائلر اس منظر کا مشاہدہ کرنے کے بعد اس کے متعلق اپنی رائے بدل لے گا۔
"مکمل طور پر بہت عمدہ!" وائلر نے چلاتے ہوئے کہا۔ اوڈرے کا دہانہ اگرچہ کچھ چوڑا تھا۔ اور اس کے دانت بے ربط تھے۔ لیکن اس کے سبک خدوخال اعلیٰ صفات کے حامل تھے۔ اس نے بہترین ڈرامائی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا۔ وائلر نے اوڈرے کو بتایا کہ "ابھی

تو اس فلم کو ہالی وڈ بھیجنا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے، اس پارٹ کے لئے تمہاری کامیابی کے قوی امکانات ہیں۔"

امریکہ روانہ ہونے سے قبل ہی اوڈرے کا "رومن ہالی ڈے" کے لئے بھی معاہدہ ہو گیا۔ نیویارک پہنچ کر اس نے سوچا کہ اب وہ ہالی وڈ کی جانب سے مطمئن ہو گئی ہے۔ لیکن وطن، خاندان، اور بہترین دوست بچھڑ گئے ہیں۔ جب اس نے ہوٹل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں اپنا معمولی سا سامان کھولا اور گرد و پیش نظر ڈالی تو اسے یوں لگا جیسے نیویارک کی ہر شئے نمائشی، نئی اور اجنبی ہو۔ وہ اسی پژمردگی کے عالم میں "جگی" کی پہلی ریہرسل کے لئے روانہ ہو گئی۔

"تمھیں اپنا پنڈ پونڈ وزن گھٹانا پڑے گا" ڈائرکٹر نے فکر کیا۔ اس کے بعد تنبیہات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ "اسٹیج پر ہرن کی طرح چوکڑی نہ بھرو...... آواز میں یکسانیت مت پیدا کرو"

اوڈرے کی آواز اگرچہ واضح تھی، لیکن اس میں لوچ نہیں تھا۔ بعض اوقات اس کی آواز باریک ہو جاتی تھی۔ وہ مکالموں کی ادائگی کا فن اور گفتگو کو آگے بڑھانے کا ہنر بہت کم جانتی تھی ان خامیوں اور دیگر کوتاہیوں کو دور کرنے کے لئے اس نے اداکاری کی تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی۔ اب ریہرسل کے علاوہ اسے دن میں اٹھارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ تاہم تمام کوششوں کے باوجود بہت سے ایسے موقع آتے جب اسے اپنی نا اہلی کے باعث برطرف کر دیئے جانے کا خطرہ درپیش ہوتا تھا۔ اس غیر اطمینانی کیفیت اور معمولی خامیوں نے اسے سخت تشویش میں مبتلا رکھا۔

اوڈرے نے سوچا کہ رقص کرنے سے اس کا جسم سنور جائے گا اور حسن میں بھی اضافہ ہوگا نیز رقص میں شامل ہونے سے اس کی اجنبیت دور ہو جائے گی۔ اس لئے اس نے "تاراسوا" کے بیلے اسکول میں داخلہ لے لیا۔ وزن کم کرنے کے لئے فاقہ کشی اور رقص و اضطراب نے اسے انتہائی لاغر بنا دیا۔ اسے تنہائی کا شدید احساس ستانے لگا۔ یہاں کسی نے "جنس مخالف" کا جگہ نہیں لی تھی۔ لیکن اس عالم میں بھی وہ تمام تر سختی کے ساتھ اپنے منصوبوں پر کاربند رہی۔

اوڈرے کو یہ علم نہ تھا کہ براڈوے کے ڈرامے اکثر آزمائش یا تجربے کی غرض سے نیویارک سے باہر بھی کھیلے جاتے ہیں۔ ڈائرکٹر نے جب اسے یہ اطلاع دی کہ "جگی" ۸ نومبر ۱۹۵۱ء سے

فلاڈلفیا کے والنٹ اسٹریٹ تھیٹر میں کھیلا جائے گا تو اوڈرے کو انتہائی حیرت ہوئی فلاڈلفیا میں یہ ڈرامہ زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔ اس ڈرامے کا پس منظر یہ تھا کہ یس ایس واشنگٹن نامی بحری جہاز نیویارک کے ساحل پر لنگر انداز ہے اور گودی کے مزدوروں کی ہڑتال کا تصفیہ ہونا ہے۔ لیکن اس پس منظر کے لئے ڈرامے کا جو سیٹ تیار کیا گیا تھا وہ مناسب نہیں تھا۔

پھر جس رات نیویارک کے فلٹن تھیٹر میں اس ڈرامے کا افتتاح ہوا، اس رات اوڈرے کے سنگھار کا کمرہ پھولوں کے گلدستوں سے بھر گیا۔ اوڈرے ان گلدستوں کو دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے یہ پھول اس کی بہترین کارکردگی کا اعتراف تھے۔ اوڈرے نے بلجیئن قسم کی الھڑ دوشیزہ جیجی کا پارٹ انتہائی بے تکلفی سے ادا کیا تھا۔ اس کی اداکاری تصنع سے قطعاً دور تھی اوڈرے اپنے پارٹ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس با کمال اداکاری نے تماشائیوں اور اسٹیج کے درمیان خلا کو پر کر دیا تھا۔ اور تماشائی یوں محسوس کر رہے تھے جیسے وہ کوئی ڈرامہ نہیں بلکہ حقیقی واقعہ کے مشاہدے میں مصروف ہوں۔

"بہت خوب!" انیتا لوس نے ڈرامے کے اختتام پر اوڈرے کو گلے لگاتے ہوئے پرجوش لہجے میں کہا تماشائیوں اور نقادوں نے بھی اوڈرے کے پارٹ کو بے حد سراہا۔ نیویارک ٹائمز کے بروکس اٹکنسن نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا "بے ساختہ، تاثر خیز اور دل موہ لینے والی اداکاری"

اس بے حد تعریف و توصیف کے باوجود اوڈرے کا تردد دور نہیں ہوا۔ اگر کسی منظر میں وہ مہارت کے ساتھ اداکاری نہ کر سکتی تھی تو دل شکستہ ہو کر اسٹیج سے چلی آتی تھی۔ شدید جدو جہد سے بے حال ہو کر وہ خود اپنے آپ سے پوچھنے لگی "آخر مجھ سے لغزش کیوں رہتی ہے؟"

ابھی جیجی میں کام کرتے ہوئے اسے پہلا ہفتہ ہی گزرا تھا کہ کسی نے اس سے کہا "تمہاری شہرت اب اسی حلقوں تک جا پہنچ رہی ہے"

یہ سن کر اوڈرے مست ہو گئی اور تھیٹر سے نکل کر گلی میں آ گئی۔ لیکن اس کے اس انبساط میں بھی انکسار شامل تھا۔ پھر اس نے جواب دیتے ہوئے کہا "ارے پیارے، ابھی تو مجھے سیکھنا ہے کہ اداکاری کیسے کی جاتی ہے۔"

بظاہر تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اوڈرے رات کی رات۔ کورس گانے والی ایک معمولی لڑکی سے

بہترین اداکاری کی منزل تک پہنچ گئی۔ لیکن درحقیقت اس ترقی کے پیچھے اس کی برسوں کی محنت اور باضابطگی پوشیدہ تھی۔ اسے حسین و جمیل ہونے کی وجہ سے یہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اس لئے کہ اس نے مصائب کے سامنے ڈٹے رہنے کا حوصلہ پیدا کر لیا تھا۔

اوڈرے کہا کرتی ہے۔ " اگر مجھ میں بیلے کی تعلیم کے لئے شاید جانفشانی کی عادت نہ ہوتی تو میں وہ نہایت مشکل کام کبھی انجام نہیں دے سکتی تھی جو براڈوے میں کوئی نمایاں پارٹ ادا کرنے کے لئے ضروری تھے "۔

جگی میں بہترین اداکاری پر اوڈرے کو جو خراج عقیدت ملا اس میں سب سے زیادہ اہم وہ فوٹو تھا جو کولیتی نے اپنے دستخطوں کے ساتھ اسے بھیجا۔ اس فوٹو پر یہ عبارت درج تھی " اوڈرے ہیپ برن کے لئے، جو ایک بیش بہا موتی ہے اور جسے میں نے تلاش کیا ہے "

دوسرے اداکاروں نے بھی اس کی صلاحیتوں کو بے حد سراہا۔ گرٹ ریونڈ لارنس نے اس سے کہا' " اگر فلم سازوں نے کبھی میری زندگی پر کوئی فلم بنانی چاہی تو مجھے امید ہے کہ اس کا خاص پارٹ تم ادا کرو گی۔"

اوڈرے کو اگرچہ بائیس ہی برس کی عمر میں شہرت نصیب ہوگئی۔ لیکن اس میں عنفوانی عمر کا لاابالی پن بھی برقرار تھا اور مکمل عورت کی خود اعتمادی بھی موجود تھی۔ کسی لمحے وہ دوستوں کے درمیان بیٹھی ہوئی کسی شخص کی شرارت آمیز نقلیں اتار اتار کر دوستوں کو لوٹ پوٹ کرنے میں مصروف ہوتی تو دوسرے ہی لمحے اسٹیج پر پہنچ کر ایک شہزادی کے گمبھیر پارٹ میں خود کو ڈھال لیتی تھی۔

اسے اپنی راتوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔ شو ختم ہونے کے بعد وہ عام طور پر اپنی سہیلی کیتھلین نیزبٹ کے ساتھ دودھ اور یوگرٹ (دہی) سے لطف اندوز ہونے اور گپیں اڑانے کے لئے گھر روانہ ہو جاتی۔ اسے شہرت حاصل کرنے کی سازشوں سے سخت نفرت تھی۔ لیکن انٹرویو کے موقع پر وہ پوری طرح مستعد رہتی اور سنجیدہ سوالات کے ایسے دندان شکن جواب دیتی کہ سوال کرنے والا مات کھا جاتا تھا۔ ان اخباری نامہ نگاروں کو جو اس کے راز جاننے کی کوشش کرتے، وہ جواب دیتے ہوئے کہتی، " نازیوں کے تصرف کی جو کہانیاں آپ نے سنی ہیں، خواہ وہ کتنی ہی دہشت ناک ہوں، غالباً سچی ضرور ہیں ... "

اوڈرے ابھی جگی کی تکمیل میں مصروف تھی کہ پیرا ماؤنٹ کی چیف ڈیزائنر ایڈتھ ہیڈ،

"رومن ہالی ڈے" کے لئے اس کی پوشاک کا منصوبہ بنانے کی غرض سے اس کے پاس نیویارک پہنچ گئی۔ مس ہیڈ سے پہلی ملاقات کے وقت اوڈرے سیاہ رنگ کا معمولی لباس پہنے ہوئے تھی، اس کے کالر اور کف سفید تھے، اس نے سفید دستانے پہن رکھے تھے، اور قمیص کے ایک کاج میں وادی کے سوسن کی ایک بالی لگی ہوئی تھی۔

مس ہیڈ نے اوڈرے کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا "میں نے تمہارے جو آزمائشی منظر دیکھے ہیں، ان میں تم پاجامہ پہنے ہوئے تھیں"

اپنے کپڑوں کے متعلق بات چیت کرتے ہوئے اوڈرے نے کہا "مجھے زیورات اچھے نہیں لگتے، اور میں میک اپ میں صرف ہلکے رنگ کی لپ اسٹک استعمال کرتی ہوں"

مس ہیڈ نے اسے بتایا کہ اس کا روزمرہ کا لباس ایک الگ چیز ہے، اور فلم کے کسی کردار کی شبیہہ بنانے کے لئے پوشاک کا استعمال اس سے بالکل مختلف ہے" اوڈرے نے اس وضاحت کو سمجھتے ہوئے اقرار کے طور پر اپنا سر ہلایا۔ مس ہیڈ نے جو خاکے بنائے تھے۔ ان میں اوڈرے نے کچھ معمولی سے اضافے کئے — سادہ اور سپاٹ سا گلوبند، اور چوڑے بیلٹ۔ اوڈرے کی نکتہ چینی کی عادت نہیں ہے، لیکن وہ پوشاک کی تمام چیزیں درست چاہتی ہے۔ چنانچہ رومن ہالی ڈے کے لئے اپنی پوشاک کی فٹنگ پر اس نے گھنٹوں صرف کر دیئے تھے۔

"جِجی" کے مکمل ہونے کے فوراً بعد اوڈرے "رومن ہالی ڈے" میں کام شروع کرنے کے لئے اٹلی چلی گئی۔ اس فلم میں ڈائریکٹر نے شہر کی حقیقی عمارتوں اور سڑکوں کو استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ سفر کے دوران میں اسے جیمس ہینسن اور اپنے مستقبل کے متعلق سوچنے کے لئے چند پرسکون گھنٹے میسر آئے۔ اس نے سوچا کہ کیا وہ شادی کر کے اپنی ترقی جاری رکھ سکتی ہے؟

اس نے اپنے مستقبل اور ترقی کو مقدم سمجھا اور شادی کا خیال سر دست ترک کر دیا۔ "رومن ہالی ڈے" میں، اوڈرے کو ایک انیس سالہ ایسی شاہزادی کا پارٹ ادا کرنا تھا، جو شہرت کی خاطر جگہ جگہ دورہ کرتی ہے۔ روم میں پہنچ کر یہ شہزادی اکتا دینے والی تقریبوں اور رسمی تقریبات سے تنگ آ جاتی ہے، اور اپنے ڈاکٹر سے کوئی سکون بخش دوا طلب کرتی ہے، بعد ازاں وہ اپنی موج میں چپکے سے اکیلی ہی شہر کی سیر کے لئے نکل جاتی ہے۔ ایک اخبار نویس سے اس کی ملاقات ہوتی ہے (اخبار نویس کا کردار گریگوری پیک

ادا کر رہا تھا) شہزادی اور اخبار نویس وہ شام ایک ساتھ گزارتے ہیں اور دریائے ٹائبر میں ایک بجرے پر رقص کرتے ہیں۔ شہزادی اس سے قطعاً بے نیاز رہتی ہے کہ اس کا ساتھی ایک اخبار نویس ہے جس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اپنے اخبار کے لیے شہزادی کے متعلق کوئی دلچسپ کہانی حاصل کرے۔ شہزادی اپنے ساتھی پر فریفتہ ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کے لئے اس سے دوبارہ ملاقات کا وعدہ کرتی ہے۔

ریہرسل بہت طویل تھی۔ اس طوالت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اوڈرے میں ابھی خود اعتمادی کی کمی تھی اور وہ اکثر تھک جاتی تھی۔

کام سے فارغ ہونے کے بعد جو وقت اسے ملتا۔ اس میں وہ ڈرامے اور بیلے کی مشق پوری تندہی سے جاری رکھتی تھی۔ اوڈرے اور جیمس عموماً خط و کتابت کے ذریعے کئی بار اپنی شادی کی تاریخ مقرر کر چکے تھے۔ دونوں کا رومان انہی تصورات پر ہی پروان چڑھ رہا تھا۔ اوڈرے کو کپڑوں کے ڈیزائن بنانے کا شوق تھا۔ ایک بار اس نے یوں ہی اپنی شادی کے لباس کا ایک مکمل سیٹ بھی تیار کر ڈالا تھا۔

اوڈرے فطری طور پر سخت قسم کی حقیقت پسند واقع ہوئی تھی۔ چنانچہ جب "رومن ہالی ڈے" تکمیل کے مراحل میں پہنچی تو اس کے ذہن میں شادی کے مسئلے پر کچھ شبہات پیدا ہونے لگے۔ جیمس اور اس کا اپنا مستقبل جدا جدا رہتا تھا لیکن دونوں کی سمتیں مختلف تھیں۔ جتنے عرصہ وہ ایک دوسرے کے قریب رہے تھے، اس سے کہیں زیادہ عرصہ تک ایک دوسرے سے جدا رہے تھے۔ چنانچہ اب ان کی وابستگی کے بہترین امکانات ختم ہو چکے تھے۔ اوڈرے ایسی شادی کی خواہش مند تھی جو ایک پائیدار رشتہ ثابت ہو۔ چنانچہ اس نے ان شبہات کے سبب جیمس سے شادی کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

اٹلی سے نیویارک واپس جاتے ہوئے اس نے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے ملاقات کی خاطر لندن میں قیام کیا۔ اس کے رشتے کے دو بھائیوں نے اس کے اعزاز میں ایک عصرانہ دیا۔ اس عصرانہ میں گریگوری پیک اپنے ہمراہ ایک طویل قامت اور نیلی آنکھوں والے ایکٹر میل فیرر کو بھی لایا۔ ایک ہی فن سے تعلق رکھنے والی دو شخصیتیں ملیں تو اس فن سے متعلق دونوں میں گفتگو ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ اوڈرے اور میل کے درمیان تھیٹر کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ اوڈرے نے جدا ہوتے وقت میل سے آہستہ سے کہا، "اگر تمہیں کوئی ایسا ڈرامہ ملے جسے تم میرے لئے مناسب خیال کرو تو مجھے بھیج دینا۔"

لندن میں قیام کرنے کے بعد اوڈرے "سیبرینا" میں کام کرنے کے لئے ہالی وڈ آگئی۔ اس فلم میں اس نے ایک شوفر کی ایسی لڑکی کا پارٹ ادا کیا، جس سے اس کے باپ کے مالک کے لڑکے عشق بازی کرتے ہیں۔ بیوری بلزپر اس کے کمرے کے سامنے، ہر روز علی الصبح پیرا ماؤنٹ کی کار آکر رکتی، اور وہ اس میں بیٹھ کر اسٹوڈیو کے میک اپ کے شعبے کی جانب روانہ ہو جاتی۔ راستے میں وہ اپنے مکالمے دہراتی رہتی۔ میک اپ سے فارغ ہو کر، سائیکل پر بیٹھ کر وہ 'سیبرینا' کے سیٹ کی جانب روانہ ہو جاتی۔

سیٹ پر پہنچ کر اوڈرے تمام تر توجہ کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو جاتی تھی، اور کبھی فضول گپوں میں حصہ نہیں لیتی تھی۔ انتہائی مہذب، اطاعت شعارانہ فرماں بردار ہونے کے سبب اس نے اساتذہ، ٹیکنیشنز اور ڈائریکٹروں کے دل میں جگہ بنالی تھی۔ ان میں سے ایک نے اوڈرے کے متعلق کہا تھا، "اس کا رویہ اس کا احترام کرنے پر مجبور کرتا ہے"۔ اسٹوڈیو سے باہر اگرچہ وہ تنہا رہتی تھی، لیکن فلم بندی کے درمیانی وقفوں میں دوستوں کی صحبت اور گپ شپ کا لطف اٹھاتی تھی۔ اس کے ساتھی اسے انتہائی خوش اخلاق سمجھتے تھے۔

'سیبرینا' میں اوڈرے کو گانا بھی گانا تھا، اس لئے اس نے روزانہ کئی کئی گھنٹے ایک استاد سے گانے کی تعلیم حاصل کی۔ ساتھ ہی ایک دوسرے معلم سے فن ڈرامہ کی تربیت بھی حاصل کرتی رہی۔ جب فلم کے لئے پوشاک کی تیاریاں شروع ہوئیں تو مس ہیڈ نے اوڈرے کو وہ جنون ایسے خاکے پیش کئے۔ جن میں اسے خوبصورت لباس پہنے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ ان دونوں عورتوں میں کپڑوں کے ڈیزائن بنانے کا۔ مختلف زبانوں کا، موسیقی اور مصوری کا ذوق مشترک تھا۔ یہ دونوں ساتھ ساتھ کام اور تفریح کرتی تھیں۔ دیر تک کام میں مصروف رہنے کے بعد اوڈرے مس ہیڈ سے کہتی "آؤ اب کچھ تفریح کریں"۔ اس جملے کا مطلب اکثر یہ ہوتا کہ بڑی بڑی فرنچ پیسٹریاں خریدنے کے لئے قریب ہی کوئی مٹھائی کی دکان تلاش کی جائے۔

"رومن ہالی ڈے" ملک گیر پیمانے پر نمائش کے لئے پیش ہوئی تو تماشائیوں نے فلم بے مدلی کی سادہ وڈرے کے سیماب وش چہرے سے ایک سرکش، پشیمان، پرتمکین اور لاابالی کردار کے تاثرات پوری طرح نمایاں ہوئے تھے۔ اس موقع پر اوڈرے نے اپنے متعلق کہا کہ "میں اپنے چہرے کو ہیبت ناک یا دانش مندانہ بنا سکتی ہوں، لیکن ان میں سے کوئی خوبی خود میری شخصیت

میں موجود نہیں ہے۔"

درحقیقت اس نے اپنے چہرے، خط و خال یا لہجے کے جوہروں سے کہیں زیادہ اپنی اثر پذیری اور اپنی مقناطیسی کشش سے تماشائیوں کے دلوں کو موہ لیا تھا۔ ایک مبصر نے اس کے متعلق لکھا تھا کہ "اوڈرے ہیپبرن نے اپنے پارٹ میں ڈرامے کی انتہائی رفعتوں کو چھو لیا ہے۔" ایک دوسرے نقاد نے اوڈرے کے متعلق یہ رائے ظاہر کی۔ "اوڈرے کی اعلیٰ صلاحیتیں اس کی سخت ترین جدوجہد کا نتیجہ ہیں۔"

اوڈرے اس قدر و منزلت سے متاثر نہیں تھی۔ لیکن اس کے مداح فوٹوگرافر اور ڈرامہ نویس اسے گھیرے رہتے تھے۔ کوئی کسی چیز پر اس سے دستخط کراتا، کوئی ڈرامہ نویس اس سے اپنے ڈرامے کے متعلق کسی فلم ساز سے سفارش کرنے کی درخواست کرتا۔ کوئی اس سے فلمی دنیا میں کامیاب ہونے کا سحرانگیز نسخہ دریافت کرتا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ انٹرویو اور پبلسٹی ویثرن نیز ان جھمیلوں میں اس کا نصف وقت صرف ہو جاتا ہے، حالاں کہ ان چیزوں کا اداکاری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اوڈرے کو اپنی زندگی کا یہ پہلو ہر سال سے بھی زیادہ ناگوار محسوس ہوتا تھا۔

اس کے بعد اوڈرے صرف ان چند تقریبات میں ہی نظر آنے لگی جن کے متعلق اس کے فلساز اصرار کرتے تھے کہ اس کی شرکت ضروری ہے۔ لیکن ایسی تقریبات میں بھی اس نے اپنا زیادہ وقت برباد نہیں ہونے دیا۔ وہ فرصت کی شامیں دوستوں کے ساتھ گزارنا پسند کرتی تھی لیکن ایسی شاموں میں بھی زیادہ تر تنہا رہتی تھی۔ ایک بار اس نے اپنے دوستوں سے کہا تھا۔ "میں اکثر تنہا رہتی ہوں اس طرح مجھ میں تر و تازگی بحال ہو جاتی ہے۔"

فرصت کے لمحوں میں اوڈرے کپڑوں کے ڈیزائن بنایا کرتی تھی، خطوط پڑھ کر ان کے جواب لکھتی یا "بینی گڈمین" کی موسیقی سے محظوظ ہوتی تھی۔ اسے "برہمز" اور "بیتھوون" کی موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ کبھی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتی تھی۔ کھانے کے وقت فرش پر کھانے کی ٹرے کے سامنے ٹانگیں پرے تانگ رکھ کر بیٹھ جاتی اور کھانے کے دوران میں شا یا شیکسپیر کے ڈراموں کا مطالعہ کرتی تھی۔

ایک مرتبہ اسے میل فیرر کی جانب سے اسٹیج ڈرامے کا ایک مسودہ "اونڈائین" موصول ہوا۔ اس ڈرامے میں قرون وسطیٰ کے ماحول میں ایک ایسی دریائی پری کی داستان بیان کی گئی تھی، جو ایک

نائٹ کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ میں خود نائٹ کا پارٹ ادا کرنے کا خواہش مند تھا۔ لیکن کیا اڈرے بھی کا رول ادا کرنا چاہتی تھی ؟

تقریباً سب نے اوڈرے کو مشورہ دیا کہ وہ یہ پارٹ نہ لے۔ قرون وسطیٰ کی تمثیل کامیاب نہیں رہے گی۔ اس کا پارٹ دشوار ہے لیکن ان تمام مشوروں کے برخلاف اوڈرے نے سوچا کہ یہ ڈرامہ اس کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جب ایک بار اس نے فیصلہ کر لیا تو پھر کوئی اسے یہ پارٹ لینے سے باز نہ رکھ سکا۔

"سبرینا" کی فلم بندی مکمل ہو جانے پر اوڈرے "اون ڈائین" کی ریہرسل شروع کرنے کے لئے نیویارک آگئی۔ اب فن ڈرامہ کی تعلیم، بیلے اور اداکاری کی مشق کا چکر پھر شروع ہو گیا۔ اس چکر سے اسے بہت کم مہلت ملتی تھی۔ لیکن میں کے اشتراک سے اوڈرے نے ان تمام امور کی مشق جاری رکھی۔ میل اعلیٰ درجہ کا رقاص تھا۔ اوڈرے کو اس کی دلکش وضع قطع اور اس کے مزاج کا تیکھا پن بے حد پسند آیا تھا۔

دونوں کے درمیان اس ربط و تعلق کو دیکھتے ہوئے "اون ڈائین" میں کام کرنے والے دوسرے لوگوں نے اندازہ لگایا کہ شاید جلد ہی یہ دونوں شادی کی منزل تک پہنچنے والے ہیں۔ جب اوڈرے کو لوگوں کے اس خیال کا علم ہوا تو اس نے ایک ساتھی سے کہا، "میں جب شادی کروں گی تو اپنی خواہش کے مطابق شادی کروں گی۔"

کچھ عرصہ بعد اوڈرے کی ماں نے اسے لکھا کہ وہ نیویارک آنا چاہتی ہے۔ شاید وہاں اسے کوئی ملازمت مل جائے۔ اوڈرے نے خوشی خوشی اپنی آمادگی کا اظہار کیا۔ اور میل سے رازداری کے ساتھ کہا، "میری ماں بہت اچھی ہے۔ بہت دنوں سے میں اسے بلانا چاہتی ہوں، لیکن وہ بہت آنا دمنش ہے"

جوں جوں "اون ڈائین" کا افتتاح قریب آتا گیا، اوڈرے پر دہشت طاری ہوتی گئی۔ وہ اس تذبذب میں تھی کہ اگر وہ ناکام ہو گئی تو کیا ہوگا ؟ پھر اسے احساس ہوا کہ اگر اس نے اپنا پارٹ اپنی بساط بھر کوشش کے مطابق ادا کیا تو اہل نظر کی توقعات کے عین مطابق ہی ہوگا۔

یہ ڈرامہ بھی بے حد کامیاب رہا۔ سنہری بالوں کی نقلی ٹوپی، تابناک آنکھوں اور میک اپ کئے ہوئے چہرے سے اوڈرے نے اپنے پارٹ کے حسرت ناک اور شوخ و شنگ پہلوؤں کی اس طرح عکاسی کی تھی، جیسے وہ اس فرضی داستان کے ایک ایک لفظ کو حقیقت سمجھ کر اس میں رچ بس گئی ہو۔ اس

ڈرامے پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک نقاد نے لکھا۔ "اوڈرے اگر شہرت اور چاپلوسی کی جھنکار کو خود سے دور رکھنے میں کامیاب رہی تو وہ ایک عظیم اداکار بن جائے گی۔" لیکن اوڈرے میں ایسی چیزوں سے متاثر ہوسکنے کی کوئی نشانی نہیں تھی۔ "اون ڈائین" کی مقبولیت کے ساتھ، اگرچہ اوڈرے کو مزید استحکام اور وقعت میسر آگئی تھی، لیکن اس میں کسی قسم کا زعم باطل پیدا نہیں ہوا تھا۔

۱۹۵۴ء کے موسم بہار میں جس رات سال کی بہترین فلموں اور اداکاروں کو اکیڈمی ایوارڈ پیش کیا گیا، اس رات بھی اوڈرے نیویارک میں "اون ڈائین" میں اپنا پارٹ ادا کر رہی تھی۔ انعامات کی تقریب کی اصل کارروائی ہالی وڈ میں ہو رہی تھی اور بعد میں اسے نیویارک میں ٹیلی ویژن کے ذریعے سینٹر تھیٹر میں دکھایا جانا تھا۔ ٹیلی ویژن کے پروگرام اور "اون ڈائین" کے اوقات میں فرق تھا، اس لئے اوڈرے اپنا پارٹ ادا کرنے کے بعد سینٹر تھیٹر پہنچ کر انعامی تقریب میں شریک ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے ڈرامے میں پارٹ ادا کیا، اور اس کے فوراً بعد ٹیکسی لے کر تھیٹر کی جانب روانہ ہو گئی۔ تھیٹر کا بیرونی حصہ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ ہال کے اندر معززین کا جم غفیر موجود تھا۔ سیاہ ٹائیاں لگائے ہوئے مردوں اور منک، سابل اور ارمین کی سمور کی پوشاک پہنے ہوئے عورتوں کے درمیان جب اوڈرے داخل ہوئی تو بہت سے اخباری نمائندے اور فوٹو گرافر اس کی جانب لپکے۔ وہ سب سے خوش اسلوبی کے ساتھ پیش آتی ہوئی اپنی ماں اور اپنی سیٹ کو تلاش کرنے کے لئے آگے بڑھ گئی۔

اوڈرے اور اس کی ماں کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ چہ می گوئیاں کر رہے تھے کہ ۱۹۵۳ کی بہترین ایکٹریس کا انعام کسے ملے گا۔ اوڈرے نے کسی کو کہتے ہوئے سنا، "انعام یقینی طور پر ڈیبورہ کیر کو ملے گا"

پھولوں کے انبار سے لدی ہوئی اسٹیج پر موشن پکچرز اکیڈمی کا پیش کردہ، سونے کا ایک چھوٹا سا مجسمہ "آسکر" ایک میز پر اپنے تمام تر جاہ و جلال کے ساتھ تنہا کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ دیگر تمام انعامات ہالی وڈ میں ہی تقسیم کئے جانے والے تھے۔

آج بھی وہ ہمیشہ کی طرح خاموش تھی، اور گھبراہٹ کے عالم میں اپنے دانتوں سے ناخن کتر رہی تھی۔ انعامی تقریب کی کارروائی شروع ہوتے ہی تماشائیوں پر سکوت طاری ہو گیا۔ ٹیلی ویژن کا سوئچ نیویارک سے ہالی وڈ کی جانب گھما دیا گیا۔ ہالی وڈ میں کسی نے انعامات کی فہرست پڑھ کر سنائی۔ اس

فہرست کو سنتے ہوئے، لوگوں نے سنا " اوڈرے ہیپ برن کو ' رومن ہالی ڈے ' پر ۔۔۔ "
داد تحسین کا شور کم ہوا تو اوڈرے پر ایک لمحہ کو سکتہ سا طاری ہو گیا۔ پھر وہ کانپتا ہوئی مسکراہٹ سے ماں کی جانب دیکھتے ہوئے، اپنا انعام حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھ گئی۔ تقریب ختم ہونے پر بھی اس پر کپکپی طاری تھی۔ اسی حالت میں اس نے اسٹیج پر فوٹو گرافروں کو پوز دیئے۔
" آسکر کہاں ہے ؟ " ایک فوٹو گرافر نے دریافت کیا۔
اوڈرے نے اپنے خالی ہاتھوں کی جانب دیکھ کر ہکلاتے ہوئے کہا " مجھے ۔۔۔ مجھے معلوم نہیں۔ شاید میں نے اسے کہیں رکھ دیا تھا "
پھر کہیں سے " آسکر " کا مجسمہ ڈھونڈ کر لایا گیا اور اوڈرے نے اس سنہری مجسمے کو اپنی گرفت میں لے کر فوٹو اتروائے۔ اس کے بعد نشست گاہ میں اخبار نویسوں نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔
" بس۔ بس۔ آپ لوگوں نے تو سوالات کی بھرمار کر دی اب میں تھک چکی ہوں۔ " اوڈرے نے اپنی اکتاہٹ کے اظہار کے لئے یہ الفاظ رک رک کر ادا کئے۔
ایک نامہ نگار نے اوڈرے سے دریافت کیا " اپنے مستقبل کے لئے آپ نے کیا سوچا ہے ؟ "
" میں ایک عظیم اداکارہ بننا چاہتی ہوں " اوڈرے نے تمام تر صداقت کے ساتھ جواب دیا پھر اخبار نویسوں نے اوڈرے کی اکتاہٹ محسوس کرتے ہوئے اس سے معذرت چاہی۔
اوڈرے کو دوسرا اعزاز " اوان ڈائین " میں بہترین اداکاری کرنے پر ملا۔ امریکی تھیٹر ونگ نے اسے ڈرامے پر اسے انٹوئنیٹی پیری کا اعزاز " ٹونی " پیش کیا۔ اس انعام میں ہر سال چاندی کا ایک تمغہ پیا اڈو ے کے ڈراموں میں ادا کرنے والی بہترین ایکٹریس کو دیا جاتا تھا۔
' اون ڈائین ' میں کام کرتے ہوئے اوڈرے کو اپنے پیشے کے اعتبار سے اور جذباتی طور پر بھی میل پر مکمل اعتماد ہو گیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ یہی وہ شخص ہے، جس سے وہ پائیدار ازدواجی رشتہ قائم کر سکتی ہے۔ ' اون ڈائین ' کے شو ختم ہو جانے پر وہ میل کے ہمراہ سوئٹزرلینڈ چلی گئی۔ وہاں پہاڑ کی چوٹی پر بنے ہوئے ایک کلیسا میں اس کی اور میل فیرر کی شادی کی رسم ادا ہوئی۔
شخصیت کی جس دلکشی کا اوڈرے نے پردۂ سیمیں پر اظہار کیا تھا اب وہی دلکشی گھریلو زندگی کی جانب منتقل ہو گئی۔ میل کے سابقہ بیوی سے چار لڑکے تھے۔ پیپا۔ میلا۔ کرسٹوفر اور مارک۔

اوڈرے ان بچوں سے بے انتہا محبت کرنے والی ان کی سوتیلی ماں تھی۔ اور وہ انھیں "ہمارے بچے" کہا کرتی تھی۔ بیوی اور خانگی زندگی کے ایک معمار کے روپ میں بھی، اوڈرے نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اپنی مکمل صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔ لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لئے اس نے جو مصائب جھیلے اور جو سختیاں برداشت کیں، انھیں اپنی ذات تک ہی محدود رکھا تھا۔

۱۹۵۵ء میں اوڈرے اور میل نے "وار اینڈ پیس" میں ایک ساتھ اداکاری کی۔ اس فلم میں اوڈرے نے نیتشا روستو نامی ایک ایسی حسین لڑکی کا پارٹ ادا کیا جو فضول دلچسپیوں میں بے اندازہ رقم خرچ کرنے کی عادی تھی۔ نیپولین کے روس پر حملہ آور ہونے سے اس لڑکی کی رنگ رلیاں ختم ہوجاتی ہیں۔ اس فلم میں میل کو سولہ فوج کے ایک اعلیٰ عہدہ دار "اندرائی" کا پارٹ دیا گیا تھا۔

فلم کی تکمیل ہو جانے پر اوڈرے اور میل فیرر نے کچھ عرصہ کے لئے رخصت لے لی۔ اوڈرے کے دل میں رقص کا فن سیکھنے کی شدید خواہش اب بھی موجود تھی۔ چنانچہ اس نے اس مہلت میں بیلے کے فن کا پوری توجہ سے مطالعہ شروع کردیا۔ رقص میں مہارت رکھنے کے سبب جب اسے ایک نغماتی طربیہ "فنی فیس" میں فریڈ اسٹیر کے مقابل ایک پارٹ ملا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس فلم کی تیاریوں کے لئے وہ پیرس روانہ ہوگئی۔ اسٹیر نے بھی اوڈرے کی انتہائی حوصلہ افزائی کی۔ جب کوئی پیچیدہ مرحلہ آتا تو اسٹیر اوڈرے سے پوچھتا، "اس منظر کو ہم تمھارے لئے زیادہ سہل کیونکر بنا سکتے ہیں؟"

"فنی فیس" کی تکمیل کے بعد اوڈرے نے میل کے ہمراہ "میئرلنگ" کے لئے مشق شروع کردی یہ ڈرامہ قدیم شاہی خاندان کے ایک معاشقہ پر مشتمل تھا، جسے ٹیلی ویژن پر پیش کیا جانا تھا۔

"اس سے اور زیادہ سختی سے پیش آؤ" ڈرامے کے ڈائرکٹر اناطول لٹویک نے میل کو تحریک دی۔ کام کے وقفوں میں اوڈرے اپنے شوہر کو اس کے طویل پارٹ کے لئے مکالمے یاد کراتی تھی۔ جب یہ ڈرامہ این بی سی کے پیغمبر یو سروں کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے میل اور اوڈرے کی اداکاری پر زیادہ اچھی رائے ظاہر نہیں کی۔ بعد ازاں اوڈرے "دی ان فورگیون" میں پارٹ ادا کرنے کے لئے چلی گئی۔ اس فلم کی میکسیکو میں فلم بندی کے دوران میں اوڈرے ایک گھوڑے پر سے گر کر مجروح ہوگئی اور اسکی پشت پر کاری ضرب آئی۔ اس حادثے کے فوراً بعد اوڈرے نے میل سے ٹیلی فون پر بات کی، "میں تمھیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میرے گرنے میں گھوڑے کا کوئی قصور نہیں تھا۔"

ایمبولینس ہوائی جہاز میں کیلی فورنیا جاتے ہوئے وہ اس بات سے پریشان تھی کہ فلم بندی میں تاخیر ہو جائے گی۔ اور میل پر اس کے مجروح ہونے کا ردعمل ہوگا۔ اسے اپنی کوئی فکر نہیں تھی۔ اوڈرے کئی ہفتوں تک اس تکلیف میں مبتلا رہی۔ اور اسے ایک کمرے میں بستر پر پڑا رہنا پڑا لیکن نہ وہ کبھی بے قرار نظر آئی اور نہ کبھی اس نے درد کا اظہار کیا۔ اس نے مسکن دوائیں بھی استعمال نہیں کیں۔ اس کے برخلاف وہ ان نرسوں سے پوچھتی۔ "کہو کیسی ہو" جیسے وہ خود نہیں بلکہ نرس بیمار ہو۔

ایک نرس نے اس کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا، "میں نے اپنی ملازمت کے تئیس برسوں میں، اوڈرے جیسا کوئی مریض نہیں دیکھا۔"

اوڈرے وکٹورین طرز کا لمبے گریبان والا گون پہنے رہتی تھی اور اس کے بال پونی ٹیل کی طرز پر پشت کی جانب ایک سفید ربن سے بندھے رہتے تھے۔ وہ اپنے بستر میں سہارے سے بیٹھی ہوئی ملاقاتیوں کو بڑی زندہ دلی کے ساتھ خوش آمدید کہتی۔ اور اپنے موضوع سے زیادہ ملاقاتیوں کے مسائل پر پوری وضع داری سے گفتگو کرتی رہتی۔ اسے جو تحفے اور گلدستے موصول ہوتے تھے، ان کے لئے شکریے کے خطوط بھی خود ہی تحریر کرتی تھی۔

"دی ان فورگیون" کے بعد اوڈرے کا ایک فلم کا معاوضہ پانچ ہزار ڈالر ہوگیا۔ لیکن اس اضافے کے باوجود اس کے معیار زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ اسے اب بھی زیورات اور قیمتی لباس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ باہر جانے کے لئے وہ سیاہ رنگ کے لباس اور درمیانی اونچی ہیل کے جوتے پہنتی تھی۔ اور گھر پر بالکل بے داغ پتلون اور قمیص اور سینڈل استعمال کرتی تھی۔

اگرچہ اوڈرے کبھی کبھی کھانے پینے کی چیزوں میں زیادہ دلچسپی لیتی تھی۔ لیکن فاقہ کشی سے اس نے اپنی وضع قطع کو سنوارے رکھا۔ وہ سہ پہر کے کھانے میں وہ تقریباً ہمیشہ پھل، دودھ، دہی یا گھر کا بنا ہوا پنیر استعمال کرتی ہے۔ گھریلو کام کاج کے لئے ملازم تھے۔ لیکن جب کبھی میل اور وہ کسی کو ڈنر پر مدعو کرتے تو اوڈرے انتہائی ذائقے دار، مسالے بھرا بچھڑے کا گوشت یا ڈچ ایپل ٹورٹ[1] خود تیار کرتی تھی۔ کھانے کی میز پر گلدستوں کا اہتمام بھی وہ خود کرتی تھی۔

۱۹۵۸ء میں میل نے اوڈرے کو ایک کہانی کا خاکہ سنایا، جسے وہ "گرین مینشنز" کے نام سے تیار کرنا چاہتا تھا۔ میل کا خیال تھا کہ اس فلم کی ہدایت وہ خود دے گا۔ اس فلم میں اوڈرے کو

---

[1] نیدرلینڈ کی ایک خاص پیسٹری، جسے سیب میں بھوے جات شامل کر کے بنایا جاتا ہے

جنوبی امریکہ کے جنگلوں میں پرورش پانے والی ایک دوشیزہ کا پارٹ ادا کرنا تھا۔

میل نے اس فلم کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے کہا، "چنانچہ ہم عجیب و غریب جنگلی جانوروں کے شاٹ لے کر، اور جنگل کے ماحول کا سیٹ تیار کر کے اس کی فلم بندی کر سکتے ہیں۔ فلم کا بیشتر حصہ جنوبی امریکہ میں فلمایا جائے گا اس فلم میں تمہارا پارٹ ایسا ہے، جس میں تمہارا ایک لاڈلا ہرن ہمیشہ تمہارے ساتھ رہتا ہے۔"

اوڈرے نے یہ وضاحت سن کر مشورہ دیا، "تو بہتر یہ ہے کہ ہم پہلے سے اس کی مشق شروع کر دیں"

اس مقصد کے لئے میل نے اوڈرے کو ایک چتکبرا ہرن فراہم کر دیا۔ اوڈرے نے اس کا نام "اپ" رکھ دیا۔ یہ ہرن غسل خانے میں سوتا تھا اور اپنی غذا اوڈرے کے کمرے میں کھایا کرتا تھا۔ شروع میں میل کے پاپ نوٹنڈ ودزنی، یا رکشا نمی کتے نے آپ کی موجودگی پر ناک بھوں چڑھائی۔ لیکن بعد میں دونوں ساتھ کھیلنے لگے اور اپنی دھینگا مستیوں میں ایک دوسرے کے شریک بن گئے۔

اوڈرے کو جانوروں سے ہمیشہ سے ہی دلچسپی تھی۔ "گرین منیشنز" میں کام کرنے سے اسے جانوروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی حرکات کی روانی نے اسے متاثر کیا" ان کا پھرتیلا پن، توازن اور حرکات پر قابو رکھنے کی قدرت، بیلے کی رقاصہ سے کس قدر مشابہت رکھتی ہے" اس نے میل سے کہا، "ہمیں ان سے سیکھنا چاہیے"

آخر اس نے ان جانوروں سے بہت کچھ سیکھا۔ سرخ رنگ کے چست لباس میں، وہ "گرین منیشنز" کے سیٹ کی قدرتی گھاس پر آئی اور جانوروں کی نقل میں اپنی مشقوں کے ایک طویل سلسلے کا مظاہرہ کیا۔

اوڈرے نے یہ تربیت محض اس لئے حاصل نہیں کی تھی کہ اسے جانوروں سے دلچسپی تھی، یا اسے یہ پارٹ کرنا تھا، بلکہ اس کے ذہن میں اس سے کہیں زیادہ یہ بات جاگزیں تھی کہ میل کی خاطر اسے یہ سب کچھ سیکھنا ضروری ہے۔ اوڈرے کو میل کا اتنا خیال رہتا تھا کہ جب ایک موقع پہ اسے یہ معلوم ہوا کہ اسے کئی ماہ تک میل سے دور رہنا پڑے گا، تو اس نے جنوری سے مئی تک کے لئے باورچی کو روزانہ کھانوں کی تفصیلات اور سونے کے وقت کے مشروبات کی تمام ہدایات لکھ کر دیں تاکہ وہ ان پر کاربند رہ سکے۔

وہ اسٹوڈیو میں ہو یا گھر پر، ہمیشہ ایک بیوی، ایک فرض شناس گھر کی مالکن ہی رہتی ہے۔ "گرین منیشنز" سے متعلق تمام لوگوں اور اس فلم میں کام کرنے والوں کو میل کی ہدایت کاری پر

اعتماد نہیں تھا۔ لیکن اوڈرے نے اس کی ہدایت میں اس طرح کام کیا جیسے وہ اسے دنیا کا عظیم ترین ہدایت کار مانتی ہو۔

اوڈرے کے متعلق ایک شاہد نے کہا تھا " اوڈرے ایک ایسی مثالی بیوی ہے ، جس کے خواب ہر شخص دیکھتا ہے "

اوڈرے جب " دی ننس اسٹوری " کے نمایاں رول کے لئے منتخب ہوئی تو اس نے اپنی عادت کے مطابق جانفشانی کو اپنا مزاج بنالیا ، اور اپنے پارٹ کے لئے شدید محنت کرتی رہی ۔ اس نے راہبہ کے رول میں ، سڑک پر دوڑتی ہوئی یا رک رک کر چلتی ہوئی ٹراموں پر چڑھنے کے لئے اپنے بھاری بھرکم کپڑوں کو سنبھالنے کی مشق پر کئی کئی گھنٹے محنت کی ۔ اس فلم کا ایک منظر پاگل خانے میں فلمایا جانا تھا جس میں ایک مشتعل پاگل عورت کو مغلوب کرنے کے لئے راہبہ کو بلایا جاتا ہے ۔ فلم ساز نے اس منظر میں ایک فرضی راہبہ رکھنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن اوڈرے نے یہ پسند نہیں کیا۔ اس نے کشتی لڑنے کی مشق کی اور یہ پارٹ خود ہی ادا کیا۔

ایک دوسرے منظر میں اوڈرے کو ایک نو خیز راہبہ کے طور پر اپنے بال گردن تک کٹواتے ہوئے دکھایا جانا تھا۔ اس مقصد کے لئے وہ بالوں کی فرضی ٹوپی استعمال کر سکتی تھی۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور مہینوں تک اپنے بال بڑھاتی رہی ، تاکہ اس منظر میں انھیں کاٹ کر ہلکا کیا جا سکے۔ چنانچہ اس خلوص کے ساتھ اس نے اپنے پارٹ کی ابتدا کی ، جس میں وہ کیمرے کے قریب اور اس سے دور ہر منظر میں ایک بے نفس راہبہ نظر آتی تھی۔

افریقہ کے تپتے ہوئے جنگلوں میں اس فلم کی تیاریوں کے دوران میں اوڈرے کے سونے کے کمرے میں ائر کنڈیشنر لگایا جانا تھا۔ لیکن غلطی سے نمی پیدا کرنے والی مشین لگا دی گئی۔ اس مشین نے اس کے کمرے کے ماحول کو اور بھی زیادہ پریشان کن بنا دیا۔

جب اس غلطی کا علم ہوا تو ٹیکنیشنز نے اوڈرے سے دریافت کیا ، " آپ نے ہمیں بتایا کیوں نہیں؟" اوڈرے نے انکسار کے ساتھ کہا " میں آپ لوگوں کو کسی پریشانی میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی "

افریقہ میں فلمائے جانے والے مناظر کی فلم بندی کے بعد ، اس فلم کے تمام کارکنان روم کے لئے روانہ ہو گئے ، جہاں اس کے مزید مناظر فلمائے گئے۔ جب فلم نمائش کے لئے پیش ہوئی تو اوڈرے

کے بیک چہرے اور اس کی دلنواز مسکراہٹ نے فلم بینوں کا دل جیت لیا۔ لوگوں نے کہا کہ وڈرے کا سارا پارٹ انتہائی متاثر کن ہے۔ ایک راہبہ کے رول میں اس کی اداکاری نے ڈرامے کو حقیقت کا روپ دے دیا تھا۔

اس فلم کو بھی بے حد داد ملی لیکن اوڈرے تعریف و توصیف سے کبھی متاثر نہیں ہوئی۔ اس نے بالینڈ پر نازیوں کے قبضے کے دوران میں اپنے ایک بیلے کے پروگرام کا حوالہ دیتے ہوئے ایک بار کہا تھا، "میرے کسی بہترین تماشائی نے میرے فن کے مظاہرے کی تکمیل پر کبھی کوئی تعریفی جملہ نہیں کہا۔"

اوڈرے اب بھی، ایک عظیم اداکار بننے کے خوابوں کا تعاقب کر رہی ہے۔ اب بھی کسی ایک منظر پر کئی کئی دن تک محنت کرتی ہے اور اسٹوڈیو کے بعد گھر آکر بھی اکثر اپنی مشق جاری رکھتی ہے۔ وہ اپنی اداکاری سے بہت کم مطمئن ہوتی ہے۔ کسی فلم کی آزمائشی نمائش پر کبھی کبھی کہہ اٹھتی ہے، "میں نے واقعی اپنا رول اچھا کیا ہے۔"

اس کے ہم کار اس کے ارادوں سے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ تاہم اس کی خواہشات کی منزل نہ شہرت ہے اور نہ سرمایہ کا حصول۔ اسے دولت سے نفرت نہیں ہے۔ لیکن وہ صرف وہی پارٹ پسند کرتی ہے جسے وہ خوش اسلوبی سے نبھا سکتی ہو۔ اعزاز اور قدر و منزلت اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ سوچتی ہے کہ بہترین اداکار بن کر وہ خود اہم ترین بن سکتی ہے۔

اوڈرے اسٹوڈیو کے باہر بھی اپنی مصروفیات میں اسی قدر انہماک کا مظاہرہ کرتی ہے۔ ایک بار اسے یونائیٹڈ نیشنز کے لئے دس منٹ کی ایک ایسی تقریر ریکارڈ کرانی تھی، جسے بلجیم سے دوبارہ نشر کیا جانا تھا۔ اس نے اس موقع پر تقریر کے مسودے کو یونہی پڑھ دینے کی بجائے پہلے اسے ازبر کرنے پر اصرار کیا۔ پھر جب وہ ریکارڈ کرنے کے بعد اس کو سنایا گیا تو وہ اس سے مطمئن نہ ہوئی۔ پھر دوسری اور تیسری بار کی ریکارڈنگ بھی اُسے پسند نہ آئی۔ بیشتر لوگ اس مسودے کی ریکارڈنگ صرف چند منٹوں میں ہی مکمل کر سکتے ہیں لیکن اوڈرے نے اس پر گھنٹوں صرف کئے۔

اوڈرے اپنے رویے پر قائم رہتے ہوئے کہا کرتی ہے، "اگر تم ایک ہی وقت میں پانچ یا چھ سمتوں میں چل پڑو تو تمہارے لئے اپنے اثرات مرتب کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔" اس لئے وہ اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہونے دیتی اور سر بلند ولد بھر کی مصروفیت کا ایک باقاعدہ ٹائم ٹیبل تیار کرتی ہے۔

کام کے دنوں میں وہ صبح پانچ بجے اُٹھ جاتی ہے۔ لیکن فلم کی تکمیل کے بعد کچھ دن ایسے بھی آتے ہیں، جب وہ سستانے کی غرض سے کچھ پڑھتی ہوئی، آٹھ نو بجے تک بستر میں پڑی رہتی ہے۔ اگر وہ اپنی پوری نیند نہیں لے پاتی تو انتہائی تکان محسوس کرتی ہے، اور اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے وہ عام طور پر ساڑھے آٹھ یا نو بجے بستر پر دراز ہو جاتی ہے، لیکن بتی بجھانے سے پہلے کچھ دیر مطالعہ کرنا بھی پسند کرتی ہے۔

وہ صبح کے وقت دو میل تک پیدل قدمی یا گھوڑ سواری کرتی ہے، یا کوئی ٹینس جیسا ورزشی کھیل پسند کرتی ہے جو وہ میل کے ساتھ کھیلا کرتی ہے۔ اسے تیراکی کا بھی شوق ہے۔ لیکن وہ معمولی تیراک ہے۔ اس کے برخلاف میل باقاعدہ بہت اچھا تیراک ہے۔

میل اور آڈرے نے ابھی تک اپنا ذاتی مکان نہیں بنایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کو، یا کسی ایک کو اکثر و بیشتر گھر سے باہر رہنا پڑتا ہے۔ اور آڈرے کو گھر سے دور رہنے کی عادت ہو چکی ہے۔ اگر وہ دونوں زیادہ لمبے عرصے کے لئے کہیں جاتے ہیں تو آڈرے اپنے ہمراہ لینن کی سفید چادریں، چینی کے آرائشی برتن، اپنی دل پسند کتابیں اور ریکارڈ اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔

آڈرے کہا کرتی ہے "میں ہر جگہ اطمینان سے رہتی ہوں۔ اور ہر قسم کے لوگوں میں رہنے سے آدمی میں بہترین اداکار بننے کی صلاحیت بڑھتی ہے۔"

امریکہ اور دیگر ممالک میں اداکار بننے کی خواہش مند لڑکیاں اکثر اس سے پوچھا کرتی ہیں، "بہترین اداکار بننے کے لئے کیا کرنا چاہیے؟"

اس سوال کے جواب میں آڈرے اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے جواب دیتے ہوئے کہتی ہے، "طویل عرصہ تک سخت محنت کرنی چاہیے، بہترین اداکار بننے کے لئے صرف حسن اور خوبصورت جسم ہی کافی نہیں ہے۔ آپ میں اداکاری کی صلاحیت بھی ہونی چاہیئے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ کو اپنے متعلق واقعیت پسندی کے ساتھ غور کرنا چاہیے، پھر یہ فیصلہ کیجیئے کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے۔"

آڈرے حسین بھی ہے اور ہنر مند بھی، لیکن اس کا عظیم سرمایہ اس کا اپنا کردار ہے۔ وہ اپنے گھر پر یا اسٹیج پر کبھی رشک و حسد، غصے یا خود پسندی میں مبتلا نہیں ہوتی۔ شہرت کو اس نے کبھی اہمیت نہیں دی۔ کبھی خود کو کسی گروہ کے مقابلے میں کھڑا نہیں کیا۔ ہمیشہ اپنے انداز، الفاظ اور عمل

سے خود کو سب سے الگ رکھا۔ وہ سخت محنت کی عادی، جوش مند، پرخلوص اور صادق العمل ہے۔
یہی وہ خوبیاں ہیں جن کے باعث اس نے اپنے ساتھیوں، نقادوں، ہدایت کاروں اور دوستوں کے دل میں جگہ بنالی ہے۔

---

(۲)

این کیرول مور

لیمیرک کی لائبریرین

این کیرول مور نے بچپن میں ہی ایسی تخیلی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا، جس سے پتہ چلتا تھا کہ یہ لڑکی بڑی ہوکر کتابوں میں حیرت ناک تجربات کرنے والے ہزاروں بچوں کی شریک بنے گی۔
جب تک این کی یادداشت نے کام کیا وہ "کورنٹس روڈ" نامی اس سڑک سے محبت کرتی رہی، جو جنگلوں اور ندی نالوں سے گذرتی ہوئی وہائٹ ماؤنٹین کی جانب چلی جاتی تھی۔ وہائٹ ماؤنٹین سے آگے تمام دنیا پھیلی ہوئی تھی۔ ایک روز این کے باپ نے اسے بتایا کہ دنیاؤں کو پاٹ کر بنائی ہوئی یہ سڑک "کورنش روڈ" پہاڑوں کے نیچے تک جاتی ہے۔ این نے متحیر ہوکر سوچا کہ کیا یہ سڑک چین کی جانب چلی گئی ہے؟ اور کیا چینی لڑکے لڑکیاں اس سڑک پر چلتے پھرتے ہوں گے؟ یہ خیال آنے کے بعد اس نے کچھ دیر کے لئے اپنے کھیلوں کو ترک کر دیا اور لندن برج کی طرز پہ گانے لگی "کورنش روڈ نیچے چلی گئی ہے، نیچے چلی گئی ہے۔"
این ۱۲ جولائی ۱۸۷۱ء کو لیمیرک مین کے قریب ایک فارم میں پیدا ہوئی تھی۔ این کے والد لوتھر۔ ایس۔ مور وکالت کرتے تھے۔ ڈاکٹروں نے انہیں کھلی فضا میں رہنے کا مشورہ دیا تھا، اس لئے انھوں نے یہ فارم خرید لیا تھا، لیکن انھوں نے وکالت جاری رکھی تھی۔ یہاں کے گھوڑے، بھیڑیں، مرغیاں اور گائے بیل سب این کے منظورِ نظر تھے۔ اپنے سات بھائیوں کے ساتھ اس نے

پتھروں کی دیواروں کے اندر میلوں تک پھیلی ہوئی چراگاہوں اور باغوں کی سیاحت کی تھی، درخت دار پہاڑوں پر چڑھی تھی اور سال کے بیشتر حصہ میں برف پوش رہنے والی پہاڑوں کی چوٹیوں کا نظارہ کرتے ہوئے اپنے تصورات کو وسعت بخشی تھی۔

اسے باغبانی کا بھی شوق تھا، اور وہ پیٹنک[1]، فلوکس[2]، زینیا[3] اور گیندے کے پودوں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔ آین کی ماں ان پودوں کو 'جادو کے گہوارے' کہا کرتی تھی۔ ان پھولوں کو توڑ کر وہ دوستوں اور ہمسایوں میں تقسیم کر دیتی تھی۔ آین نے اپنے حصے میں دوسروں کو شامل کرنے کا سبق اسی عمل سے حاصل کیا تھا۔

بہار کے موسم میں آین نے دیکھا کہ اس کے بھائی شکر کا میپلز[4] میں پانس ٹھونک کر، اور ڈول لٹکا کر رس نکالا کرتے تھے، پھر اس جمع شدہ صاف اور پتلے رس کو ایک بڑے ناند میں اس وقت تک کھولاتے تھے، جب تک اس کا قوام تیار نہ ہو جاتا تھا۔ باپ نے اسے بتایا تھا کہ ایک گیلن قوام بنانے کے لئے پینتیس سے پچاس گیلن تک رس درکار ہوتا ہے۔ اس کے ابلنے کا انتظار کرتے ہوئے آین غلیل کی طرح لچک دار درخت پر اپنے تخیل میں ہی بہت سی مسافتیں طے کر لیتی تھی۔ پھر جیسے ہی اس کا کوئی بڑا بھائی پکار کر کہتا "اب یہ تیار ہے" تو وہ اچھل کر دوڑ پڑتی، اور بھائی کو قوام کے میٹھے جھاگ برف پر جماتے ہوئے دیکھتی رہتی۔ ان میٹھی ٹکیوں کو زبان پر رکھ کر گھلاتے ہوئے آین نے محسوس کیا کہ ان کا ذائقہ اس آیلوپچ سے بہتر تھا، جسے ایک بار اس نے دکان سے خریدا تھا۔

ابھی اس کی عمر اسکول جانے کے قابل نہیں تھی، لیکن جب وہ اپنے باپ کو چھوٹی سیٹوں والی بگھی میں گھوڑے جوڑتے ہوئے دیکھتی تو اسکول جانے کے لئے مچل اٹھتی تھی۔ جب بار بار اس کا یہ تقاضہ سامنے آیا تو باپ نے محسوس کیا کہ وہ اسکول جانے کے لئے مستعد ہے۔ مسٹر مید دل ہی دل میں اس کی خواہش پہچان کر اس سے اس طرح مخاطب ہوتے جیسے کسی باشعور سے بات کر رہے ہوں' "مجھے

---

[1] خوشبودار پھولوں کا پودا، جس کے پھول گلابی اور سفید رنگ کے ہوتے ہیں۔
[2] ایک پودا جس کے پھول طباق نما ہوتے ہیں۔ [3] کرن دار، مختلف رنگوں کے پھولوں کا پودا۔
[4] ایک درخت جس سے شکر بنتی ہے۔

ایک ضروری کام سے ایک آدمی سے ملنے جانا ہے اور تمھیں بھی ساتھ لے جانا چاہتا ہوں "
نیوفیلڈ، پرسنس فیلڈ یا کورنش میں سے کسی ایک گاؤں کی جانب سفر کرتے ہوئے مسٹر مور، آین کے اکسانے پر اس کے بچپن کے واقعات سنانے لگتے یا اس کے اس بھائی کا قصہ سناتے جو ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر صحرا کے پار گیا تھا اور پر اسرار طریقے سے لاپتہ ہو گیا تھا۔ اس کے متعلق قیاس تھا کہ شاید وہ کہیں ریت کے طوفان میں پھنس گیا ہوگا۔ واقعات کو زیادہ اثر انگیز اور دلچسپ بنانے کے لیے مسٹر مور ہیپ، بائبل اور شاعری کے حوالے بھی دیا کرتے تھے۔
باپ کے موکلوں نے آین کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ان میں سے ایک موکل کے چہرے پر ارغوانی رنگ کا نشان تھا، اور اس نے اپنے گھر کے دالان میں گھاس کا اتنا اونچا ڈھیر لگا رکھا تھا کہ گھر میں داخل ہونے کا راستہ بھی رک گیا تھا۔
پھر جب وہ واپسی پر گھر کا رخ کرتے تو اس راستے کی بجائے جس سے وہ آئے تھے، کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لیتے تھے۔ آین کے والد عموماً اسے اپنے موکلوں کے متعلق تھوڑا بہت بتا دیتے اور یہ توقع بھی ظاہر کر دیتے کہ ہر موکل سے متعلق کام بہتر طور پر تکمیل پا جائے گا۔ بعض اوقات وہ راستے میں کسی چٹان کے ساتھ لگی ہوئی بیل میں آدھی آدھی چھپی ہوئی جنگلی اسٹرابیریاں توڑنے کے لئے رک جاتے تھے۔
طوفانی موسم میں آین کے بھائی، خاندان کی بھری پری لائبریری میں سے کتابیں منتخب کر کے، کھپریلی چھت کے نیچے اوپری منزل میں بے قاعدہ طور پر پھیلے ہوئے وسیع مکان کے کسی زینے میں کتابیں پڑھنے بیٹھ جاتے تھے۔ بھائیوں کو مطالعے میں مصروف دیکھ کر آین کا دل بجھ جاتا تھا اور وہ بے چین ہو اٹھتی تھی کہ کاش وہ بھی پڑھنے کے قابل ہوتی اور کتابوں کی طلسماتی دنیا سے اپنے لئے پتلے اور چھوٹے یا موٹے اور لمبے دوست تلاش کر سکتی۔ آین کی ماں اسے اسی طرح کتابیں پڑھ کر سنایا کرتی تھی، جس طرح اس کے چڑچڑے مزاج والی ماں نے اسے پڑھ کر سنائی تھیں؛ لیکن آین باپ کے علاوہ اور کسی سے کتابوں کے قصے سننا پسند نہیں کرتی تھی۔ باپ اسے اس طرح پڑھ کر سنایا کرتا تھا جیسے اس سے باتیں کر رہا ہو۔ اور آین کے پسندیدہ رسالے "دی نرسری" میں سے کہانیاں سناتے ہوئے، اسی کی طرح ان کہانیوں میں کھو جاتا تھا۔

جب وہ پانچ برس کی تھی تو ایک روز اس نے موٹے حرفوں میں چھپی ہوئی سینٹ جان کی انجیل پڑھتے ہوئے کچھ الفاظ کے معنی خود بخود سمجھ لئے تھے۔ لیکن اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اپنی اس قابلیت کے متعلق اپنے عزیزوں سے اس وقت تک کوئی ذکر نہیں کرے گی۔ جب تک وہ اچھی طرح پڑھنے کے قابل نہ ہو جائے۔ اس رات خوشی کے باعث اسے نیند بھی نہیں آئی تھی۔

کتابوں کے علاوہ موسیقی اور مصوری کا ذوق بھی ایَن نے اپنے والدین سے حاصل کیا۔ کھانے کی میز پر اس کے والدین عوامی مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔ ایَن یہ گفتگو غور سے سنا کرتی تھی۔ مسٹر مید جو ریاست کے زراعتی کالج کے متولی تھے، اچھے اسکولوں، بہتر سڑکوں اور بہتر حکومت کے حامی تھے۔

ایَن اسکول میں داخل ہوئی تو اسے اسکول کا ماحول بے حد پسند آیا۔ لیکن چھٹیوں کا انتظار بھی وہ بڑی بے تابی سے کیا کرتی تھی۔ کرسمس کے موقع پر وہ اپنی ماں کے ساتھ بڑی گوندنی کے سرخ پھولوں کے ہار بنایا کرتی تھی۔ ایَن کی سالگرہ پر، اس کی سالگرہ کے کیک پر موم بتیوں کی جگہ گلاب کے پھول لگائے جاتے تھے۔ کرسمس کی طرح اس موقع پر بھی وہ خوب شرارتیں کرتی تھی۔ مئی ڈے کی تیاریوں کے لئے ایَن کی ماں اس کے ساتھ رنگین کاغذی ٹوکریاں بنوایا کرتی تھی، جنھیں بعد میں وہ پھولوں سے بھر دیتیں اور ایَن چپکے چپکے ان ٹوکریوں کو دوستوں کے گھر لے جاتی اور ایک ٹوکری دروازے کی کنڈی میں لٹکا کر، دستک دیتی ہوئی بھاگ کھڑی ہوتی۔ بھاگتے ہوئے بھی اسے خدشہ رہتا کہ ہمسائے کے لوگ اسے پکڑ لیں گے اور پیار کریں گے۔

عام دنوں میں ایَن اپنے بھائیوں کے ہمراہ گھوڑے پر سوار ہو کر کروکے (ایک قسم کا کھیل) یا کوئی دوسرا محنت جانفشانی کا کھیل کھیلا کرتی تھی۔ سردیوں کے موسم میں وہ اسکیٹنگ کرتی یا برفیلی پہاڑیوں پر سے پھسلنے کا کھیل کھیلا کرتی تھی۔ برف پر پھسلنے والی بے پہیوں کی گاڑی پر بیٹھ کر وہ کسی ریسی ڈھلوان چٹان پر پہنچ جاتی جو شاہراہ تک جاتی ہو، پھر وہ اپنی پر خطر، بے پہیوں کی اور دھیرے دھیرے چلنے والی بیل گاڑی کے ساتھ چٹان سے پھسلا کرتی تھی۔ اس ڈھلان پر پھسلتے ہوئے اسے اس مقام پر سخت خطرہ درپیش ہوتا تھا، جہاں اسے تین دوسری چٹانوں تک پہنچنے کے لئے ایک موڑ پر تیزی سے مڑنا پڑتا تھا۔ اس موڑ سے ہو کر وہ کمبلوں کی اس فیکٹری تک پہنچ جاتی تھی، جو یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ اس کے بچپن کا سب سے زیادہ قابل فخر دن وہ تھا جب اسے برف گاڑی

چلانے کے ماہر لڑکے کے ساتھ گاڑی پر بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ لڑکے نے تنبیہ کرتے ہوئے اس سے کہا تھا "اگر تم راستے سے ہٹ جائیں تو فوراً کر خود مت جانا۔"

این جب دس برس کی ہوئی تو اسے ییمبرک اکیڈمی میں داخل کر دیا گیا۔ یہ اسکول این کے مقامی اسکول سے زیادہ معیاری تھا۔ دوسرے درجوں میں پڑھنے والے طالب علم جو کچھ زور زور سے پڑھتے تھے اسے این سنتی رہتی تھی۔ اس طرح اس نے بہت سے غیر متعلق حقائق معلوم کرلئے اور انھیں اپنے طور پر یکجا کرنے اور سلجھانے کی کوشش کی۔ این کا ایک بھائی لاطینی کا سخت مخالف تھا۔ اس لئے اس نے لاطینی نہ پڑھنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن اکیڈمی کے پرنسپل نے زبان کے متعلق این کے خیالات کو تبدیل کیا اور اسے شیکسپیئر کے مطالعے کی رغبت دلائی۔ این اس وقت تیرہ برس کی ہو چکی تھی۔ اور اکیڈمی کے پرنسپل مسٹر ہوڈ کے مکان میں ہی رہا کرتے تھے۔ این کو ڈرامے کے فن سے بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ اس نے اسکول کے ڈراموں میں بھی حصہ لیا اور کئی بار اہم رول ادا کئے۔

این کے کچھ نوعمر احباب دیہات کی مست خرام اور یک رنگ زندگی سے متنفر تھے لیکن این کا عقیدہ تھا کہ اس نے کتابوں میں جن بھوتوں کا اور طلسمات کا ذکر پڑھا ہے، وہ تمام کی تمام سادہ طریقے سے ییمبرک میں موجود ہیں۔ یہاں کی زندگی سے اس نے کبھی اکتاہٹ محسوس نہیں کی تھی۔

سترہ برس کی عمر میں اس نے ییمبرک اکیڈمی سے امتحان پاس کیا۔ اور پھر بیڈ فورڈ (میس چوسٹس) کی بیڈ فورڈ اکیڈمی میں داخل ہو گئی۔ اب وہ ایک ہونہار، تیز طرار اور ذہین طالب علم تھی۔ ملک کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے طالب علموں سے اس نے آسانی کے ساتھ دوستی کرلی تھی۔ اب اسے صرف اپنے مستقبل کا فکر تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا "میں وکیل بننا چاہتی ہوں"

"لیکن لڑکیوں میں وکالت کا رواج بہت کم ہے" اس کے دوست نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اور بہت سے اسکول تو قانون کے شعبے میں لڑکیوں کو داخلہ ہی نہیں دیتے"

این نے کہا "قانون کی تعلیم اسکول کی بجائے کسی وکیل کے دفتر میں بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔" اس کے دو بھائیوں نے قانون کی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی تھی۔ تو پھر وہ ایسا کیوں نہیں کر سکتی؟

این نے جب اپنے پروگرام سے والدین کو مطلع کیا تو انھوں نے ہمیشہ کی طرح اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ مسٹر ہوڈ نے اسے لکھا "تم جو کچھ بھی کرو نہایت ذوق و شوق کے ساتھ اپنا دل و دماغ

اس میں لگا دی"۔ لیکن اینی کو اپنے والد کے دفتر میں آئے ہوئے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ مسٹر مور کا انتقال ہوگیا اور اس کے وکیل بننے کے خواب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ کیونکہ بھائیوں کے لئے گھر کا کام چلانے میں اسے اپنی ماں کی مدد کرنی تھی ۔

اس پریشانی کے عرصے میں اینی کو مطالعے سے کچھ سکون ملا کرتا تھا۔ گھر پر چونکہ بہت سی کتابیں موجود تھیں۔ اس لئے اسے پبلک لائبریری سے کتابیں لانے کی خاص ضرورت نہیں پڑتی تھی لیکن جب کبھی وہ لائبریری جاتی تھی تو وہاں بچوں کی حالت دیکھ کر اسے بے حد افسوس ہوتا تھا۔ اس لائبریری میں بچوں کی کتابیں بہت کم تھیں، اور ان کے لئے کوئی مخصوص کمرہ بھی نہیں تھا ۔

جب گھر کے حالات سدھر گئے تو اینی نے لائبریرین بننے کے امکانات پر غور کرنا شروع کردیا آج کل تو لائبریرین بننے کے لئے چار برس کا کورس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک برس کا یہ خاص کورس بھی کرنا پڑتا ہے جو کیٹلاگ سازی اور کتابیات سے لے کر لائبریری سائنس اور پبلسٹی پر مشتمل ہے لیکن ۱۸۹۰ء کے زمانے میں عام طور پر ایسی معمر خواتین لائبریرین ہوا کرتی تھیں۔ جن کی تربیت معمولی ہوتی تھی اور ان کے پاس کوئی خاص ڈگری بھی نہیں ہوتی تھی ۔

اس مقصد کے لئے اینی نے ممکنہ تیاری کے بغیر ہی بروکلین (نیویارک) کے پریٹ انسٹی ٹیوٹ کا انتخاب کرلیا۔ کیونکہ یہاں وہ نیو فری لائبریری میں کتابوں کی کیٹلاگ سازی اور انتخاب کا طریقہ بھی سیکھ سکتی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں اسے شہری زندگی سے عشق سا ہوگیا تھا۔ پہلے اس کا ارادہ تھا کہ وہ ایک چلتی پھرتی لائبریری کی بنیاد رکھنے کے لئے مین واپس آجائے گی۔ لیکن جب پریٹ انسٹی ٹیوٹ فری لائبریری کی ڈائرکٹر، میری رائٹ پلومر نے بچوں کے لئے ایک دارالمطالعہ کے قیام میں تعاون دینے کے لئے اس سے وہیں قیام کرنے کی درخواست کی تو اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اس زمانے میں اس قسم کی سہولیات صرف چند لائبریریوں میں ہی موجود تھیں۔ کچھ لائبریریاں ایسی بھی تھیں جن پر "کتے اور بچوں کا داخلہ ممنوع ہے" کا بورڈ لگا رہتا تھا۔ اینی اور مس پلومر نے اپنی نگرانی میں ایسا کمرہ تیار کیا جس میں مختلف اونچائی کی میزیں اور کرسیاں لگائی گئی تھیں، نیچی نیچی بنی ہوئی کھڑکیوں میں سے بچے کھیل کے ہموار میدان کا جائزہ لے سکتے تھے، جہاں وہ گرمیوں کے موسم میں سیر و گشت کرسکتے تھے اور سردیوں کے موسم میں پھسلنے کا کھیل کھیل سکتے تھے ۔

این نے سوچا کہ بچوں کو لائبریری میں آکر خوش گوار تجربہ ہوگا۔ وہ ہر بچے میں مطالعے کا ذوق پیدا کرنے کی آرزو مند تھی، کیونکہ وہ محسوس کرتی تھی کہ کتابیں مسرت بھی فراہم کر سکتی ہیں اور اعلیٰ خیالات کی تبلیغ بھی کرتی ہیں۔

اس میں بچوں کی ذہنی روش کو سمجھنے کی غیر معمولی خداداد صلاحیت موجود تھی۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ جانور بھی انسانوں کی طرح ہو سکتے ہیں اور ایک بالشتیا بھی اتنا ہی حقیقی ہو سکتا ہے، جتنا ایک دودھ بیچنے والا۔

این کی چھوٹ موٹ کے کاموں کی تعریف، اس کا گھٹنوں کے بل چلنا، اس کی تغیر پذیری، اور اس کا مزاحیہ انداز بچوں کے لئے بیش بہا سرمایہ تھا۔ کتابوں سے اس کی دلچسپی، اور بچوں سے اس کی محبت نے لائبریری میں آنے والے بچوں پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ اور انھوں نے این کو اپنے خوابوں مایوسیوں اور پسند ناپسند کا حصہ دار بنا لیا تھا۔ کچھ ہوشیار لڑکے کتابوں کی پڑتال کرنے کے لئے یا اپنے دوسرے دوسرے بچوں کو آگاہ کرنے کے لئے میلوں تک جایا کرتے تھے تاکہ ان کی باتیں سن کر کوئی ایک بچہ شام میں بیٹھ کر آئے اور اپنے بہت سے ساتھیوں کے لئے لائبریری سے کتابیں لے جا سکے۔

این نے بچوں کی لائبریری کے متعلق زیادہ سے زیادہ دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش میں امریکن لائبریری ایسوسی ایشن کے ایگزیکٹو بورڈ کو تحریر کیا اور ان سے درخواست کی کہ بچوں کی لائبریریوں کے لئے ایک الگ شعبہ قائم کیا جائے۔ جب ۱۹۰۰ء میں مونٹریال میں کانفرنس منعقد ہوئی تو اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا چیرمین این کو مقرر کیا گیا۔ اس کانفرنس میں تمام شرکاء کے سامنے ایک مشترک مسئلہ یہ درپیش تھا کہ بچوں کے لئے کتابوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اور جو موجود تھیں ان میں معیاری اور دلچسپ کتابیں بہت کم تھیں۔

لائبریری کے حلقوں میں این نے جدو جہد کا آغاز کیا اور پریٹ میں اسے جو کامیابی ہوئی، اس کے باعث اسے نیویارک پبلک لائبریری میں بچوں کے شعبوں کی سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ مل گیا۔ یہ عہدہ پہلی بار قائم کیا گیا تھا۔ اور اب پالیسیوں کی تشکیل، کتابوں کے مناسب ذخیرہ کی فراہمی اور اسسٹنٹوں کی تربیت کی ذمہ داری اس پر تھی۔ یکم ستمبر ۱۹۰۶ء کو اس نے اپنے اس نئے عہدہ کا چارج لے لیا تھا۔ این نے سینٹرل لائبریری کے لئے، اور اس کے بعد بیالیس لائبریریوں کے لئے چھتیس سے

دنوں میں خاص خاص نمائشوں اور دیگر سرگرمیوں کے منصوبے بناتے۔ ہالووین[۱] کے موقع پر بچوں نے جادوگرنیوں، بدشکل روحوں اور بھوتوں کے روپ بھرے، اور یوم ویلنٹائن کے موقع پر این نے قدیم ویلنٹائنوں کی ایک ایسی نمائش کی جس میں انجیل کی آیتوں، تصویروں اور نفیس کیلیگرافی سے کام لیا گیا تھا۔

پریٹ کی طرح سینٹرل لائبریری میں بھی بچوں نے انتہائی جوش و خروش سے این کی خواہشات کی تقلید کی۔ لائبریری کے ایک نوعمر مربی نے این سے مخاطب ہو کر شوخی سے کہا، "کہیے مس ایلی گینٹ فاؤل، آپ کے کیسے مزاج ہیں؟" یہ جملہ سن کر این کو انتہائی مسرت ہوئی۔ ایک دوسرے بچے نے اس سے کہا، "آپ کے بغیر مطالعے میں مزا نہیں آتا" اس طرح کی باتیں سن کر این خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھی۔

این نے لائبریری کے نوعمر مربیوں کو سکھایا تھا کہ کتابوں کو پوری احتیاط اور احترام سے استعمال کرنا چاہئے۔ بیشتر لڑکے لڑکیاں، الماریوں میں سے کتابیں نکالنے سے قبل اپنے ہاتھ دھویا نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود کتابیں میلی ہو جاتی اور کہیں کہیں سے پھٹ جاتی تھیں۔ این کا خیال تھا کہ کتابیں صاف ستھری اور خوبصورت ہوں تو انہیں صحیح طریقے سے برتنے کی خواہش ہوتی ہے، چنانچہ وہ ایسی کتابوں کو جو کثرت استعمال سے خراب ہو جاتی تھیں لائبریری سے نکال دیتی تھی۔

ایک بار این کو معلوم ہوا کہ کچھ برانچ لائبریریاں جن نواحی علاقوں میں واقع ہیں، وہاں تارکین وطن کا اجتماع ہو رہا ہے۔ چنانچہ این نے فوراً ایسے ذرائع سوچنے شروع کر دیئے، جن سے یہ نہایت بہترین کتابوں کے مطالعہ کے ذریعے خود کو مطمئن محسوس کر سکیں۔ اطالوی زبان کے شعبے کی ایک برانچ لائبریری کے لئے اس نے ایک ایسا کتابچہ تیار کیا جس میں لائبریری کی خدمات کو تصویروں کے ذریعے بیان کیا گیا تھا۔ اس لائبریری میں جب اس نے بچوں کو کہانیاں سنائیں تو ان میں ایک اطالوی لوک کہانی بھی شامل کر لی۔

لائبریرین کے ذریعے بچوں کو کہانیاں سنانے کا یہ سلسلہ سینٹرل لائبریری کی ایک خصوصیت بن گیا تھا۔ این کا اندازہ تھا کہ داستان گوئی محض دلبستگی کا سبب بنے گی۔ لیکن جب اس نے

۱؎ عیسائیوں کی مذہبی تقریب جو ۳۱ اکتوبر کو منائی جاتی ہے۔

بچوں کے چہرے پر شگفتگی، حسن یا مزاح کے اثرات مرتب ہوتے دیکھے تو اسے اس سلسلے کی افادیت پر یقین آگیا۔ کہانیوں کو اثر انگیز بنانے کے لیے آین نے اپنی شخصیت کو انتہائی پرکشش بنایا اور اس فن میں مہارت حاصل کر لی۔ نیز جب کبھی ممکن ہوا، اس نے پیشہ ور داستان گویوں میں سے انگلینڈ کی میری این شیڈ لوک وغیرہ کو بھی مدعو کیا۔ آین میں خود یہ صلاحیت تھی کہ جب وہ کہانی سناتی تو بچے یا لتنیوں کو اپنے سامنے کھیلتے ہوئے محسوس کرتے، اور اپنے اطراف کی دنیا انھیں نئی محسوس ہونے لگتی تھی۔

شروع شروع میں داستان گوئی کے پروگرام میں صرف چھوٹے بچوں کو شریک کیا گیا تھا، لیکن اس کے بعد گیارہ، بارہ برس کے بچوں نے بھی کہانی سننے کا مطالبہ کیا۔ پھر داستان گوئی کا یہ سلسلہ اتنا مقبول ہوا کہ ایک بار یہ پروگرام صرف ٹکٹ خریدنے والوں کے لئے مخصوص کرنا پڑا۔ اس موقع پر بچوں کو تادیب و تنبیہ کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اگر کوئی گڑبڑ پیدا ہوتی تو این بدنظمی پھیلانے والوں کو فوراً باہر نکال دیتی تھی۔ گڑبڑ پیدا کرنے والے بچوں کو سزا کے طور پر ایک بار کہانی سننے اور کتابیں حاصل کرنے کے حق سے محروم کر دیا جاتا تھا۔

کرسمس کے موقع پر ہر سال این یہی کوشش کرتی تھی کہ کرسمس کی تقریب لائبریری کے نوعمر مربیوں کے لئے انتہائی مسرت خیز بنائی جائے۔ اس موقع پر عام طور سے کرسمس کے کاغذوں میں لپٹے ہوئے کتابوں کے پیکٹ انتہائی احترام کے ساتھ ایک جانب رکھ دیئے جاتے تھے۔ ان پر کرسمس کی مبارک باد کا کارڈ بھی لگا رہتا تھا۔ بچے ان پیکٹوں کے گرد منڈلاتے رہتے، تاکہ اندازہ لگا سکیں کہ ان پیکٹوں میں کون سی نئی کتابیں یا ان کی محبوب پرانی کتابیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی این بڑی عمر کے لوگوں کے لئے ایسی کتابوں کی نمائش کا اہتمام کیا کرتی تھی جو بچوں کے لئے بہترین تحفہ ثابت ہو سکتی تھیں۔

۱۹۱۰ء کی کرسمس کے موقع پر این نے چالیس زرق برق گڑیوں کا اہتمام کیا۔ ایسی گڑیاں عام طور پر گرین وچ میں ہڈسن پارک لائبریری کے نمائشی کیسوں میں سجی رہتی تھیں۔ ہر بچے کو اس نے ایک ایک گڑیا تحفہ کے طور پر دی، اس کے بعد مشہور مصنف رتھ سیڈیر نے اپنی کہانی

"ننھی منی سرخ ٹوپی" خوش گلوئی کے ساتھ بچوں کو سنائی۔

جب لائبریری کے کاموں کا دائرہ وسیع ہوا تو این نے تمام ملک سے اسسٹنٹوں کی آسامیوں کے لیے درخواستیں طلب کیں۔ درخواست دہندگان کے مطالعے کے پس منظر کا اس نے انتہائی سہل اور بااعتماد طریقے سے اندازہ لگایا۔ انھیں کیٹلاگ سازی اور ریفرنس کے فرائض کی انجام دہی کے قابل تو ہونا ہی چاہیے تھا، نیز ان کے معیار اور قابلیت کا اندازہ کرنے کے لیے اس نے اس طرح کے سوالات قائم کیے، "کیا آپ نمائش کا اہتمام کرسکتے ہیں، کہانیاں سنا سکتے ہیں؟ والدین یا اساتذہ کے اجتماعات سے خطاب کرسکتے ہیں۔؟" ہر ایک درخواست پر اس نے پوری بصیرت کے ساتھ غور کرتے ہوئے خود اپنے آپ سے مشورہ کیا، "کیا یہ شخص صاحب تخئیل ہے، کیا اسے کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا ذوق ہے؟ کیا یہ شخص بچوں کا احترام کرنے کے قابل ہے؟"

نئے اسسٹنٹوں کے لیے مس مور نے ایک ٹریننگ کورس مرتب کیا، جو ان کے فرائض، تجربات اور لکچروں پر مشتمل تھا۔ اپنے اسسٹنٹوں کو اس نے تاکید کی "کتب خانوں اور آرٹ گیلریوں میں جائیے۔ لائبریری کا کام ایک زندہ و تابندہ اور ارتقا پذیر تجربہ ہونا چاہئے۔"

این نے اسسٹنٹوں کے لیے اعلیٰ قابلیت کا معیار مقرر کیا تھا۔ لیکن جب وہ ان سے ملی تو ان کی کوششوں کی بے حد تعریف بھی کی۔ بعدازاں اس شائستہ اور منصف مزاج خاتون نے خود کو اپنے اس قابل اسٹاف سے وابستہ کرلیا۔ اس کی ذہانت اور بصیرت کے باعث اس کے اسسٹنٹ اور دیگر ہم کار، اس سے مشوروں اور حوصلہ افزائی کے لیے متواتر اس کے پاس آتے رہتے تھے۔ وہ تمام موضوعات کی تفصیل کو پوری توجہ سے سنا کرتی تھی، لیکن اسے کسر نفسی پسند نہیں آتی تھی۔ ایسے موقع پر وہ ترش لہجے میں ہدایت دیتے ہوئے کہتی تھی "اپنی صلاحیتوں کو محسوس کیجیے اور ان کو بروئے کار لائیے۔"

این پر کام کا بے حد بار تھا لیکن اسے اپنے کام سے عشق تھا۔ جب وہ بچوں کو مکانوں کی چھتوں، لوہے کی بالکونی اور چکردار زینوں میں یا کسی کھیل کے میدان کے کسی سایہ دار کونے میں، یا کشتیوں میں کتابوں کے مطالعہ میں مصروف دیکھتی تو خوشی سے اس کے چہرے پر

مسکراہٹیں رقصاں ہوجاتی تھیں۔

ایک دن سہ پہر کے وقت ایک یہودی عورت اپنے تیرہ سالہ لڑکے کو لائبریری میں لائی اور آئین سے کہا، "میں جاننا چاہتی ہوں کہ آخر یہاں لیوپولڈ کو کیا ملتا ہے؟"

"آیئے میں آپ کو لائبریری دکھاتی ہوں" آئین نے لیوپولڈ کی ماں سے کہا۔ لیکن اس کے فوراً بعد اسے خیال آیا کہ یہ عورت صرف لائبریری ہی دیکھنا نہیں چاہتی، بلکہ کچھ اور بھی معلوم کرنا چاہتی ہے۔

"لیوپولڈ نے جب سے یہاں آنا شروع کیا ہے، یہ کتابوں کے مطالعے میں انتہائی مستغرق ہوگیا ہے۔ میری اور دوسروں کی پہلے سے زیادہ عزت کرنے لگا ہے" اس عورت نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

بعدازاں، اس واقعہ کو اپنے ایک اسسٹنٹ کو سناتے ہوئے مس مور نے کہا، "مجھے جناب! آپ یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ کتابیں یا لائبریرین بچوں کو کیا کچھ بنا سکتے ہیں۔"

اپنے فرائض کی تکمیل کے بعد مس مور ڈرامے دیکھنے چلی جاتی۔ یا عجائب گھروں اور آرٹ گیلریوں سے لطف اندوز ہوتی تھی۔ نیز پڑوسیوں کی تقریبات میں بھی شرکت کرتی تھی۔ وہ روزمرہ کے واقعات اور مصروفیات سے لطف لیتی تھی۔ اسے دوستوں یا نامور شخصیتوں کے ساتھ میں ہیٹن کی سیاحت بہت بھاتی تھی۔ رات کے وقت کسی بلند عمارت سے اپنے ساتھیوں کو جگمگاتے ہوئے شہر کا نظارہ کرانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ یا پھر وہ اپنے دوستوں کو ریستورانوں میں دعوت دیتی اور دوسرے ملکوں کے کھانوں کی خصوصیات انتہائی ذوق و شوق سے بیان کرتی تھی۔

پھر پہلی جنگ عظیم شروع ہوجانے کے باعث کتابیں کمیاب ہوگئیں۔ بعدازاں انفلوئنزا کی وبا پھیل جانے کی وجہ سے ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ نے سینما اور لائبریریاں بند کرادیں۔ لائبریریاں بند ہوجانے کے بعد مس مور اگر کہیں سڑک پر بچوں کو نظر آجاتی تو وہ اسے راہ میں روک کر کتابوں کے متعلق گفتگو کرنے لگتے تھے۔ ایک روز ایک لڑکی نے یاس انگیز لہجے میں آئین سے کہا، "کتابوں کے بغیر میں بہت اداس ہوں" پھر جب لائبریری دوبارہ کھلی تو بچے خوشی سے بغلیں بجاتے ہوئے

بے تابی کے ساتھ تیز تیز قدموں سے لائبریری میں داخل ہوتے۔ اس اقدام میں مس مور بھی ان کے ہم قدم تھیں۔

مدت سے اینی کو اس بات کی تشویش تھی کہ اخبارات میں بچوں کے لئے لکھی جانے والی کتابوں پر تبصرے شامل نہیں ہوتے۔ چنانچہ جب "بک مین" کے ایڈیٹر نے اینی سے اپنے جریدے میں کتابوں پر سلسلہ وار مضامین لکھنے کی درخواست کی تو اس نے انتہائی جوش و خروش کے ساتھ اسے منظور کر لیا۔ اس کے بعد اس نے "نیویارک ٹریبون" کے لئے بھی تبصرے لکھے۔ اینی کی رائے میں بچوں کی کتابوں کو بالغوں کی کتابوں سے زیادہ حسین اور دلاویز ہونا چاہئے تھا اس نے ناشرین کو ترغیب دی کہ وہ بچوں کی کتابیں تیار کرنے کے لئے امتیازی قابلیت رکھنے والے افراد کی نگرانی میں خاص شعبے قائم کریں۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر فرانس کے حلقوں سے خبریں آئیں کہ وہاں لائبریریاں بمباری سے مسمار ہو گئی ہیں۔ کتابوں کے ذخیرے تباہ ہو گئے ہیں یا انھیں گاڑیوں میں بھر کر کہیں منتقل کر دیا گیا ہے۔ تباہ شدہ فرانس کے لئے امریکی امدادی کمیٹی نے جب یہ اعلان کیا کہ لائبریریوں اور کتابوں کی فراہمی کا کام بھی اس کے فرائض میں شامل ہے، تو اینی نے بحالی کے اس کام میں تعاون دینے کے لئے اپنی اور اپنے اسٹاف کی خدمات پیش کر دیں۔

اپریل ۱۹۲۱ء میں وہ امریکن لائبریری ایسوسی ایشن کے نمائندے کی حیثیت سے فرانس روانہ ہو گئی۔ جہاں اسے دیگر ممالک کی لائبریریوں کے تعاون سے بحالی کے کام کو سرعت سے انجام دینا تھا۔ فرانس پہنچ کر اینی نے دیکھا کہ امریکن کمیٹی کے تعمیر کردہ معمولی قسم کے عمارتی ڈھانچوں کے باہر بچوں کی لمبی قطاریں تھیں۔ جو کتابوں کے مطالعے کیلئے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے جنگ کے زمانے میں ان ہونہار بچوں کے گھر بمباری سے راکھ کا ڈھیر بن گئے تھے، اور وہ صرف خوراک کے لئے نہیں، بلکہ کتابوں کے لئے بھی ترستے رہے تھے۔ اسکولوں میں پڑھائی ختم ہو جانے کے باعث ان کے پاس کورس کی کتابیں بھی نہیں تھیں۔ اب وہ اپنے خوف و ہراس کو لائبریریوں میں اپنے نئے اور خوشگوار تجربات سے تبدیل کر رہے تھے۔

مئی اور جون میں اینی نے بے شمار گھروں، اسکولوں اور لائبریریوں کا دورہ کیا۔ پیرس میں

اس نے میوزیم دیکھے، جانشن ڈس پانیشن کی سیر کی۔ شیمپس الیسیز میں تفریح کی اور تحفے کے قابل کتابیں خریدیں۔ راستے میں جگہ جگہ وہ پیدل یا ٹیکسی گھومتے ہوئے پتنگیں اڑاتے ہوئے بچوں کو دیکھنے اور ان سے باتیں کرنے کے لئے رک جاتی تھی۔

پیرس سے مس مور نے لندن کا سفر کیا اور پھر وہاں سے ساور سے (امبیل سائڈ) گئی، جہاں وہ پیٹر ریٹ کی شہرت یافتہ بیٹرکس پوٹر سے ملاقات کرنا چاہتی تھی۔ بیٹرکس وہاں کے ایک فارم میں اپنے شوہر ولیم ہیلس کے ساتھ قیام پذیر تھی۔

ایک تابناک صبح کو جب ہوائیں جنگلی گلاب اور تازہ کٹی ہوئی گھاس کی خوشبو سے معطر تھیں این نے کشتی سے اتر کر ساورے دیہات تک پہنچنے کے لئے پہاڑ کے طویل سلسلے پر چڑھنا شروع کیا۔ گھاس کے کھیت کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک قوی ہیکل عورت چوڑے کناروں کی پرانی سی ہیٹ لگائے اور ہاتھ میں کریدنی لئے ہوئے اس کی جانب بڑھی اور دریافت کیا "کیا آپ این کیرول مور ہیں؟" اس عورت کی نیلی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

بیٹرکس پوٹر کی عمر ۷۵ برس کے قریب تھی، لیکن اس کے رخسار نوجوان لڑکی کی طرح سرخ تھے۔ ابھی یہ دونوں کیسل کاٹج کی طرف جانے والی گلی میں ہی تھیں کہ این کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ بیٹرکس سے ایک طویل عرصے سے شناسا ہو۔

این صرف دوپہر کے کھانے پر مدعو تھی لیکن بیٹرکس نے اسے آمادہ کر لیا کہ وہ سہ پہر کو ڈیسی کریم کے ساتھ تازہ اسٹرابیری کا ذائقہ چکھے اور اس کے بعد رخصت ہو جائے، چنانچہ این رک گئی۔ چائے پیتے وقت بیٹرکس نے اس سے پوچھا "اگر تمھارے پاس شب خوابی کا لباس اور ٹوتھ برش ہو تو کیا تم تمام رات یہاں قیام نہیں کر سکتیں؟" جب این نے قیام کرنے میں کچھ ہچکچاہٹ ظاہر کی تو بیٹرکس نے مزید کہا "میں تمھارے نیو یارک کے بچوں کے متعلق اور کچھ سننا چاہتی ہوں۔"

این نے بیٹرکس اور اس کے شریف النفس شوہر کے پرخلوص اصرار کو محسوس کرتے ہوئے خوشی خوشی وہاں رات بھر قیام کرنا منظور کر لیا۔

کچھ دیر بعد بیٹرکس نے پہاڑ پر بنے ہوئے اپنے فارم ہاؤس کی کنجی این کے ہاتھ میں

دیتے ہوئے کہا، "اپنی خواہش اور مرضی کی چیزیں تلاش کرلو، پھر تم اپنی لائبریری کے بچوں کو بتا سکوگی کہ تم نے واقعی ٹام کٹنس ہاؤس دیکھا ہے۔"

بیٹرکس نے ٹام کٹنس ہاؤس میں جس اعتماد کے ساتھ این کو تنہا چلنے کی اجازت دی اسے این نے بے حد سراہا۔ وہاں اس نے وہ چائے کی پیالی دیکھی جس کے اندر سے چوہیا جھانک رہی تھی۔ اور کھپریل چھت کا بالائی منزل کا وہ کمرہ دیکھا جہاں ربی اور تبیتھا نے رولی پولی کا شور سنا تھا۔ دوسری صبح مس مور وہاں سے رخصت ہوئی، اور تحفہ کے طور پر بیٹرکس کی ہیال رنگوں سے بنی ہوئی ربیٹس کی تصویریں اپنے ہمراہ لیتی آئی۔ ان تصویروں میں ربیٹس کو اپنی برف گاڑی کے ساتھ کھیلتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ ان تصویروں کے علاوہ بیٹرکس نے 'دی رولی پولی پڈنگ' کا ایک نسخہ بھی پیش کیا تھا، جس پر اس نے اپنے آٹوگراف بھی دیئے تھے۔

مس مور کو رخصت کرتے ہوئے بیٹرکس نے کہا، "جب تمہاری خواہش ہو، ہل ٹاپ آسکتی ہو تمہیں ہمیشہ خوش آمدید کہا جائے گا۔"

سواری سے واپسی پر این نے لندن میں سومرس ہاؤس کی ایک قدیم گلی میں ڈیوڈ کوپر فیلڈ لائبریری دیکھی جو چارلس ڈکنس کے قدیم مکان میں قائم تھی۔ اس لائبریری میں اس نے ایسے ہی لڑکے اور لڑکیوں کا جائزہ لیا جو ہاتھ دھوکر انتہائی احتیاط سے کتابیں لیتے اور انھیں اپنی کرتیوں میں رکھ کر، خاموشی اور مستعدی سے اپنے مطالعے میں مصروف تھے۔ ایک شائستہ مزاج گائڈ نے این کو ایک الماری میں رکھی ہوئی وہ کتابیں دکھائیں جنھیں ڈکنس نے بچپن میں پڑھا تھا۔ مطالعہ کا انتہائی ذوق رکھنے والے ایک چودہ سالہ نوجوان نے مس مور کو بتایا "میں کتابیں حاصل کرنے کے لئے نقدی جمع کرتا ہوں۔ میں مٹھائیوں کے بغیر رہ سکتا ہوں، لیکن کتابوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

پھر این مور نیویارک واپس پہنچ کر اپنے فرائض کی انجام دہی میں لگ گئی۔ اب اُسے نہ صرف تبصرہ نگاری کا، بلکہ بچوں کی کتابوں کے انتخاب پر تنقیدی نقطۂ نظر سے ایسی کتابیں لکھنے کا موقع ملا جن سے بالغ نظر اشخاص مستفید ہو سکتے تھے۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب کا نام اس نے "بچپن کی راہیں" رکھا تھا۔

ہر ملک کے بچوں کے لئے اس نے ایک کتاب " نکولاس اے میٹن کرسمس اسٹوری" لکھی
اس کتاب میں ایک ایسے ڈچ لڑکے کی کہانی بیان کی گئی تھی جو سیاحت کے لئے نیویارک آتا ہے۔
کہانی میں تفریحات، تفریحات، رحم دلی اور ہنسی مذاق کی تمام ایسی چیزیں موجود تھیں جنھیں بچے بہت
پسند کرتے ہیں۔

این کا پسندیدہ موضوع یہ تھا کہ بچے مطالعے کے ذریعے صاحب کردار بنتے ہیں۔ جب گرٹ
ریوڈ ریڈی، انگلش کنال میں تیراکی کا مقابلہ جیت کر آئی اور نیویارک کے عوام نے اس کا استقبال
کیا تو این نے اسے یاد دلایا کہ وہ بچپن میں مطالعہ کے لئے انتہائی شوقین تھی۔

گرٹ ریوڈ نے مس مور یا ان کے ایک اسسٹنٹ سے ایک سے زائد بار اس بارے میں
پوچھا تھا کہ، "کیا واقعی وہ مطالعے کی انتہائی شوقین تھی؟" اس نے سوچا کہ غالباً اس نے کچھ
ایسی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا جن سے اسے ثابت قدمی اور حوصلہ مندی کا سبق حاصل ہوا تھا۔

چلڈرنس لائبریری کے لئے مس مور نے بچوں کے والدین، اساتذہ اور بڑی عمر کے دیگر
اشخاص کو صلائے عام دیا کہ وہ بچوں کو کہانیاں سنائیں، پوسٹر بنائیں یا ان تصویروں کو نصب
کرانے کی نگرانی کا کام کرسکیں جن میں مشہور آرٹسٹوں کی خاص خاص تصویروں سے لے کر
ناپختہ تصویریں تک شامل ہوتی تھیں اور بچوں کی بنائی ہوئی ناپختہ اور نامکمل تصویریں
تماشائیوں کی دلچسپی کا باعث ہوسکیں۔ جب کبھی ممکن ہوتا وہ لائبریری میں مشہور ادیبوں یا
مصوروں کو بھی مدعو کرتی تھی۔ ایسے نامور فن کاروں میں لارڈ ڈن سینی اور والٹر ڈی لا میئر
لائبریری میں آچکے تھے۔

ایک بار جب چھریرے بدن کا طویل قامت انگریز آرٹسٹ، آرتھر ریکھیم، چلڈرنس
روم دیکھنے آیا تو این کو انتہائی مسرت ہوئی۔ این 'پیٹر پین' کے شہرت یافتہ اس مصور کی بہت
عرصے سے مداح تھی۔ اس نے 'پیٹر پین' میں جن بدشکل روحوں اور عجیب و غریب قسم کے
بل دار درختوں کی تصویریں بنائی تھیں، انھیں این نے بے حد پسند کیا تھا۔ ایک بار کرسمس کے
موقع پر این اور ریکھیم بحری جہاز سے لندن جانے والے تھے۔ جہاز پر سوار ہونے سے
پہلے انھیں ملاقات کے لئے کچھ وقت میسر آگیا، چنانچہ ان دونوں نے پروگرام بنا کر وہ شام

ایک ساتھ گزاری۔ بریوٹ گرل میں ایک ساتھ کھانا کھایا اور تمام شہر کی سیر کی۔ این کا خیال تھا کہ بیکیم جب اپنے برش سے پرستان کا نظارہ پیش کرتا ہے تو اس میں کہیں اناڑی پن نہیں جھلکتا۔

جو فن کار، مصنف اور ناشر کتابوں کے موضوع پر گفتگو کے لئے این کے پاس آتے تھے وہ ان سے بڑے خلوص کے ساتھ پیش آتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ بچوں کو اچھی تصانیف بالتصویر ملنی چاہئیں۔ لیکن جو لوگ اس کے پاس آتے تھے، ان میں اتنے اچھی اور خوبصورت کتابوں کے لئے ایک ناقابل شکست احساس پیدا کر دیا تھا۔ اس کی میز پر دنیا کے تمام ممالک سے آئے ہوئے خطوط کا انبار رہتا تھا۔

جب کبھی لڑکیاں مس مور سے لائبریرین کا پیشہ اختیار کرنے کے متعلق مشورہ کرتیں تو وہ بے لاگ طریقے سے اعتراف کرتے ہوئے کہتی تھی کہ اس کام میں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے اور تنخواہ بہت کم ملتی ہے لیکن اس کام کا حقیقی اجر ان چیزوں سے بالاتر ہے۔ لڑکیاں پورے انہماک اور تحقیقی ذہن کے ساتھ اس کام کے فرائض پورے کر سکتی ہیں اور انھیں اس کام میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ "اگر آپ بچوں اور کتابوں سے محبت کرتی ہیں، تو پھر مستقبل میں اس سے زیادہ اور کیا اجر آپ کو مل سکتا ہے؟" وہ سوال کرنے والی لڑکیوں سے پوچھا کرتی تھی۔

اپنی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کے باوجود مس مور اپنے اسٹاف سے قریبی رابطہ قائم رکھے ہوئے تھی۔ اسٹاف کا کوئی ممبر کسی کام سے غیر ملکی ساحل کی جانب روانہ ہو رہا ہو یا کسی کو کوئی انعام حاصل ہو، یا کسی نے کوئی ارتقائی منزل سر کی ہو، غرض ہر موقع پر این اپنے اسٹاف کی مسرتوں میں برابر شریک رہتی تھی۔ وہ اپنی لائبریرینوں کے خطوں سے مل کر بھی انتہائی مسرت کا اظہار کرتی تھی۔ این کے جو اسسٹنٹ سنٹرل لائبریری سے کہیں اور منتقل ہو جاتے تھے انھیں برسوں بعد بھی این کی جانب سے اچانک کوئی خط یا تحفہ موصول ہو جاتا تھا۔

اکتوبر ۱۹۳۱ء میں نیویارک لائبریری میں مس مور کی سلور جوبلی منائی گئی۔

مصوروں، لائبریرین، ناشروں اور مصنفوں نے مل کر این کو ایک غیر متوقع دعوت دی، جس میں کٹھ پتلیوں کا ناچ ہوا۔ اور ربیکا سلویو نے کہانی سنائی۔ اس تقریب میں این نے قدیم بحری قزاقوں کے جہاز کی شکل کا سالگرہ کا کیک ایک چھرے سے کاٹا۔ وانشگٹن اوردن کی مسند پر بیٹھی ہوئی مس این کیرول مور کو ایک اسسٹنٹ نے سینگ کا ایک گلدستہ پیش کیا، جس میں وہ تمام خطوط اور تار لگائے گئے تھے جو اس کے مداحوں اور رفیقوں نے ملک کے گوشے گوشے سے ارسال کئے تھے۔

ایک موقع پر مس مور کی کہانی "نکولاس" کے ایک مداح نے اسے لکڑی میں کھدا ہوا ایک ڈچ لڑکے کا ڈھانچہ تحفے کے طور پر پیش کیا۔ نکولاس کے کردار "نکر بوکر" کے اس مجسمے کو این ہمیشہ اپنے پاس رکھا کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کھلونے کے سبب وہ بچوں کے ساتھ اور بھی زیادہ ہم قدم ہو جائے گی۔ بچے اکثر اس سے پوچھ بیٹھتے "کیا آج آپ کے پاس نکولاس ہے؟"

ایک روز ایک لڑکی نے اعتراض کیا "مگر یہ تو صرف لکڑی کا ایک ٹکڑا ہے آپ اس کی کہانی لکھ کر اسے اصلی نکولاس کیوں نہیں بنا دیتیں!"

لڑکی کے اس اعتراض کے جواب میں این نے نکولاس کے فرانس کے سفر کی کہانی "نکولاس اور سنہری ہنس" تحریر کی۔

مس مور بالغوں سے بھی بے تکلفی سے پیش آتی تھی۔ لائبریری کی ایک کانفرنس میں اس نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ جو مضامین کانفرنس میں پڑھے گئے، وہ اس قدر سنجیدہ تھے کہ اس کے منتخب شدہ موضوع "بے ترتیب لوگ، اس سنجیدگی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ "وہ تو کھلبلی میں سے بہہ گئے، بس، یہی انھوں نے اثر چھوڑا......"

لیکن وہ انتہائی سنجیدہ بھی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھی اس کے مزاج کی دیانت داری اور شدت سے واقف ہو جانے کے بعد خود بھی کتابوں یا بچوں کی خدمات میں اوسط درجے کو قبول نہیں کر پاتے۔

مس مور تمام حلقوں میں لکچرر کے طور پر بھی مشہور ہو چکی تھی۔ اکثر و بیشتر اس نے شہریوں کے حلقے میں، اساتذہ اور سماجی اداروں میں تقریریں کی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی لائبریرین کی حیثیت سے بھی وہ انتہائی مقبول تھی۔ جب کبھی اسے کسی اعلیٰ منصب کی پیشکش کی گئی، اس نے مزاحمت کی۔ ایسے موقعوں پر وہ انکسار کے ساتھ کہہ دیتی کہ "مجھے ہمیشہ بچوں اور کتابوں سے عشق رہا ہے۔ اگر ان دونوں چیزوں کو یکجا کرنے کی صلاحیت مجھ میں پیدا ہو جائے، تو میں خود کو انتہائی خوش نصیب سمجھوں گی۔ بس یہی میری خوشی ہے۔"

تاہم جب ۱۹۳۲ء میں اس کی نمایاں خدمات پر پریٹ انسٹی ٹیوٹ کے منتظمین نے اسے اعزازی سند عطا کی تو اسے بے حد خوشی ہوئی۔ اس کے بعد بچوں کی لائبریری کے قدیم کمرے کو اعلیٰ تحقیقات کے شعبے میں منتقل کر دیا گیا، اور اس کمرے کا نام 'این کیرول مور کا کمرہ' ہی رکھ دیا گیا۔

۱۹۳۶ء میں اس نے ' ہارن بک ' کے لئے " تین بے وقوفوں کا روزنامچہ " کا سلسلہ لکھنا شروع کیا۔ اس قسط وار کہانی میں اس کی تشخیصات اس قدر دانشمندانہ تھیں، جتنا ایک مقطع ۔ اس کہانی نے بچوں کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والے مزید صاحب مذاق اشخاص پیدا کر دیئے۔

اگلے سال مس مور نے کنگ جارج ششم کی رسم تاج پوشی میں شرکت اور بیٹرکس پوٹر سے دوبارہ ملاقات کے لئے انگلستان کا سفر کیا۔ بیٹرکس پوٹر سے اس کی خط و کتابت برسوں سے جاری تھی۔ اس بار ہل ٹاپ فارم میں اس نے تقریباً ایک ہفتہ تک قیام کیا۔ بیٹرکس اور این لالے کی سلسلہ وار کیاریوں اور سفید ہاتھورن کی جھاڑیوں کی باڑوں میں گھوڑے سواری کرتی رہیں اور دونوں نے آرٹ، کتابوں اور بچوں کے متعلق خوب خوب گفتگو کی

اگلے سال ماہ جون میں، بیتن کی یونیورسٹی نے بیتن کو ڈاکٹر آف ہیومینیٹیز کی ڈگری پیش کی۔ اس موقع پر بیتن کی خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا، "آپ کا کام ہے آپ کے وطن مالوف کی یونیورسٹی کو انتہائی فخر ہے"

اپنی سترویں سالگرہ کے کچھ عرصہ بعد مس مور ریٹائر ہو گئی۔ اب بچوں کو اس کی رفاقت میسر نہیں رہی تھی۔ یہ تو خیر اسے لائبریری کا انتہائی اہم تکمیلی جزو سمجھتے تھے، جتنا نعمتِ ایونیو کے دروازے پر دبکے بیٹھے ہوئے شیروں کے مجسمے، جو نعمتِ ایونیو کی نگہبانی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لائبریری کے بچوں میں اس کو ایک طلسماتی یا روحانی عامل کی سی حیثیت حاصل تھی۔

لیکن خلوت نشینی کا یہ عرصہ مس مور اور اس کے متعلقین کے لئے ایک خوش گوار تجربہ ثابت ہوا۔ اس نے فراغت کے سبب بہترین ڈرامے اور نمائشیں دیکھیں، لائبریریوں کی سیاحت کی حوصلہ کر دیئے، دوستوں کی صحبت کا لطف اٹھایا، اور خاص خاص موقعوں پر چلڈرنس روم میں دوبارہ مدعو کی گئی۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں بچوں کی کتابوں کی اشاعت میں تخفیف سے متفکر ہو کر، اس نے یکم مئی ۱۹۴۳ء کے لائبریری جرنل میں لکھا، "ہمیں ناشرین کو اس ضرورت کا احساس دلانا چاہیئے کہ وہ جنگ کے حالات میں جس حد تک ممکن ہو خوش گوار طریقے سے بچوں کو کتابوں کی زندگی بخش غذ منوانتر فراہم کرتے رہیں"۔

تین برس بعد اسی کے ناشر نے اس کی کتاب، اے ہنیری آف کیٹ گرین ادے شائع کی، جس میں ان مصوروں کا تاثراتی جائزہ لیا گیا تھا جو ہیئت اور رنگوں کے ساتھ صداقت اور حسن کا بھی بھرپور احساس رکھتے تھے۔

اپنی ۸۰ سالہ سالگرہ کے موقع پر مس مور بہت کمزور نظر آ رہی تھی، لیکن اس کا ذہن اب بھی مشتعلہ تھا۔ اور رفتار میں چستی موجود تھی۔ اس نے نہ کبھی اپنے ارتقا کی رفتار کو مدھم ہونے دیا تھا اور نہ کبھی تخفیق ذملائق سے خود کو باز رکھا تھا۔ اس سال گرہ کے موقع پر بھی اسے اوسلو، میکسیکو سٹی، پیرس اور تمام دنیا سے بیٹیاں

تحائف، خطوط اور نظم و نثر کی صورت میں خراج عقیدت موصول ہوئے تھے۔

اس کے بعد بھی اس کی پذیرائی جاری رہی۔ ۳ر جون ۱۹۵۵ء کو پریٹ انسٹی ٹیوٹ نے اسے ڈائرکٹر آف لیٹرس کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ ۱۹۶۰ء میں اسٹیٹ ایگری کلچرل کالج کے باہر ایک ایسا چلڈرن لائبریری قائم کی گئی، جس کی کھڑکیوں سے وساچ کی پہاڑیوں کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ اس لائبریری کو مس این کیرول مور کے نام سے منسوب کیا گیا۔

جب روسی اسپوتنک نے تمام دنیا کو سائنس کی جانب متوجہ کیا تو مس مور نے لوگوں کو احساس دلایا کہ خواب، تصورات اور طلسمات بھی بچوں کے ورثے کا اہم ترین حصہ ہوتے ہیں۔

مس مور کے اثرات انتہائی عمیق و بسیط ہیں۔ اس نے نیویارک سینٹرل لائبریری میں بچوں کے کمرے کو ایسی جگہ بنا دیا، جس نے بچوں کے اخیال اور تصورات کی نشو و نما کی۔ اس کی کوششوں سے کم از کم جزوی طور پر تمام ملک کی لائبریریوں میں داستان گویوں کی ایک نئی نسل وجود میں آ گئی۔ نئی نسل کے یہ داستان گو، جھوٹے موٹے بچہ بن کر عقل و دانش، حیرت و استعجاب اور کتابوں سے حاصل ہونے والے حسن کو ان نوخیزوں تک منتقل کرتے ہیں جن کی آنکھیں ستاروں کی طرح جگمگاتی ہیں۔ اور خود بھی ان کے احساس میں شریک رہتے ہیں۔ این کیرول مور کو بچپن میں اس کے باپ نے جو نصیحت کی تھی، اس نے اسے گرہ میں باندھ لیا تھا، اور کتابوں اور بچوں کو غیر معمولی اور خوش گوار طریقے سے یک جا کرنے کے کام میں اپنے دل و دماغ، دونوں کو پوری طرح وقف کر دیا تھا۔

(۱۳)

التھیا گبسن

ہارلیم کی الہڑ لڑکی سے ٹینس کی ملکہ تک

التھیا گبسن، ابتدائی عمر میں نیویارک کی ایک تنگ و تاریک مکانوں کی گسی نواحی بستی، "ہارلیم" میں رہتی تھی۔ اس بستی میں رہتے ہوئے وہ تقریب قریب آوارہ ہوگئی تھی، لیکن ٹینس میں اس کی دلچسپی اور صلاحیتوں نے اس پر ایک نئی دنیا کے دروازے وا کر دیئے۔ ٹینس کے میدان میں اور اس سے باہر امتیاز و اعزاز حاصل کرنے کی شدید لگن کے باعث اس نے آخر میں ٹینس کی چیمپئن کا رتبہ حاصل کر لیا۔ لیکن اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے التھیا کو غربت، جانبداری اور ذاتی مشکلات سے نبرد آزما ہونا پڑا تھا۔

التھیا ۲۵ اگست ۱۹۲۷ء کو جنوبی کیرولینا کے ایک مقام "سلور" میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا باپ گبسن کپاس کے ایک کھیت میں کپاس توڑنے کا کام کرتا تھا۔ ایک بار جب متواتر تین برس تک موسم کی خرابی کے سبب فصلیں تباہ ہوتی رہیں تو گبسن اپنے خاندان کو لے کر ہارلیم چلا آیا، جہاں اسے ایک موٹر خانے میں ہرکارے کے طور پر ملازم رکھ لیا گیا۔ شروع میں گبسن کا خاندان التھیا کی خالہ کے یہاں قیام پذیر رہا، لیکن بعد میں انہوں نے ہارلیم کی ۱۴۳ ویں گلی میں ایک کھولی

کرایہ پر لے لی ۔ اس چھوٹی سی کھولی میں انتھیا کے والدین، اس کی بہنیں، ملی، ایبی اور للین" اور اس کا بھائی ڈینیل، سب کے سب اسی مختصر سی جگہ میں رہتے تھے۔ انتھیا کو اس ماحول میں گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ باپ کی آمدنی اس قدر قلیل تھی کہ خاندان کا گزارہ مشکل سے چلتا تھا۔

گرمیوں کے دنوں میں انتھیا اور دوسرے بچے خالی ٹوکریاں لے کر برونیکس ٹرمینل مارکیٹ کی جانب چلے جاتے۔ اس مارکیٹ کے کھوک فروش کھانے پینے کی گلی سڑی چیزیں چھانٹ کر ایک کونے میں ڈھیر کر دیتے تھے۔ یہ نوعمر لڑکے لڑکیاں اس ڈھیر پر جھپٹے مار مار کر سوکھے ہوئے سلاد، پکی ہوئی مٹر اور نچڑے ہوئے ٹماٹر چن چن کر اپنی ٹوکریوں میں بھر لیتے اور یہ لوٹ کا مال اپنے اپنے گھر کو لے جاتے تھے۔

گبسن کا خاندان جس بلاک میں رہتا تھا، اس کا نام "پولیس اتھلیٹک لیگ پلے اسٹریٹ" تھا۔ دن کے وقت اس بلاک کے قریب سے سواریوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ انتھیا اور بلاک کے دوسرے بچے آپس میں مل کر اسٹک بال، جیس بال اور پیڈل ٹینس کھیلا کرتے تھے گرمیوں کے شدید موسم میں جب زمین تپ جاتی تھی۔ اور ان کے جوتوں کے تلوے سلگنے لگتے تھے، تب بھی ان کے یہ کھیل یونہی جاری رہتے تھے۔ بعد میں انہوں نے اپنے کھیل کے لیے ایک حصے میں نشان لگا کر نصف سائز کا ایک ٹینس کا میدان سا بنا لیا تھا۔ اس حصہ میں ٹینس کھیلتے ہوئے ان کے قواعد تو ٹینس کے قواعد کے مطابق ہی ہوتے تھے، لیکن ٹینس کا جو سامان ان کے پاس تھا، وہ اسفنج، ربڑ کی ایک گیند اور پنگ پانگ کے بیٹوں سے ملتے جلتے بھونڈے بلوں پر مشتمل تھا۔ تیز طرار انتھیا نے دھڑاکے دار ضرب لگانے کا طریقہ سیکھ لیا تھا۔ جس سے وہ اپنے بلاک کی چیمپین بن گئی تھی۔ بعد ازاں اس نے ہارلیم کی دوسری گلیوں کے کھلاڑیوں کے مقابلے میں ۱۴۳ ویں گلی کے نمائندے کی حیثیت سے میچ بھی جیتے تھے۔

کبھی کبھی انتھیا اور اس کے ہمجولی پیڈل ٹینس چھوڑ کر کسی خالی جگہ پر جا، نکس کے

بے ڈھنگی چال کھڑے ہوتے تھے ۔ ایسے موقعوں پر وہ اے اینڈ پی مارکیٹ کے عقب میں کسی پٹڑی پر قبضہ جما لیتے اور پھلوں کی ٹوٹی ہوئی ٹوکریوں کو جلا کر شکر قندیاں بھونا کرتے تھے ۔ جنہیں وہ سکیٹر پکارتے تھے ۔

ہاریم میں آوارہ لڑکوں کی ٹولیاں سرگشت کرتی پھرتی تھیں ۔ لیکن التھیا نہ صرف جی دار لڑکیوں کا ، بلکہ جی دار لڑکوں کا بھی مقابلہ کرتی تھی ۔ ایک بار جب اس نے چھرے بازوں کے ایک سردار کو اپنے چچا جونی پر حملہ آور ہوتے دیکھا ، تو وہ چچا کو بچانے کے لئے دوڑی اور اس چھرے باز کا مقابلہ کیا ۔

مسٹر گبسن نے التھیا کو اپنے بچاؤ کے لئے مکہ بازی سکھانی شروع کی تھی ۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ وہ انتہائی پھرتیلی اور طاقت ور ہے تو انہوں نے اسے مکہ باز بنانے کا فیصلہ کر لیا ۔ لیکن التھیا کو پیڈل ٹینس سے زیادہ دلچسپی تھی ۔ گرمیوں کے موسم میں وہ جب بارہ برس کی تھی ، اس نے پارک کے مقابلے میں پیڈل ٹینس ٹرافی بھی جیت لی تھی ۔

جونیئر اسکول میں داخل ہونے کے بعد التھیا نے گیند کے کھیلوں کے علاوہ باقی تمام شوق ختم کر دیئے تھے ۔ اسکول میں اس پر سخت پابندیاں عاید تھیں ۔ لیکن یہاں کا جمنازیم گھر التھیا کی انتہائی دلچسپی کا باعث تھا ۔ یہ جمنازیم گھر بیشتر وقت کھلا رہتا تھا ۔ یہاں التھیا بہت دنوں تک اپنی ایک سہیلی الما اروِنگ کے ساتھ باسکٹ بال کھیلتی رہی ۔ کھیلتے کھیلتے دونوں سہیلیاں رات کے کھانے کے لئے کسی سستے سے ہوٹل میں چلی جاتیں ۔ جہاں یہ چاولوں کی ایک پلیٹ اور کچھ ترکاریوں سے یا سوڈے سے پیٹ بھرا کرتی تھیں ۔ ان دنوں سوڈے کا ایک پوتا ایک نکل کا ملا کرتا تھا ۔ بشرطیکہ خریدار اپنا برتن لاتے ۔

جونیئر ہائی اسکول سے ۱۹۴۱ء میں امتحان پاس کرنے کے لئے التھیا نے خوب دل لگا کر پڑھائی کی ۔ اگلے برس گرمیوں کے موسم میں ایک روز وہ پیڈل ٹینس کھیل رہی تھی کہ اس کی نظر بڈی ناکر پر پڑی جو اس کا کھیل دیکھ رہا تھا ۔ بڈی واکر ایک موسیقار تھا ، اور شہر میں گرمیوں کے کھیلوں کے لیڈر کے فرائض بھی انجام دیتا تھا ۔

" تمہارے قدم ہلکے ہیں اور تم میں بے حد قوت موجود ہے ۔" اس نے التھیا سے کہا ،

جو اس وقت چودہ برس کی ایک دراز قد لڑکی تھی "میں سوچ رہا ہوں کہ تم یا قاعدہ ٹینس کیسا اچھا کھیلوگی!"

"ریکیٹ میرے پاس نہیں ہے، اس لئے میں نہیں کہہ سکتی ہوں کہ ٹینس کیسا کھیلتی ہوں" التھیا نے سوالیہ انداز میں کہا

بڈری نے اپنے ذاتی فنڈ میں سے اسے ایک پرانا ریکیٹ خرید دیا۔ اس کے بعد التھیا نے ہینڈ بال کے ایک میدان کی دیوار پر ہیٹنگ کی مشق شروع کی۔ اس مشق کے باعث اسے کوسموپولیٹن کلب کے کھلاڑی فریڈ جانسن سے چند مقابلوں کا موقع مل گیا التھیا اتنا عمدہ کھیلی کہ کلب کے ممبران نے اس کی تربیت کے لیے چندہ جمع کر دیا۔ مسٹر جانسن نے اسے زناٹے دار ہاتھ اور ہاتھ کو آگے پیچھے ہٹا کر ضرب لگانے کے طریقے سکھائے۔ اس نے التھیا کو سمجھایا کہ جب ٹینس کھیلنے کے میدان میں اس کی جانب کوئی گیند جھکر کھا کر گر جائے تو اسے بے ضابطگی۔ اس پر جھپٹنا نہیں چاہیے، بلکہ گیند کو اس کے کھلاڑی کو واپس دے دینا چاہیے۔ اور اسے میچ ہار جانے کے بعد جیتنے والے فریق سے لڑنا نہیں چاہیے۔ رفتہ رفتہ اس کا کھیل صاف ستھرا ہوتا گیا اور اسے ٹینس کے قواعد کا احساس ہونے لگا۔ پھر ایک صاحب حیثیت خاتون، مسز رھوڈا اسمتھ نے التھیا میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ مسز اسمتھ کو اندازہ ہوا کہ التھیا خود کو ایک مہذب لڑکی کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے التھیا کو ٹینس کا لباس فراہم کر دیا۔

اسی سال خزاں کے موسم میں التھیا نیویارک کے ووکیشنل ہائی اسکول میں داخل ہو گئی۔ اسے چونکہ سلائی کا شوق تھا۔ اس لئے شروع میں اس کی حاضریاں باقاعدہ رہیں، لیکن بعد میں اسے اس کام سے نفرت سی ہو گئی اور وہ کلاس سے متواتر غیر حاضر رہنے لگی۔ غیر حاضری کے سبب اسکول کے منتظمین نے اسے سخت تنبیہ کی، اور اس کے باپ نے اسے مارا۔ باپ کی مار سے ناراض ہو کر التھیا نے گھر سے دور رہنے اور اسکول نہ جانے کا فیصلہ کر لیا، اور کسی دوست کو ساتھ لے کر سینما گھروں اور اسکیٹنگ

کے احاطوں میں آوارہ گردی کرنے لگی۔ بعض اوقات وہ تمام تمام رات زمین دوز راستوں میں پڑی رہی۔ لیکن اس نے کبھی شراب، منشیات، جنسی یا جرائم میں گھری رہنے والی ٹولیوں میں شرکت نہیں کی۔

ایک بار جب انتھیا عام دنوں کی نسبت زیادہ عرصہ تک گھر سے باہر تھی، وہ بچوں کو ظلم و ستم سے نجات دلانے والی انجمن میں پناہ حاصل کرنے کے لیے پہونچ گئی۔

اس انجمن کی منتظم خاتون نے اس سے پوچھا، "کیا تمہارا گھر نہیں ہے؟"

"جی ہاں، ہے" انتھیا نے اقرار کیا، لیکن اس کا گھر ایک بہت تنگ اور بے رطوبت تھا۔ جہاں لوگ اس پر غراتے تھے۔ اسے اس کا بھی شدید احساس تھا کہ وہ سزا کی مستحق تھی، لیکن وہ انتہائی دکھ کے ساتھ یہ بھی محسوس کرتی تھی کہ باپ کا اس کو مارنا نا واجب تھا۔

اس کے حالات کی تفتیش کرنے کے بعد انجمن نے اسے رہنے کی اجازت دیدی۔ گھر کے مقابلے میں یہاں کا کھانا اور بستر پر بچھی ہوئی سفید چادر اسے بڑے ٹھاٹ باٹ کی محسوس ہوئیں لیکن انجمن کی ایک دوسری لڑکی سے جھگڑا کرنے کے نتیجے میں انتھیا کو کچھ عرصہ کے لئے الگ ایک ہتھ خانے کے چھوٹے سے کمرے میں رکھا گیا۔ اس کمرے میں اسے بچھانے کے لئے ایک چٹائی اور قلیل سی خوراک ملا کرتی تھی۔ ایک دن جب اپنے عزیزوں کی یاد اسے بری طرح ستا رہی تھی، اس نے سوسائٹی کی منتظم سے دریافت کیا۔ "کیا میں گھر جا سکتی ہوں؟"

"ہاں، لیکن تمہیں برائیوں سے دور رہنا پڑے گا" ایک افسر نے اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا، "ورنہ تمہیں لڑکیوں کی اصلاح کے اسکول میں بھیج دیا جائے گا"

گھر آجانے کے بعد اس نے ملازمت کرنے کے لئے اجازت حاصل کرنے کی درخواست دیدی، لیکن ابھی وہ اسقدر کم عمر تھی کہ مزدوری کرنے کے لئے اسے اجازت صرف اس شرط پر مل سکتی تھی کہ وہ شبینہ اسکول میں داخلہ بھی لے۔ آخر اسے نیویارک اسکول آف سوشل ورک میں کام مل گیا۔ اس کے ذمے ڈاک کی چھنٹائی، ڈاک لو، فتروں میں تقسیم کرنے اور باہر بھیجنے کا کام تھا۔ کام مل جانے کے بعد اسے زندگی میں پہلی بار اپنے وجود

کا احساس ہوا۔ اسے اس بات کی انتہائی خوشی تھی کہ اب وہ گھر کے اخراجات کا بار اٹھانے کے قابل ہو گئی ہے۔ وہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ اپنے گھر دے دیتی۔ اور کچھ رقم اپنی ضرورت کی چیزوں کے لئے بچا لیتی تھی۔

انتھیا کو ملازمت پر مامور ہوئے ابھی چھ ہفتے ہی گزرے تھے کہ ایک جمعہ کو دوپہر کے وقت اس کے بہت سے دوستوں نے اسے راہ میں روک کر کہا، "ہم پیرا ماؤنٹ میں شو دیکھنے جا رہے ہیں، تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔"

پیر کے روز انتھیا کے سپروائزر نے پوچھا، "جمعہ کے روز تم کہاں تھیں؟"

انتھیا کے جی میں آیا کہ وہ بیماری کا بہانہ کر دے لیکن اس نے سچی بات بیان کر دی۔ "مجھے افسوس ہے۔" اس نے معافی مانگتے ہوئے کہا "میں آئندہ ایسا نہیں کروں گی۔"

سپروائزر نے اس کی راست گوئی کو سراہا لیکن ساتھ ہی اسے یہ کہتے ہوئے کہ "ہم ایسی لڑکی کو نہیں رکھ سکتے جو ایسی حماقتوں میں اپنے اہم فرائض سے غافل ہو جاتی ہو۔" اسے ملازمت سے برطرف کر دیا۔

نو دکو بے بس اور غیر یقینی مراحل میں محسوس کرتے ہوئے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی عمارت سے باہر آ گئی۔ وہ یہ سوچ کر ایک لمحہ کو پژمردہ ہو گئی کہ اسے سچ بولنے کی سزا دی گئی ہے۔ لیکن بعد میں اس نے تجزیہ کیا کہ دراصل وہ اعتماد کے اہم ترین معیار پر پوری نہیں اتری تھی لیکن یہ احساس بھی اسے ایک بے لطف سی راحت سے زیادہ نہ تھا، کیوں کہ اسے اب ایسی ہی اطمینان بخش ملازمت تلاش کرنے کی فکر لاحق تھی۔ تعلیم و تربیت کی کمی ہر موڑ پر اس کے خلاف پڑتی تھی۔

انتھیا پر اضطراب غالب تھا، وہ معاملات کو صحیح طریقے سے سمجھ نہیں پاتی تھی پینی ایبر کی ملازمت سے ہاتھ دھونے کے بعد وہ ہوٹل میں ویٹریس بن گئی، لیکن یہ ملازمت بھی جلد ہی جاتی رہی۔ جتنی سرعت سے اسے کوئی کام ملتا تقریباً اتنی ہی سرعت سے وہ برطرف بھی کر دی جاتی تھی۔ ہوٹل کی ملازمت ترک کرنے کے بعد اس نے سامان اوپر اٹھانے والی مشین پر کام کیا، پھر ایک کپڑوں کی فیکٹری میں، اور اس کے بعد ایک ڈپارٹمنٹ اسٹور ایک بجلی

فیکٹری میں کام کیا ۔ ایک قصاب کی دکان میں فرشے صاف کئے ۔ ان ملازمتوں کے درمیانی
عرصے میں وہ سڑکوں پر اس قدر آوارہ گردی کرتی رہی کہ ویلفیئر ڈپارٹمنٹ کی نظروں میں
آگئی ۔ چنانچہ اس ڈپارٹمنٹ کی دو عورتوں نے اس کے لیے کم بھیڑ بھاڑ والے مکان میں رہنے
کا انتظام کر دیا تاکہ وہ بے کاری کے دنوں میں وہاں قیام کر سکے ۔ بیکاری کا الاؤنس لینے
کے لیے اسے ہر ہفتہ ویلفیئر ڈپارٹمنٹ جانا پڑتا تھا ۔

بظاہر گستاخ اور سرکش نظر آنے والی التھیا، اب شرمیلی اور اندر سے کھوکھلی ہو گئی تھی
وہ عزت کی زندگی گزارنے کی آرزو مند تھی ۔ اسے اب بھی گیند کے کھیلوں اور نغمے سے حقیقی دلچسپی
تھی ۔ جب تک اسے احساس رہا، وہ موسیقار بننے کی خواہش کرتی رہی لیکن موسیقی کی تعلیم
حاصل کرنے کے لئے اس کے پاس سرمایہ کہاں تھا ؟ اور گیندوں کو ریکٹ سے ضربیں لگا کر
وہ اپنی روزی کہاں حاصل کر سکتی تھی ۔!

۱۹۴۲ء کی گرمیوں میں فریڈ جانسن نے التھیا کو نیو یارک اسٹیٹ اوپن چیمپین شپ
کے لیے مشق کرانا شروع کر دی ۔ یہ میچ تقریباً تمام نیگرو امریکن ٹینس ایسوسی ایشنوں کی جانب
سے کوسموپولیٹن کلب میں، منعقد ہوا کرتے تھے ۔ یہاں اسے لڑکیوں کے ایک نفری کھیل میں
کامیابی حاصل ہوئی ۔ اور اس نے چیمپئن شپ جیت لی ۔ التھیا کے کھیل سے متاثر ہونے والے
نوجوانوں نے اسے ٹینس جاری رکھنے کی ترغیب دلائی ۔ لیکن دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی ۔
اور جنگ نے ہر شخص کو ٹینس کے میچوں سے زیادہ اہم کاموں کی جانب متوجہ کر دیا تھا ۔

التھیا کی اٹھارویں سالگرہ کی تاریخ اور دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کی تاریخیں تقریباً
ایک ہی تھیں ۔ اس سالگرہ کے کچھ ہی عرصہ بعد اسے سماجی کارکنوں کی نگران زیبرٹس کی
ملازمت مل گئی ۔ اور اس نے اپنے نئے دوست بنائے ۔ ان نئے دوستوں میں ایڈی
اور سوگر رے روبنسن شامل تھے ۔ بہت سے لوگوں کی رائے تھی کہ سوگر رے تماشائی ذہنیت
کا آدمی تھا ۔ جو سرکاروں اور گہرے رنگ کی کیڈلاک کاروں پر روپیہ پانی کی طرح بہاتا
تھا ۔ لیکن التھیا تو سوگر رے کو جانتی تھی جو اپنی سرشت اور کوشش سے دوستوں کا دل
جیت لیا کرتا تھا ۔ رے نے التھیا کو ایک سیکسو فون پیش کر کے اس کے موسیقی کے ذوق کو

جلاوطنی

۱۹۴۶ء میں التھیا کو ولبرفورس کالج، اوہیو کے میچوں میں حصہ لینے کے لیے سفر کے اخراجات اے، ٹی، اے نے پیش کئے۔ التھیا نے ان میچوں میں بہترین ربط و ضبط اور گیند کے بھرپور احساس کا مظاہرہ کیا لیکن فائنل میں وہ ہار گئی۔ اے، ٹی، اے کا ایک نمائندہ میچ دیکھنے کے لیے نیو یارک سے آیا تھا، اس نے التھیا کے متعلق اپنی رپورٹ میں تحریر کیا کہ اسے اے ٹی اے کے مزید تعاون کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ التھیا اپنی اس شکست پر بے حد دل گرفتہ تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس شکست سے اس کے ٹینس کے ذوق کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔

لیکن اس کا کھیل اتنا عمدہ تھا کہ ورزشی کھیلوں سے دلچسپی رکھنے والے دو نیگرو معالج اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ معالج تھے ولمنگٹن (شمالی کیرولینا) کے ڈاکٹر ہیوبرٹ اے۔ ریٹن اور لینچ برگ (ورجینیا) کے ڈاکٹر رابرٹ جانسن۔ جب ان دو اشخاص نے التھیا سے گفتگو کی تو بات چیت کے دوران میں اس کی تعلیمی کمی کے متعلق تشویش ظاہر کی۔ التھیا نے اسکول کی تعلیم اور ٹینس کی ہنرمندی میں کبھی کوئی تعلق محسوس نہیں کیا تھا۔ لیکن ان دونوں ڈاکٹروں نے اس پر پس منظر اور علم و عمل کی ضرورت کو آشکار کیا۔

گفتگو کے خاتمے پر انہوں نے التھیا کو ایک مشفقانہ پیشکش کی۔ انہوں نے کہا کہ اگر وہ چاہے تو اسکول کے دنوں میں ولمنگٹن میں ڈاکٹر ریٹن کے گھر میں رہ سکتی ہے، اور ولسٹن انڈسٹریل اسکول میں داخلہ لے سکتی ہے۔ گرمیوں کی چھٹیاں وہ ڈاکٹر جانسن کے ہاں گزار سکتی ہے۔ اور ڈاکٹر جانسن چھٹیوں میں اسے ٹینس کے اہم ترین ٹورنامنٹوں کا دورہ کرایا کریں گے۔

التھیا نے ان دونوں حضرات کی ہمدردیوں کا شکریہ ادا کیا، لیکن ان کی پیشکش کو فوری طور سے قبول نہیں کیا۔ اسے شہری زندگی پسند تھی، اور انیس برس کی عمر میں اسکول میں داخلہ لینے سے اسے اپنی زندگی ویران ہوتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ہارلیم میں اسے تنہائی سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ اس نے سوچا کہ کیا وہ ولمنگٹن میں تنہائی کی زندگی گذار سکے گی؟ جب اسے کوئی مسئلہ درپیش ہوتا، وہ ردبنسن سے مشورہ لیا کرتی تھی، چنانچہ اس موقع پر بھی ہمیشہ کی طرح وہ ردبنسن کے پاس گئی۔

رتے نے اس سے کہا، "تھوڑی بہت تعلیم حاصل کرنے کے بعد خواہ تم کچھ بھی کر دے اسے بہتر طریقہ پر انجام دو گی۔"

رتے کے مشورے کے مطابق التھیا نے فیصلہ کرلیا اور دونوں ہاتھوں میں گتّے کی ایک اٹیچی سنبھالے، گلے میں ایک فیتے سے بندھا ہوا اپنا سیکسوفون ڈالے، ولنگٹن جانے کے لئے گاڑی پر سوار ہو گئی۔ گاڑی کی ایک سیٹ پر پڑے پڑے وہ تمام رات یہی سوچتی رہی کہ اب آگے کیا ہونے والا ہے۔ ایک نئے گھر میں جانے کی خوش بختی پر اسے مکمل اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔ اور وہ تذبذب میں مبتلا تھی۔

ولنگٹن کے اسٹیشن پر اس کے استقبال کے لئے ایک شوفر موجود تھا۔ اسے دیکھ کر التھیا کو کچھ اطمینان نصیب ہوا۔ اور وہ اس کے ہمراہ ڈاکٹر ہربرٹ۔ اے ریٹن کے مکان پر پہونچ گئی۔ اسے اپنا کمرہ پسند آیا۔ لیکن خلاف توقع اسکول بے حد بُرا لگا۔ جب وہ اسکول میں داخل ہو گئی تو اسے معلوم ہوا کہ ابھی جو کچھ تعلیم حاصل کر رکھی تھی، وہ ولنگٹن کے اسکول کے ساتویں درجہ کے برابر ہے۔ تاہم رولسٹن ہائی اسکول میں اسے قابلیتی معیار کے امتحان کی بنیاد پر عارضی طور سے یونیورسٹی کورس کے دوسرے سال میں داخلہ مل گیا۔ التھیا جب پہلی بار اپنی کلاس میں داخل ہوئی تو اس نے اپنے آپ کو پانچ فیٹ، دس انچ سے بھی زیادہ لمبا محسوس کیا، اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ انیس برس سے زیادہ عمر کی ہے

اسکول کے ابتدائی دنوں میں کئی بار اس نے خود کو احساس دلایا کہ تعلیم انسان کو بلند مرتبہ بناتی ہے۔ اسکول میں وہ اپنی مگن اور اپنے اطوار کے سبب باقی طالب علموں سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ اسی وجہ سے اس کے ہم جماعت اسے چڑچڑی، بھونڈی اور عجیب و غریب لڑکی سمجھنے لگے تھے۔ اس سے اسے رنج بھی ہوا، لیکن اس نے ہائی اسکول کے مارچنگ بینڈ اور ایک مشترک رقص میں سیکسوفون بجایا اور باسکٹ بال کے کھیل میں ایسی مہارت کا مظاہرہ کیا کہ اسے اسکول کی ٹیم کا کیپٹن منتخب کر لیا گیا۔

اپنے نئے گھر میں التھیا کو وہ تمام حقوق ملے جو بچوں کو اپنے گھر میں حاصل ہوتے ہیں۔ مسز ریٹن نے اس کے لیے عمدہ عمدہ کپڑے بنائے، اسے آداب د

شائستگی اور بننے سنورنے کے طریقے سکھاتے۔ ڈاکٹر رشین نے انتہائی ثابت قدمی کے ساتھ اس پر کچھ پابندیاں لگائیں۔ انہوں نے التھیا کو سمجھایا کہ لوگ کھانے کے وقت باقاعدہ اپنے گھر لوٹ آتے ہیں۔ کوئی طالب علم اسکول سے نہیں بھاگتا اور نہ کوئی ساری ساری رات گھر سے باہر رہتا ہے۔ چنانچہ اس تربیت کی وجہ سے التھیا کا الھڑپن ختم ہوگیا۔ اس میں باضابطگی پیدا ہوگئی۔ اور اسے دوسروں کے ساتھ نبھانے کا فن بھی آگیا۔

التھیا کو ولمنگٹن میں جو غیر معمولی مسرتیں نصیب ہوئیں، ان میں رشین کے ذاتی ٹینس کورٹ کے کھیلوں میں حصہ لینے کی مسرت بھی شامل تھی۔ رشین کے یہاں ولمنگٹن کے بہترین کھلاڑی ٹینس کھیلنے آیا کرتے تھے۔ التھیا نے ان سب کو شکست دی۔ تنہائی کا یہ ماحول اسقدر ناگوار نہیں تھا، جتنا وہ اس سے خوف زدہ تھی، تاہم بسوں کے عقبی حصے میں سوار ہوتے ہوئے اور سینما گھروں میں بالکونی میں بیٹھتے ہوئے وہ خود کو ایک طرح مردود سے کم تر محسوس کرنے لگی تھی۔ یہ احساس کمتری کبھی پہلے اس میں نہیں تھا۔ بعض اوقات وہ اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے بیتاب ہو اٹھتی تھی۔ ایسے موقعہ پر جب وہ اپنے باپ کے رویہ کے متعلق سوچتی تھی تو اسے کسی قسم کا بیر محسوس نہ ہوتا تھا، وہ سوچتی تھی کہ باپ کو تو خود اس نے اذیتیں پہنچائی ہیں۔

گرمیوں کے دنوں میں التھیا ڈاکٹر جانسن کے یہاں لنچ برگ چلی گئی۔ وہاں اس نے بیرکا نکی یا تھوں والی ایک ایسی مشین پر ٹینس کی مشق کی جو ٹینس کی گیند کو انتہائی برق رفتاری سے نیٹ کے اس پار پھینکا کرتی تھی۔ پتلے، دبلے اور پستہ قد ڈاکٹر جانسن فٹ بال کے کھلاڑی رہ چکے تھے۔ اے۔ ٹی۔ اے کے کھیلوں کے لیے وہ کھلاڑیوں کو اپنی بیوک کار میں بٹھا کر اپنے حلقے کا دورہ کیا کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے موسم گرما میں التھیا ڈلاؤ سے کنیاس سٹی تک تمام ٹورنامنٹوں میں شریک رہی۔ ان مقامات پر ۱۰۵ ڈگری تک گرمی پڑتی تھی۔ ان ٹورنامنٹوں میں التھیا نے اپنے انفرادی کھیل میں نو اعزاز حاصل کئے، جن میں اے۔ ٹی۔ اے کا نیشنل ویمین چیمپئن شپ کا اعزاز بھی شامل تھا۔

انتھیا گیند کی پہلی ضرب اور اونچی مار سے زیادہ والی پیچ سیکھ چکی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ نصیحتوں پر عمل پیرا ہونے کے لیے اپنی سرکشی، تنک مزاجی اور اکھڑپن پر بھی قابو پاتی جا رہی تھی۔ اسے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ٹینس کے لیے خود ضبطی، معقول پسندی اور صاحب کردار ہونے کی ضرورت ہے، اور اس کے ساتھ ہی ہنر اور قوت بھی لازمی عناصر ہیں ٹینس میں وہ جس معیار اور شائستگی کی حامل ہو چکی تھی، اسی معیار کے ساتھ اس نے اپنی تعلیم بھی جاری رکھی۔ ۱۹۴۹ء میں اس نے ہائی اسکول سے امتحان پاس کر لیا اور اپنی کلاس میں دسویں نمبر پر آئی۔ اس کے بعد اس نے اپنی زندگی اور ٹینس کو کسی معیاری منزل تک پہنچانے کی شدید خواہش کے زیر اثر وظیفہ حاصل کرنے کی درخواست دے دی۔ چنانچہ ٹیسلا ہیسی کے فلوریڈا اے اینڈ ایم کالج نے اسے وظیفہ دینا منظور کر لیا۔

انتھیا موسیقی میں اعزاز حاصل کرنا چاہتی تھی، لیکن اس کے شعبے کے مشیر نے یہ کہہ کر اس کا حوصلہ پست کر دیا کہ بچیس برس کی عمر میں موسیقی کی ابتدا ازحد دقت طلب ہے۔ اسے موسیقی کی تربیت کافی مہنگی پڑے گی۔ اور موسیقی کے ساتھ ٹینس کا اشتراک اچھا نہیں رہے گا۔ انتھیا راہبات کی انجمن 'الفاکپا الفا' کی بھی ممبر تھی۔ لیکن اس کا بیشتر وقت پڑھائی اور ٹینس میں ہی صرف ہو جاتا تھا، اور ان مصروفیات کے لیے اسے زیادہ سے زیادہ وقت درکار تھا۔

کالج کے تمام طلبا سخت ضابطوں کی وجہ سے اپنا زیادہ وقت کالج کے احاطے میں ہی گذارتے تھے۔ لڑکیوں کو ہفتے میں تین بار اور بعض اوقات اتوار کے دن دو بار سیاہ یا گہرے نیلے کپڑے اور سفید بلاوز پہن کر کالج کے کلیسا میں عبادت کے لیے آنا پڑتا تھا۔ تفریح کے لیے کالج کے سینما ہال میں ہی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ پنچ اور کل کالج کے کنٹین میں ہی کھیلا جاتا تھا، اور مختلف موقعوں پر جیم خانے میں ہی رقص کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔

۱۹۵۰ء کے شروع میں نیشنل انڈور ٹورنامنٹ ہوا، جس میں انتھیا فائینل

ا۔ تاش کا ایک کھیل۔

میں مینسی شینفی سے شکست کھا گئی۔ لیکن تھسلا ہسی واپس پہنچ کر اس نے چیمپئن کے طور پر اپنے استقبال کے لیے لوگوں کو منتظر پایا۔ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کالج کے صدر نے اس کا استقبال کیا اور اسکول بینڈ اس کے آگے آگے بجتا ہوا چلتا رہا۔ استقبال کرنے والوں نے کالج کے احاطے پر بورڈ لٹکا رکھے تھے، جن پر یہ عبارت درج تھی، "التھیا کا اپنے گھر واپس آنا مبارک ہو" اس تحریر میں اپنائیت کا جو جذبہ تھا، اس سے التھیا انتہائی شادماں ہوئی۔

التھیا اور اس کی کفالت کرنے والوں کو امید تھی کہ اس فائنل میں شکست کے باوجود التھیا کو یونائیٹڈ اسٹیٹس لان ٹینس ایسوسی ایشن موسم سرما کے ٹورنامنٹ میں شریک کرے گی کیونکہ التھیا نے بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ ٹورنامنٹ فورلیسٹ ہلز (لونگ آئی لینڈ) میں ہوا کرتے تھے، جو مغربی دنیا میں ٹینس کا اہم ترین مرکز ہے۔ لیکن اس عام توقع کے باوجود التھیا کو ان ٹورنامنٹوں میں شامل ہونے کے لئے کوئی دعوت نامہ موصول نہیں ہوا تھا۔

پھر غیر متوقع طور پر التھیا کی معاونت کا بیڑا ٹینس کے ایک عظیم کھلاڑی، الائس ماربل نے اٹھایا۔ الائس ماربل کو چیمپئن شپ حاصل کرنے کے لیئے خود بھی کچھ مایوس کن تجربات ہو چکے تھے۔ اس نے امریکن لان ٹینس، کے جولائی، ۱۹۵۰ء کے شمارے میں لکھا کہ اگر التھیا کا کھیل ٹینس کی خواتین کھلاڑیوں کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے، تو دیانتداری کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے چیلنج کو کھیل کے میدان میں منظور کیا جائے۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ کے بعد التھیا کو اطلاع ملی کہ اگر وہ فورلیسٹ ہلز کے نیشنل ٹورنامنٹ میں شرکت کے لیے درخواست دے تو اس کی درخواست منظور کی جا سکتی ہے۔

اس خبر سے اسے انتہائی خوشی ہوئی۔ اس نے سوچا کہ وہ فورلیسٹ ہلز کے کھیل میں شرکت کرنے والی پہلی نیگرو عورت ہو گی۔ لیکن ساتھ ہی وہ خبردار بھی ہوگئی اور اس بات پر غور کرنے لگی کہ طویل المدت ٹینس میں اس کا ردِ عمل کیا ہو گا۔؟

ٹورنامنٹ کے دوران میں التھیا نے ہارلیم میں اپنی سہیلی رھوڈا اسمتھ کے یہاں قیام کیا۔ فورلیسٹ ہلز اس کے قیام کی جگہ سے صرف پندرہ میل کے فاصلے پر

تھا کہ وہاں پہنچنے کے لئے اسے ایک ہاتھ میں سامان کا تھیلا اور دوسرے میں ٹینس کے دو ریکیٹ سنبھال کر، سکستھ ایونیو کے زیر زمین اسٹیشن تک پیدل جانا پڑتا تھا، پھر راستے میں اسے گاڑی بدلنی پڑتی تھی، اور پھر ویسٹ سائڈ ٹینس کلب تک پہنچنے کے لئے تین بلاکوں کا سفر پیدل ہی طے کرنا پڑتا تھا۔

جب وہ ویسٹ ورلیٹ اسٹیڈیم میں چوڑی چوڑی رنگین دھاریوں والے خیمہ میں پہنچ گئی تو بہت سے سوالات اس کے ذہن میں ابھر آئے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہارلیم سے فورسیٹ ہلز تک پہنچنے کے لیے وقت اور فاصلے کے اعتبار سے اسے میلوں اور برسوں کی مسافت طے کرنی پڑی ہے، اور اس سفر میں اس کا بچپن نکل گیا ہے۔ لان ٹینس نہ صرف ہاتھ پیروں کا کھیل تھا بلکہ اس میں دل و دماغ بھی لگانا پڑتا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا وہ اس خوبی، طاقت اور کردار کی حامل ہے، جو ٹینس کے اتنے بڑے مقابلے میں حصہ لینے کے لیے ضروری ہیں۔؟

جب وہ کھیلنے کے لئے لان میں پہنچی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے لان میں دوسرے فریق کی مہارت اور داؤں پیچ نقش ہیں، لیکن التھیا کو جیتنے کی دھن سوار تھی: چنانچہ وہ فائنل تک پہنچ گئی۔ گو اُسے اپنی کامیابی پر فخر تھا، لیکن فائنل میں جب اس کا مقابلہ لوئس برون سے ہوا - جو اس وقت ومبلیڈن اور ۱۹۴۷ء کی یونائیٹڈ اسٹیٹس کی چیمپئن تھی، تو اس نے اپنے چہرے پر متانت کے آثار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ابتدائی جھجک ختم ہو جانے کے بعد التھیا نے لوئس برون کی والیوں کی بوچھاڑ کا بڑی عمدگی سے مقابلہ کیا۔ لیکن سخت ترین طوفان برف و باراں کے باعث کھیل درمیان میں ہی رک گیا، اور مقابلہ اگلے روز کے لیے ملتوی ہو گیا۔

اس وقفے سے التھیا کے اضطراب میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ دوسرے دن کے کھیل میں وہ پچھلے دن کا سا تیز رفتار انداز برقرار رکھنے کے ناقابل نظر آ رہی تھی۔ چنانچہ وہ ہار گئی۔ اس روز ہارلیم واپس آتے ہوئے وہ انتہائی دل گرفتہ تھی۔

اگلے سال موسم بہار میں اے اینڈ ایم کالج کے امتحانات ختم ہوتے ہی التھیا سیدھی ہر سی سے ٹینس کی تربیت حاصل کرنے کے لیے ہیم ٹریک (مشیگن) پرواز کر گئی

جیتن ہو کسی ملک کے بہترین ٹینس کے کھلاڑیوں میں تھا۔ التھیا کی نظر ومبلڈن کی چیمپئن شپ پر مرکوز تھی، جو عالمگیر ٹینس کا 'سینٹرل کورٹ' شمار کیا جاتا تھا۔

جب یہ خبر عام ہوئی کہ التھیا کو ومبلڈن میں کھیلنے کے لئے مدعو کیا گیا ہے، تو جوائے بوس نے ومبلڈن کے لئے جہاز کا ٹکٹ حاصل کرنے کا اہتمام کیا اور ڈیٹرائٹ میں رہنے والے نیگرو باشندوں نے اس سفر کے لیے سات سو ڈالر چندہ میں جمع کیا۔

التھیا خوشی خوشی ومبلڈن کے سفر پر روانہ ہو گئی، لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ومبلڈن کی فتح کیا معنی رکھتی ہے۔ یہاں اس کی ہار، مایوسیوں کے ایک طویل سلسلے کی ابتدا تھی۔ ایک کھلاڑی کی حیثیت سے اس کے کھیل کے تناقض نے اس کے ہمدردوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اس میں جسمانی طاقت کو کھیل کی ہنرمندی کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کا رجحان ہے یا نہیں۔ کھیلوں کے ایک مبصر نے اس کی اس شکست پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا، "یہ ٹینس کی بہت بڑی شکست ہے"۔

اب التھیا کو کبھی کبھی ٹینس جاری رکھنے پر خوشی سے بڑھ کر تکلیف محسوس ہونے لگی تھی لیکن وہ خود پر جبر کرنے کے لیے ہمیشہ بہت دیر تک کھیل کی مشق کرتی رہی۔ پھر وہ ٹینس کی مہارت کے لیے ہارلیم کے ایک ٹینس کے استاد، سڈنی لیویلین کے پاس جانے لگی۔ سڈنی نے اسے بتایا کہ "ہر چیمپئن کی کامیابی کے پس پشت قربانیوں اور سخت ترین جدوجہد کا ایک طویل سلسلہ ہوتا ہے"۔ رفتہ رفتہ سڈنی کو یہ یقین ہوتا گیا کہ التھیا بہر طور اعلیٰ معیار حاصل کر سکتی ہے۔

اس نے التھیا کے ریکیٹ پکڑنے کے انداز کو تبدیل کرایا، اور اسے کلائی کے زیادہ سے زیادہ استعمال سے، زیادہ پیچدار وار کرنے کا طریقہ سکھایا۔

بعض اوقات التھیا خود کو الجھن میں مبتلا محسوس کرتی۔ اور بے دم ہو جاتی تھی۔

۱۹۵۰ء میں ملک کے ٹینس کے کھلاڑیوں میں اس کا نمبر نواں تھا۔ پھر ۱۹۵۳ء میں وہ ترقی کر کے ساتویں نمبر پر آگئی۔ تاہم ابھی تک اس نے غیر معمولی کامیابیاں حاصل نہیں

کی تھیں۔ وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ بہت سی لڑکیاں کھیلوں میں حصّہ تو لیتی ہیں، لیکن ہابی کے طور پر دوسروں سے کھیل سیکھ اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگا سکتیں، اور نہ کبھی اپنی پسند کے کھیل کے ماہرین کا اطمینان حاصل کر سکتی ہیں۔ تو کیا اسے دوبارہ صرف تعلیم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔؟

فلوریڈر اے اینڈ ایم کالج سے ڈگری لینے کے بعد التھیا کو جیفرسن سٹی (مسوری) کی لنکن یونیورسٹی میں جسمانی تعلیم کی تدریس کے لیے ایک آسامی پر مامور کر دیا گیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد اسے ایک اور دشوار گذار مرحلے کا سامنا ہوا، اور اسے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے انتہائی دشواری پیش آئی۔ بات یہ تھی کہ اسے فوج کے ایک کیپٹن سے عشق ہو گیا تھا جو یونیورسٹی کے آر۔ او۔ ٹی۔ سی یونٹ کا سربراہ تھا۔ اب التھیا ٹینس میں زیادہ دل چسپی نہیں لے رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا اپنا گھر بن جائے۔ اگر وہ ٹینس کو شوقیہ جاری رکھتی تو وہ محض جہاں گرد بن کر رہ جاتی۔ اور اس کی آمدنی میں بھی کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا تھا

لیکن ٹینس میں وہ اپنا بیشتر وقت اور ذہن برباد کر چکی تھی۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس کی مدد کی تھی۔ اور التھیا نے ابھی تک کوئی بڑی فتح حاصل کر کے ان لوگوں کے اعتماد کی تائید میں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا تھا۔ اگر وہ ٹینس میں کسی چیز کی کوئی اہمیت سمجھتی تھی تو اسے ٹینس سے اپنی یکایک پیدا ہو جانے والی سرد مہری کو ختم کرنا ضروری تھا۔ اس کی عمر اب اکتیس برس کے قریب تھی۔ اس عمر میں تو بہت سے چیمپئن کھیلنا ترک بھی کر چکے تھے۔ ادھر اس نے اور کیپٹن نے فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ انہیں ایک دوسرے کا بہترین رفیق بننے کے لیے شادی کر لینی چاہیئے۔

ملازمت کا دوسرا سال ختم ہوتے ہی التھیا نے استعفیٰ دے دیا اور الیسٹر رد ہو گئی، جہاں سیڈ نے اسے فوریسٹ ہلز ٹورنامنٹ کی تیاری کے لیے مشق کرانی شروع کر دی لیکن التھیا نے اس سے کہا کہ، "اگر مجھے ٹینس کا ہنر آ گیا ہوتا تو میں اب تک چیمپئن بن چکی ہوتی"

مشق کے دوران میں سیڈ نے التھیا کے ناقابل اندازہ، ناگہانی وار کو رد

ہوئے سمجھایا، " تمہارے سامنے ایک عظیم مستقبل موجود ہے۔" پھر اس نے التھیا کو قدموں کے استعمال کے متعلق بتاتے ہوئے کہا کہ ٹینس میں قدموں کی حرکت کا مطلب تیز رفتاری نہیں، بلکہ لچک اور پھرتی ہوتا ہے۔

التھیا اس بار بھی فورسٹ ہلز میں کامیابی حاصل نہیں کر سکی۔ لیکن مقابلے کے بعد مسٹر رین دل میک مان اس کے پاس آئے اور التھیا سے کہا کہ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ ٹینس کے امریکی کھلاڑیوں کی ایک ٹیم کو جنوب مشرقی ایشیا کے خیر سگالی دورے پر بھیجنا چاہتا ہے۔ انہوں نے التھیا سے دریافت کیا کہ، "کیا تم اس دورے پر جانا چاہتی ہو؟"

مسٹر رین دل میک مان اس وقت ویسٹ سائڈ ٹینس کلب کے صدر، اور یونائیٹڈ اسٹیٹس لان ٹینس ایسوسی ایشن کی ایک اہم شخصیت تھے۔

التھیا نے فوراً پلٹ کر مسٹر این دل سے پوچھا، "کیا آپ مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں۔؟" اس کا خیال تھا کہ اس کا کھیل اس قسم کے احترام کا مستحق نہیں تھا۔

مسٹر میک مان نے کہا، "نہیں، میں صحیح کہہ رہا ہوں۔"

"تو میں اس ٹیم میں ضرور شامل ہوں گی۔" التھیا نے جواب دیا۔

اس نے اندازہ لگایا کہ ایک ایسے وقت میں، جب امریکہ کے بین الملکی نسلی اختلافات بیرون جات میں امریکہ کے وقار کو ٹھیس پہنچا رہے ہیں، سیاسی نقطۂ نظر سے اس ٹیم میں ایک نیگرو کو شامل کرنا بہتر سمجھا گیا ہو گا۔ لیکن اس میں سیاسی سوجھ بوجھ کہاں تھی! گو اسے اپنے طبقے کے لئے کچھ کر کے خوشی حاصل ہوتی تھی، لیکن وہ نسلی امتیاز کے خلاف کسی جہاد میں شامل نہیں رہی تھی۔

التھیا کو پتہ چلا کہ اس سفر میں ہیم رچرڈسن، بوب پیری اور کیرول فیگرڈش اس کے ساتھ ہوں گے۔ اس نے سوچا کہ سفر زمام کیرول، جتنی خوبصورت ہے، اتنی ہی پر خلوص بھی ہے۔ اس کے ساتھ یہ سفر بہت اچھا کٹے گا۔ سفر پر روانگی سے دو روز قبل ٹیم کے تمام ممبران نے دی بلڈر ملٹ ہوٹل میں اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے نمائندوں سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران میں ایک نمائندے نے التھیا کو آگاہ کرتے ہوئے کہا، "ہو سکتا ہے کہ آپ سے امریکی

نیگرو عوام کے متعلق بہت سے سوال کئے جائیں۔ اپنے جواب میں آپ وہی کہیں جو آپ کے نزدیک درست ہو۔ لیکن ایسے موقعوں پر یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ آپ ملک کی نمائندگی کر رہی ہیں۔"

اس سفر میں بعض اوقات التھیا کو یہ ذمہ داری شدت سے محسوس ہوئی کہ اسے ہر موقع پر صحیح کام کرنے اور صحیح بات کہنے کی کوشش کرنی ہے، اس لئے کہ وہ ریاستہائے متحدہ کی نمائندگی کر رہی ہے۔ تاہم اس نے اطمینان بخش اور قابلِ تحسین انداز میں یہ ذمہ داری نبھائی۔ اور اس کے اس احساس نے اسے اور بھی زیادہ بہتر کھلاڑی بنا دیا جنوب مشرقی ایشیا کے سیاہ فام بچوں نے انتہائی احترام کے ساتھ التھیا کا کھیل دیکھا، اور سیاہ نسل کے بالغوں نے اسے دیکھ کر انتہائی فخر محسوس کیا۔

اس سفر میں التھیا نے بہت اچھا وقت گذارا۔ تجربات اور خوش گوار لمحات نے ٹینس کے مقابلوں کو اور بھی زیادہ پُر لطف بنا دیا۔ برما میں یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس کی جانب سے دی گئی ایک اعزازی دعوت میں التھیا نے مشرقی طرز کے کھانے، جھینگے اور شارک کے کھپلے وغیرہ کھائے۔

ہندوستان میں اس ٹیم کا شاندار استقبال کیا گیا۔ گندمی رنگ اور محبت کے جذبات سے لبریز آنکھوں والی ہندوستانی خواتین نے ٹیم کے ممبران کو اپنے گھروں میں مدعو کیا۔ التھیا اور کیرال وغیرہ کی چاولوں سے لے کر ساڑیوں تک، ہر چیز سے خاطر مدارات کیں۔ نئی دہلی میں التھیا نے یک نفری کھیل کا پہلا اعزاز، آل انڈین چیمپئن شپ کی صورت میں حاصل کیا۔ اس کے دو ہفتے بعد کلکتہ میں اس نے، آل ایشین ٹورنامنٹ میں اعزاز حاصل کیا۔

سفر کے دوران میں جب التھیا سے امریکی نیگرو عوام کے متعلق سوالات کئے گئے تو اس نے کہا کہ ان کے کچھ مسائل ضرور ہیں لیکن ایسے مسائل تمام ریاستوں اور تمام ممالک پر تمام افراد کو درپیش ہیں" مجھے یقین ہے کہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو حل ہو جائے گا۔"

اپنی بات ختم کرتے ہوئے وہ اپنی رائے کا اظہار اس انداز میں کرتی تھی۔ اس سفر

ہیں انتھیا کو محسوس ہوا کہ ایشیائی عوام، اپنے خوف و ہراس ناامیدیوں اور مسائل کے اعتبار سے امریکی عوام سے انتہائی مماثلت رکھتے ہیں۔

یہ دورہ انتہائی کامیاب رہا۔ اور ۱۲ر جنوری ۱۹۵۵ء کو کولمبو (سیلون) میں ختم ہوا۔ انتھیا کو امید تھی کہ اس سفر میں اس نے اپنے اور اپنے ملک کے بہت سے دوست بنالیے ہیں۔ کولمبو سے وہ ہشاک ہوم کے لیے ہوائی جہاز پر سوار ہو گئی، جہاں وہ ۱۹ر جنوری کو ایک ٹورنامنٹ میں کھیلنا چاہتی تھی۔ کیرول ڈوسل۔ ڈورف (جرمنی) تک اس کے شریک سفر رہی۔ اسے ڈسل ڈورف میں اپنے ایک دوست سے ملنا تھا جو وہاں ایک فوجی چوکی پر مامور تھا۔ طویل سفر میں ایک ساتھ رہنے کے بعد جدا ہوتے ہوئے یہ دونوں سہیلیاں اداس ہو گئیں

اس کے بعد انتھیا سویڈن، جرمنی اور مصر میں کھیلی۔ ہر جگہ اس سے ملاقات کے لیے لوگوں کے ہجوم جمع ہو جاتے تھے، اور معززین اس کے اعزاز میں عصرانے منعقد کرتے تھے، لیکن اب انتھیا اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کی ماتحتی سے تنگ آنے لگی تھی۔ گھر کی یاد اور تنہائی اسے بری طرح ستانے لگی تھی۔ اسے کسی ایسے رفیق کی آرزو تھی، جس پر وہ اعتماد کر سکے۔

وہ پیرس آ گئی۔ یہ شہر اسے بہت خوبصورت اور رنگا رنگ لگا، لیکن خلاف توقع اسے پیرس میں کوئی نیا پن محسوس نہیں ہوا۔ یہاں پہنچ کر اس کی تنہائی کا احساس اور بھی بڑھ گیا۔ پیرس میں انجیلا مورٹیمر کو ہرا کر اس نے فرانس کی چیمپئن شپ بھی جیت لی۔ وہ اس اعزاز کو حاصل کرنے والی پہلی نیگرو خاتون تھی۔ دنیا بھر میں ایک نوعی ٹینس کی کوئی بھی چیمپئن شپ حاصل کرنے کے لیے فرانس کی چیمپئن شپ حاصل کرنا ضروری تھا۔ آسٹریلیا کی ٹرائی سوزین لن کیپ تھی۔

اس کے بعد ومبلڈن کا نمبر تھا۔ رنگون سے لندن تک انتھیا اپنے ملک کی نمائندگی کے احساس کو جگائے رہی تھی۔ اور اس نے اٹھارہ مقابلوں میں سے سولہ مقابلوں میں فتح حاصل کی تھی۔ چنانچہ ومبلڈن میں اس کی جیت پر لوگوں نے شرطیں لگا رکھی تھیں۔ اس مقابلے میں وہ شرلے فرائی سے شکست کھا گئی۔ انتھیا کی اس غیر متوقع شکست پر کھیلوں کے ناقدین نے مختلف قسم کی وضاحتیں پیش کیں۔ کسی نے کہا، "انتھیا ابھی تک

کھیل کی حکمت عملی کی ماہر نہیں ہوئی ہے"۔

ایک دوسرے ناقد نے تجزیہ کیا، "التھمیا بھیڑ سے گھبرا جاتی ہے"۔

التھمیا نے اپنی شکست کو بڑی شدت سے محسوس کیا، اسے آپنے آپ پر غصہ بھی آیا، لیکن اس نے انٹرویو لینے والوں سے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ گفتگو کی۔ سردے گر ریفک، نے اس کی شکست پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا، "ایک یانک جو عالی ظرفی کے ساتھ شکست کھا گئی"۔

بعد ازاں چیمپین شپ کے لیے اپنی استعداد بڑھانے کے بعد التھمیا نے محسوس کیا کہ اس ناکامی کے باوجود اگر اسے دوبارہ ومبلڈن میں مدعو کیا گیا تو وہ یہ اعزاز ضرور حاصل کرے گی۔ پھر التھمیا اپنے گھر واپس آ گئی۔ اس کے والدین کو اس کی اس شہرت پر بے انتہا فخر تھا جو اسے عالمگیر دورے کے سبب حاصل ہوئی تھی۔ اس سفر کی قابلِ فخر یادگاروں میں بعض تحریریں بھی شامل تھیں۔ مثلاً مانڈلے میں پبلک افیئرس کے افسر مسٹر پل لیپر کی تحریر، جس میں انہوں نے تحریر کیا تھا کہ "آپ نے امریکی روایات اور مقاصد کی پیش رفت کے لئے جو کچھ کیا ہے، میں اس کی قدر کرتا ہوں"۔

التھمیا اپنے ملک میں اور دوسرے ممالک میں کچھ کامیابیاں حاصل کر چکی تھی، لیکن ایشیا اور آسٹریلیا کے دورے سے اپنے وطن واپس ہوتے ہوئے وہ یہی سوچ رہی تھی کہ ۱۹۵۶ء اس کا نہیں بلکہ شرے فرائی کا سال ہے۔ وطن واپس آ کر اس نے دوبارہ سیڈنی لیویلین سے ٹینس کی مشق شروع کر دی۔ سیڈنی کو التھمیا پر اب بھی غیر معمولی اعتماد تھا۔ اس کے تعاون سے التھمیا نے ٹینس میں اپنے قدموں کی حرکت اور وقت کے اندازے کو درست کیا۔ سیڈنی نے اسے ہدایت دیتے ہوئے کہا، "اس بات کو ذہن میں رکھ کر کھیلو کہ چیمپین شپ کے حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ ضروری ہے۔ تمہاری گیند وہیں جانی چاہیے جہاں تم اسے پہنچانا چاہتی ہو۔ اس کے علاوہ کہیں نہیں جانی چاہیے"۔

ٹینس کی جانفشاں مشقوں کے درمیان التھمیا مونٹ کلیر (نیو جرسی) میں روز میری ڈریوں کے یہاں تفریح کے لیے چلی جاتی تھی۔ روز میری سے التھمیا کی ملاقات نیگرو

ٹینس ایسوسی ایشن کے ٹورنامنٹ کے درمیان ہوئی تھی۔ یہ دونوں سہیلیاں آپس میں مل کر گھریلو کام کاج کرتیں، تاش یا ٹینس کھیلتیں اور اپنی پسند کے ریکارڈ سنا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی انتھیا، روزبیری کے بھائی ولیم کے ساتھ باہر گھومنے پھرنے بھی چلی جاتی تھی۔

جوں جوں ومبلڈن کے مقابلے کا وقت قریب آتا گیا۔ انتھیا کو یقین ہوتا گیا کہ وہ اس بار ضرور فتح حاصل کرے گی، ورنہ وہ کبھی اس مقابلہ میں شریک نہ ہوگی۔ اس کی کامیابی نہ صرف کھیل کی حکمت عملی پر، بلکہ اس کی اندرونی امنگ پر منحصر تھی۔ سیڈنی نے اس سے کہا "وہ خیالات جو تمہارے ذاتی ٹیپ ریکارڈ پر محفوظ ہوتے ہیں، مشکلات کے وقت تمہارا ساتھ دیتے ہیں۔ وہ خیالات تمہاری مدد بھی کر سکتے ہیں اور تمہیں شکست بھی دلا سکتے ہیں۔"

انتھیا چونکہ ایک تسلیم شدہ بین الاقوامی کھلاڑی تھی۔ اس لئے جب وہ جولائی میں ومبلڈن کے لیے روانہ ہوئی تو اس کے اخراجات یونائیٹڈ اسٹیٹس لان ٹینس ایسوسی ایشن نے برداشت کیے۔ صبح کے پہلے دس بجے جب وہ لندن کے اطراف میں ٹینس کورٹ میں پہنچی، تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس بار تمام عوامل پہلے سے مختلف ہوں۔ اس نے دلچسپی کے ساتھ نظر اٹھا کر دیکھا کہ بارہ گوشی اسٹیڈیم میں ہر طرف ہزاروں آدمی جمع ہو رہے تھے سب کی نظریں درمیان میں بنے ہوئے ٹینس کے میدان کی جانب تھیں۔ مجمع کا ایک طویل سلسلہ تھا جس میں رنگین کوٹ پہنے ہوئے اسکول کے لڑکوں سے لے کر چائے کا سامان اپنی ٹوکریوں میں لیے ہوئے سفید بالوں والی معمر خواتین تک شامل تھیں۔

ابتدائی راؤنڈ اس نے بآسانی جیت لیے، لیکن سیمی فائنل میں انتھیا کو لمبی تڑنگی کرسٹائین ٹرومین کا مقابلہ کرنا تھا۔ کرسٹائین کی عمر اگرچہ صرف سولہ برس کی تھی۔ لیکن انگلستان کو برسوں بعد کرسٹائین جیسا کھلاڑی میسر آیا تھا۔

"اسے تو میں ہڑپ کر جاؤں گی" کھیل شروع ہونے سے قبل انتھیا نے مزاحیہ انداز سے کہا تھا، اور وہ واقعی کرسٹائین کو ہڑپ کر گئی۔

فائنل میں اسے تشنگی ڈارلین ہارڈ کا مقابلہ کرنا تھا، جو اس مقابلے کے لیے میں نے سب اور انتھیا پر حاوی ہوتی نظر آئی تھی۔ جیسے ہی تشنگی ڈارلین سینٹر کورٹ کے اس پر تکلف

میدان میں داخل ہوئی جو صرف ٹورنامنٹ کے لیے استعمال ہوتا تھا، انتھیا اس موقع کی ڈرامائی نوعیت اور رنگا رنگ فیبارٹے سے متعدد ہو گئی۔ رائل بکس میں فوجی میسر اور غیر ملکی اہم شخصیتوں کے علاوہ انتہائی آراستہ و پیراستہ پوشاک میں انگلستان کی ملکہ بھی تشریف فرما تھیں اس دن بہت گرمی تھی۔ اور درجہ حرارت تقریباً سو درجے تک پہنچا ہوا تھا لیکن ہوا رکی ہوئی تھی اور انتھیا کو ٹینس کھیلتے ہوئے آج سے زیادہ مزہ کبھی نہیں آیا تھا۔

سب سے پہلے انتھیا نے ٹاس جیتا۔ اپنے ہونٹوں کو بھینچ کر اس نے قوت اور اعتدال کے ساتھ گیند کو ضرب لگائی۔ گیند کا درجہ حرارت درست رکھنے کے لیے اسے ریفریجریٹر میں رکھا گیا تھا۔ پہلے ہی وار سے مجمع نے انتھیا کو داد دینی شروع کر دی یہ لوگ اس سے بے خبر تھے کہ انتھیا کے اس کھیل کی پشت پر اس کی مسلسل مشق موجود ہے انتھیا نے رکے بغیر، پوری مستعدی کے ساتھ ایک مضطرب چیتے کی طرح کھیل کے میدان میں تسلط جما لیا۔ ڈارمین کی تمام کوتاہیاں بھی نقش ہوتی گئیں کیوں کہ ٹیلی ویژن کیمرہ ایک ایک لمحہ کا کھیل محفوظ کرتا جا رہا تھا۔ دونوں کے کھیل کا کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔ کھیل کے خاتمہ پر جب انتھیا نیٹ کی جانب دوڑی تو اس نے خود اپنے آپ سے کہا، "آخر، آخر میں نے جیت ہی لیا۔"

جب ڈارلین نے آگے بڑھ کر انتھیا کا بوسہ لیا تو انتھیا نے اس سے کہا، "تم بہت اچھا کھیلی ہو۔"

جب یہ دونوں مخالف فریق ایک ساتھ امپائر کی کرسی کی جانب روانہ ہونے لگیں تو کارکنوں کی ایک جماعت نے رائل بکس تک سرخ رنگ کا قالین بچھا دیا، کوئین الزبیتھ رنگین لباس اور سفید ہیٹ پہنے ہوئے، انتہائی شان کے ساتھ چلتی ہوئی ٹینس کورٹ کی جانب آنے لگیں۔ انتھیا نے کورنش بجا لانے کے لئے جھکتے ہوئے سوچا کہ وہ خود بھی اس وقت کسی ایسی ملکہ سے کم نہیں ہے جو ابھی تک اس تک آنے کے لیے راہ ہی میں ہے۔

میری جانب سے مبارک باد قبول کرو۔" ملکہ نے ہاتھ ملاتے ہوئے التھیا سے کہا، "باہر بہت زیادہ گرمی ہے۔"

"جی ہاں، یور مجیسٹی، لیکن کم از کم میں نے تو ہواؤں کو جنبش دی تھی۔"

ملکہ نے التھیا کو سونے کی ایک کشتی پیش کی، جس پر ومبلیڈن کے تمام چیمپینوں کے نام کندہ تھے۔ التھیا دوبارہ کورنش بجا لائی اور واپس آگئی۔ آج اس نے وہ مقصد حاصل کر لیا تھا جس کے لیے وہ برسوں آرزو کرتی رہی تھی۔ اور جو اسے ایک خواب کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ اخباری نامہ نگاروں اور فوٹو گرافروں نے التھیا کو گھیر لیا اور اس پر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔

اس رات التھیا نے ومبلیڈن بال پر ایک ملکہ کی طرح حکمرانی کی۔ ڈیوک آف ڈیون شائر نے اس کے ساتھ رقص کیا، اور رقص کے موسیقاروں کی درخواست پر اس نے بھرپور اور بہترین آواز میں ایک مقبول عام گیت بھی گایا۔

جب اس سے کچھ کہنے کی درخواست کی گئی تو اس نے اپنی تقریر میں اپنے معاونین کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جو تاج وہ پہنے ہوئے تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے التھیا نے کہا کہ، "خدا مجھے توفیق دے کہ میں اسے شان کے ساتھ پہنے رہوں، اس کا احترام کرسکوں اور جب میرے دن پورے ہو جائیں تو میں خوشی کے ساتھ اس سے دست بردار ہو جاؤں۔"

اس تقریب سے فارغ ہو کر وہ انجیلا بکستی کے کمرے میں واپس آگئی جہاں وہ قیام پذیر تھی۔ واپسی پر اسے ٹیلی گراموں کا ایک بنڈل موصول ہوا۔ یہ تار ولسٹن اِنڈسٹریل ہائی اسکول، سوگر رے، گورنر ایویرل ہیری مین اور دوسرے جنوں دوسرا افراد نے بھیجے تھے۔ ان میں ڈوائٹ ڈی آئزن ہاور (صدر ریاست ہائے متحدہ امریکہ) کا پیغام بھی تھا۔ آئزن ہاور نے اپنے تار میں تحریر کیا تھا کہ وہ اس کے حوصلے، مستقلال اور اس کی کاوشوں پر اپنی مسرتوں کا اظہار کرتے ہیں۔

دو دن بعد جب التھیا آئیڈل ائیرپورٹ پہنچی تو اخباری نمائندے، ریڈیو کے رپورٹر اور شہر کے اعلیٰ افسران اس سے ملاقات کے لیے ٹوٹ پڑے۔ لیکن وہ ہوائی

جہاز سے اترتے ہی اپنی ماں سے ملنے کے لیے دوڑ پڑی۔

اے۔ ٹی۔ اے کے ایگزیکٹو، مسٹر ہربرٹ ریم۔ ایل بیگ کے یہاں ناشتہ کرنے کے کچھ عرصہ بعد، التھیا انتہائی انبساط کے عالم میں اس گلی کی جانب روانہ ہوئی جہاں سے وہ بچپن میں گلے سڑے شفتالو لیکر خوشی خوشی اپنے گھر آیا کرتی تھی۔ جب اُس نے پرانے شکستہ مکانوں میں سے لوگوں کو انتہائی جوش و خروش سے باہر آکر خوش آمدید کہتے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ یہ لوگ اس بات پر انتہائی خوش تھے کہ التھیا نے ایک بڑا کارنامہ کر دکھایا۔ التھیا کا باپ تیسری منزل کی ایک کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا۔ اُس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا تھا، اور وہ ہاتھ ہلا ہلا کر التھیا کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

التھیا کے گھر واپس آنے کے دو روز بعد نیویارک میں ایک روایتی اعزازی استقبالیہ منعقد کیا گیا۔ شہر کی جانب سے التھیا کو ایک تحفہ پیش کرنے کے لیے میئر ویگز سٹی ہال کی سیڑھیوں پر التھیا کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔ پھر کچھ دیر بعد والڈورف اسٹوریا میں دوپہر کے کھانے کی ایک رسمی دعوت میں یہ تحفہ التھیا کو پیش کیا گیا۔

التھیا خواہ ٹینس کی ملکہ تھی، لیکن نیویارک کے استقبالیہ کے دوسرے دن، ومبلڈن کی اس ملکہ کو شکاگو کے مضافات کے کسی شاندار ہوٹل میں جگہ نہیں مل سکی۔ یہاں التھیا کو نیشنل کلے کورٹ ٹورنامنٹ میں کھیلنا تھا۔ سیٹرڈے ریویو آف لٹریچر کا ایک نمائندہ، کوشش رہا تھا کہ التھیا سے انٹرویو لینا چاہتا تھا، وہ اسے شکاگو کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں تلاش کرتا رہا، لیکن آخر میں اسے ایک سرائے میں پایا۔ اس ٹورنامنٹ میں بھی التھیا نے فائنل میں ڈارلین کو شکست دی

التھیا جانتی تھی کہ ورزشی کھیلوں کا کوئی کھلاڑی جو خود کو اعلیٰ درجے کے کھلاڑی کی حیثیت سے برقرار رکھنا چاہتا ہے، ہنسی کے طرۂ امتیاز پہ قائم دوام نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ وہ ٹینس کی مشق جاری رکھنے کے لئے ایسٹ واپس چلی گئی۔ ماہ اگست میں اس نے سیوکلے (پنسلوانیا) میں وحمٹ مین کپ کے مقابلوں میں حصہ لیا۔ یہ ٹورنامنٹ ریاستہائے متحدہ

امریکہ اور انگلستان کے درمیان ہو رہے تھے۔ التھیا نے اپنے ملک کی نمائندگی کی اور اپنی ٹیم کو فتح یاب کرایا۔

اس کے بعد وہ فورلیسٹ ہلز کے ٹورنامنٹ میں شریک ہوئی اور فائنل تک پہنچ گئی۔ فائنل میں اس کا مقابلہ لوئس بردف سے ہوا، جس نے سات برس پہلے اسے شکست دی تھی۔ چالاک اور تجربہ کار لوئس بردف کھیل میں حکمت عملی سے تو کام لے رہی تھی، لیکن اس بار اس کے کھیل میں پہلے جیسی شدت نہیں تھی۔ آخر برسوں کی ریاضت کے نتیجے میں آج التھیا نے اسے انتہائی حیرت انگیز طریقے سے شکست دیدی۔

میچ جیتنے کے بعد وہ تمغہ حاصل کرنے کے لیے ریاستہائے متحدہ کے نائب صدر مسٹر رچرڈ نکسن کی جانب بڑھی۔ راہ میں اسے پرجوش مجمع نے گھیر لیا اور تعریف و تحسین کے نعرے بلند کئے۔ التھیا رک گئی اور اپنا سر جھکا کر سب کا شکریہ ادا کرتی رہی۔ مسٹر نکسن سے تمغہ لیتے ہوئے اس نے کہا کہ میں اس اعزاز پر انتہائی انکسار کے ساتھ سب کی شکرگزار ہوں۔

ایک اخبار نویس نے التھیا سے پوچھا، "کیا فورلیسٹ ہلز میں اپنی کامیابی پر آپ کو اتنی ہی خوشی ہوئی ہے، جتنی ومبلیڈن کی فتح سے ہوئی تھی؟"

التھیا نے اس اخبار نویس کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس نے اپنے لیے کبھی کچھ نہیں کیا۔ اسے سب سے زیادہ مسرت اس وقت حاصل ہوئی تھی۔ جب اس نے اپنے ملک کے لیے فتح حاصل کی تھی۔

ایک دوسرے اخباری نمائندے نے التھیا سے سوال کیا، "ٹینس کی پہلی خاتون چیمپئن بننے کے بعد آپ کیا محسوس کر رہی ہیں؟"

"بہت عظیم،" التھیا نے جواب دیا۔ لیکن التھیا کے کچھ مداح ایسے بھی تھے جو یہ جانتے تھے کہ التھیا کی یہ فتح کتنی ناکامیوں، پریشانیوں اور جانفشانیوں کا ثمر ہے۔ شدید ناکامیوں کے عالم میں اپنی جدوجہد جاری رکھنے کے لیے التھیا کو اپنے

اندر اخلاقی جرأت پیدا کرنی پڑی تھی ۔ اگر اپنی ابتدائی کامیابیوں پر ہی وہ مغرور ہو جاتی تو ٹینس کی اعلیٰ ترین خاتون کا اعزاز حاصل نہیں کر سکتی تھی ۔ وہ جانتی تھی کہ جسمانی کھیلوں کا کھلاڑی کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا ۔ اپنی مسلسل کامرانیوں کے عرصہ میں بھی وہ منکسر مزاج ہی رہی ۔ یہاں تک کہ ومبلڈن کی کامیابی اور نیویارک کے استقبالیے کے بعد بھی وہ ہارلیم کی گلیوں میں بچوں کے ساتھ مزے سے پیڈل ٹینس کھیلتی رہی ۔

التھیا اگرچہ اب دنیا کی عظیم ترین ٹینس کی کھلاڑی بن گئی تھی، لیکن اس کے مسائل اب بھی موجود تھے ۔ اسے توقع تھی کہ اس نے ٹینس میں جو کامیابیاں حاصل کر دکھائی ہیں، ان کی وجہ سے مستقبل میں ٹینس کے دوسرے نیگرو کھلاڑیوں کو بھی مواقع ملیں گے ۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی کامیابی اس امر کی ضامن بن جاتی ۔ چونکہ اس نے نسلی مساوات کی تحریکوں میں حصہ نہیں لیا تھا، اس لیے نیگرو پریس کے ایک طبقہ نے اسے ادیپرا کی مغنیوں جیسا رویہ رکھنے پر لعن طعن کی تھی ۔

التھیا کے نزدیک ایک انسان کے عزت دار ہونے کا مطلب یہ تھا کہ وہ انفرادیت کا حامل ہو ۔ چنانچہ وہ ٹینس کی ایک کھلاڑی ہونے کے علاوہ اپنی شخصی انفرادیت حاصل کرنا چاہتی تھی ۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے ایک بامقصد اور اہم شخصیت کے طور پر تسلیم کیا جائے تاہم بچپن کے تجربات کے سبب اس میں کم آمیزی کی خاصیت بڑھ گئی تھی ۔ اپنی اس کم آمیزی کے باعث وہ اکثر و بیشتر بے حس، جذبات سے عاری اور سخت گیر نظر آتی تھی ۔ جب وہ حقیقی طور پر پرخلوص محبت کا اظہار کرنا چاہتی تب بھی اس کے چہرے سے ایسے ہی آثار نمایاں ہوتے تھے ۔

اسے مادی مشکلات بھی تھیں ۔ اگر وہ ٹینس کا شوق جاری رکھتی تو اس کی آمدنی ناکافی اور بے قاعدہ رہتی ۔ پیشہ ور کھلاڑی بننا اسے پسند نہ تھا ۔ پھر بھی اسے سرمایہ درکار تھا ۔ اس کے والدین اب بھی ہارلیم کے اس تنگ کمرے میں مقیم تھے، جس میں التھیا کے بھائی، اس کی بہن للین اور دو بچوں والی ایک شادی شدہ بہن مقیم تھی ۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے والدین کو اس کمرے سے کسی دوسرے مکان میں منتقل کرے ۔ اس کے لیے

بھی اسے روپے کی ضرورت تھی۔

خوش قسمتی سے التھیا کا ٹینس کا کھیل زیادہ عرصہ تک جاری نہیں رہ سکا۔ ٹینس کا میدان چھوڑنے کے بعد اسے کسی ایسی مصروفیت کی ضرورت تھی جس سے اسے آمدنی بھی ہو سکے اور اس کی دلچسپیاں بھی برقرار رہیں۔ ایسی مصروفیت صرف موسیقی ہی تھی، جس سے التھیا کو شروع سے عشق تھا۔ لیکن ٹینس میں اسے جو کامیابی حاصل ہوئی تھی، ایسی کامیابی کی توقع موسیقی سے نہیں تھی، تاہم اسے گانے کا بے حد شوق تھا۔

سیڈ لیلیوسی نے اس خوف سے کہ کہیں موسیقی کے باعث التھیا ٹینس ترک نہ کردے، اس کے ارادوں کی مخالفت کی، لیکن آخر میں وہ اس کا ہم خیال ہو گیا۔ اور اس نے اس معاملے میں بھی التھیا سے تعاون کیا۔ التھیا کی موسیقی کی تعلیم کے لیئے اس نے لونگ آئی لینڈ یونیورسٹی کے خطابت و نطق کے ڈائریکٹر، جیمس کنیڈی کا انتظام کر دیا مغنیہ کے طور پر التھیا ایک ڈنر میں پہلی بار عوام کے سامنے آئی۔ یہ ڈنر ڈبلیو سی ہینڈی کو ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا گیا تھا۔ مسٹر ہینڈی نے سینٹ لوئس بلوز اور بہت سے دوسرے کامیاب نغمے تخلیق کیے تھے۔ التھیا نے گانا تو محض پاسداری کے خیال سے گایا تھا، لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کے گانے سے یہ معزز شخص جو کمزور اور نابینا ہونے کے باوجود بھی حسین نظر آ رہا ہے، محظوظ ہوا ہے تو اس نے محسوس کیا کہ اُسے اس فن کی قیمت وصول ہو گئی۔

اس کے بعد التھیا نے موسیقی کی مشق کے لیئے اور اپنا ایک مخصوص طرز بنانے کی غرض سے ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ اس کمرے میں فرنیچر تو بہت کم تھا، لیکن خالی جگہ اس کی ٹرافیوں سے بھر گئی۔ ان میں اس کی نئی حاصل کردہ ٹرافی 'بیب ڈڈرکسن زہاریاس، ٹرافی بھی شامل تھی، جو اسے ۱۹۵۷ء کی 'ورزشی کھیلوں کی خاتون، کی حیثیت سے ملی تھی، کچھ ٹرافیاں جوتی سیٹ، کیک پلیٹ اور کھانے کی ٹرے کی طرح کی تھیں، اس کمرے کے لیے بہت مفید نظر آئیں۔ بہت سی ٹرافیاں اس نے صندوق میں ہی رہنے دیں، کیوں کہ ان پر متواتر پالش کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس کمرے

میں اتنی گنجائش تو نہیں تھی کہ التھیا اسے مہمان نوازی کے لیے استعمال کر سکے، پھر بھی اس کے خاندان کے افراد اور احباب اس میں آسانی سے سما سکتے تھے۔ ایک زمانہ میں التھیا کو یہ احساس تھا کہ جن لوگوں کے درمیان ان کی پرورش ہوتی ہے، وہ اس کی زندگی کی جدوجہد میں حصّہ لیتے رہے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو مصیبت کے وقت اس کے کام آ سکتے ہیں۔

جب التھیا اپنے کمرے میں تنہا ہوتی تو یا تو ریکارڈ سن کر دل بہلاتی، یا پھر جاسوسی کہانیاں، سوانح عمریاں یا بائبل پڑھا کرتی تھی۔ التھیا کو ٹوٹی پھوٹی چیزیں ٹھیک کرنے کا شوق تھا۔ بعض اوقات وہ اپنے استعمال کی شکستہ چیزوں کو پھیلا کر بیٹھ جاتی اور انھیں درست کرنے لگتی تھی۔

۱۹۵۸ء آیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہ سال ٹینس سے زیادہ موسیقی کے لیے وقف کرے گی۔ لیکن مارچ میں اس نے جنوبی امریکہ کے بہت سے شہروں کا دورہ کیا اور ٹینس کے مختلف ٹورنامنٹ کھیلے۔ اس سفر کے دوران میں وہ آفتابی عمل اور تپرا کی سے بھی محظوظ ہوتی رہی۔ ٹورنامنٹس میں اس نے بہت سے مقامات پر فتح حاصل کی، لیکن کچھ مقابلوں میں شکست بھی کھائی۔

جنوبی امریکہ سے واپس آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد اس کے گائے ہوئے بیلیڈس کے ریکارڈوں کا ایک البم تیار ہو کر مارکیٹ میں آ گیا۔ اسی ہفتہ ایڈ سیلون نے التھیا سے درخواست کی کہ وہ شنبہ کی رات کے اس کے ٹیلی ویژن پروگرام گانا گائے۔ اس پیش کش پر التھیا تذبذب میں پڑ گئی۔ اور سوچنے لگی کہ اسے یہ موقع اس لیے دیا جا رہا ہے کہ وہ اچھی مغنیہ ہے، یا اس لئے کہ وہ ٹینس کی بہترین کھلاڑی ہے!

پھر جیسے ہی اس نے ومبلڈن میں دوبارہ شرکت کرنے کے لیے مشق شروع کی۔ ٹینس دوبارہ اس کی مخصوص اور نمایاں مصروفیت بن گیا۔ پہلی جیت کے مقابلے میں دوسری بار کی فتح اسے زیادہ اہم معلوم ہوتی تھی۔ مشق کے دوران میں سڈنی نے التھیا کی مہارتوں اور ہوشیاری کی چالوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اسے تحریک دلائی کہ وہ ہر ضرب

لگاتے ہوئے چیمپئن شپ کے تخت، اپنی طاقت اور اپنے مصمم ارادے کو پیش نظر رکھو"۔
التھیا کی انگلستان کو روانگی کے وقت سیڈنی نے اس سے کہا، "تم ایک چیمپئن کی حیثیت سے کھیلنے جا رہی ہو۔ اس لئے تمہیں اس بار بھی چیمپئن ہی ہونا چاہیئے"۔
التھیا نے سیڈنی کی بات رکھ لی اور فائنل میں انجیلا مورٹیمر کو شکست دے کر دوبارہ چیمپئن شپ حاصل کر لی۔
انگلستان سے وطن واپس آنے کے بعد التھیا دوبارہ موسیقی کی جانب متوجہ ہو گئی۔ اس کے بعد التھیا کی ایک اور صلاحیت کے باعث نئے انداز سے شہرت ہوئی۔ اس کی یہ نئی قابلیت اس کی لکھی ہوئی کتاب "میں ہمیشہ معزز شخصیت بننے کی خواہشمند رہی" سے ظاہر ہوئی۔ یہ کتاب بیشتر تو ٹینس کے متعلق ہے، لیکن اس میں خود التھیا کے متعلق بہت کچھ ہے۔ اپنی اس کتاب میں التھیا نے جو حقائق بیان کئے ہیں، وہ کہیں کہیں ناپختگی اور تنگ نظری کے حامل نظر آتے ہیں، لیکن ان میں خلوص اور دیانتداری کی کمی نہیں ہے۔ التھیا نے جو تجزیئے کئے ہیں، ان سے اس کا حوصلہ، ارادہ کی پختگی اور لطیف مزاح نمایاں ہے۔ مثلاً "مجھ سے یہ سبق سیکھئے کہ جب آپ کو کوئی ایک دوست میسر ہو تو سمجھئے کہ آپ کے پاس سونے کی کان موجود ہے"۔ التھیا کے تجربات واحساسات کی یہ محض ایک مثال ہے۔
التھیا نے ۳ ستمبر ۱۹۵۷ء کو خواتین کی ٹینس کے یک نفری کھیل میں یانِ امریکہ کا اعزاز بھی حاصل کیا، اور یہ اعزاز حاصل کرنے والی پہلی امریکی خاتون قرار پائی۔ اس نے اس مقابلے میں میکسیکو کی یولینڈر رمیریز کو شکست دی۔
کھیلوں میں کوئی چیمپئن ہمیشہ چیمپئن نہیں رہتا۔ ممکن ہے التھیا آئندہ کبھی ومبلیڈن میں نہ کھیلے، لیکن اس کا نام ومبلیڈن کلب کی دیواروں پر کندہ ہو چکا ہے۔ ایک تابناک مستقبل کا تعاقب کرتے ہوئے اس نے ٹینس کے منتہائے کمال کو پا لیا۔ بہت عرصہ بعد جب وہ اپنی ذات سے اپنے ریکیٹ کو الگ کر سکے گی تو اس کا ریکیٹ ٹینس کے عظیم کھلاڑیوں کے ریکارڈ میں محفوظ کر دیا جائے گا

لیکن اس سے کہیں زیادہ اسکا معنی ریکارڈ کیلئے کہ ہارلیم کی رہنے والی ایک الھڑ لڑکی نے قدر و منزلت کا رتبہ حاصل کرلیا ۔

(۱۴)

وینڈا لینڈوسکا

ہارپسی کورڈ کی پجارن

بچپن میں ایک بار وینڈا لینڈ وسکا نے ایک کاغذ پر یہ عبارت تحریر کی "
" میرے خوابوں میں صرف ایک ہی چیز بسی ہوئی ہے کہ میں باخ ، ہیڈن اور موزارٹ کے راگ بجا سکوں " ۔ اس تحریر کو اس نے ایک لفافے میں بند کیا ۔ جس پر درج تھا " جب میں بڑی ہو جاؤں ، تب یہ لفافہ کھولا جائے " ۔ لیکن وہ اپنے بڑے ہونے کا انتظار نہ کرسکی اور اگلے ہی دن اس نے لفافہ کھول ڈالا ۔

وینڈا ۵ا جولائی ۷۹ء کو پیدا ہوئی تھی ۔ اس کا ماحول موسیقی کا ماحول تھا ۔ وینڈا کا باپ وارسا (پولینڈ) میں وکالت کرتا تھا ۔ اسے موسیقی کا بے حد شوق تھا ۔ اس کے یہاں موسیقی کی غیر رسمی تقریبات میں پیتیا ہیتستی جیسے عظیم موسیقار اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے تھے ۔ تین برس کی عمر میں ہی وینڈا نے پیانو کی مشق شروع کردی تھی ۔ جب وینڈا اسکول جانے کے قابل ہوگئی تو اس کی ماں نے اسے پڑھانا شروع کردیا ۔ وینڈا کی ماں فرانسیسی ، جرمن ، انگریزی اور سلاوی زبانیں جانتی تھی ۔

لیکن ونڈا کو صرف پڑھائی سے دلچسپی نہیں تھی، وہ وارسا شہر کے باہر ایک جھیل میں، جس کے پانی کی سطح دھوپ سے رنگین ہو جاتی تھی، تیرتے ہوئے ہنسوں کو دیکھنے جاتی اور اس تفریح سے بیحد محظوظ ہوتی تھی۔ سردیوں کے موسم میں وہ سمور کے کپڑوں میں لپٹی ہوئی۔ ایک برف گاڑی پر سوار ہو جاتی جسے ایک گھوڑا کھینچا کرتا تھا۔ گھوڑے کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹی ٹن ٹن بجتی رہتی تھی۔

اکثر و بیشتر ونڈا اپنی ایک پھوپھی کے یہاں چلی جاتی تھی جس کی دیہات میں کافی جائداد تھی۔ راستے میں اسے پھوس کے جھونپڑوں میں سے نکلتے ہوئے، بے ہنگم بیل گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے اور سڑک کے کنارے بنے ہوئے مقبروں کے آگے جھک کر عبادت کرتے کسان نظر آتے تھے۔ اس راستے میں کبھی کبھی کسی جنگلی دلدل کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے ہنسوں کے بولنے کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔

پھوپی کے یہاں شام کے وقت عورتیں کتائی میں مصروف ہو جاتی تھیں اور مرد اپنے چہرے پر اداکارانہ صفات پیدا کر کے کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تر پولستانی وطن پرستوں کے عظیم کارنامے شامل ہوتے تھے۔ ونڈا کو پھوپی کے یہاں کی اس طرح کی شامیں بے حد پسند تھیں۔ بعض راتوں کو اپنے بستر میں گھس جانے کے بعد ونڈا بھیڑیوں کی آوازیں یا ہواؤں کا المناک شور سن کر ڈر کے مارے کانپنے لگتی اور اپنی کپکپاہٹ دور کرنے اور خطرات سے محفوظ ہونے کے لئے لحاف اچھی طرح اوڑھ لیتی تھی۔

میلہ کے دنوں میں ونڈا کی پھوپھی اسے میلہ دکھانے کے لئے لے جایا کرتی تھی۔ میلہ میں دیہاتی رنگ برنگے کپڑے پہن کر آیا کرتے تھے۔ ان کے اس لباس میں جاگیرداری کے زمانے سے آج تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ یہ لوگ میلہ میں اپنے قدیم سازوں کے ساتھ رقص کیا کرتے تھے۔ جب رقص کرنے والے کسان مزرکا[۵] رقص کرتے ہوئے گول دائرہ بنالیتے تو ونڈا اپنے پھولدار اسکرٹ کو ہلا ہلا کر اس سے آواز پیدا کرتے ہوئے اور جوتوں کو زمین پر بجا بجا کر خوب مزے کرتی تھی۔ پولونائز[۶] رقص کرنے والے جوڑے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے، بل کھا کر سانپ کی کنڈلی کی سی شکل بنالیتے تھے۔ ونڈا بھاتیوں کے ان نغموں کی معانی اور تکراری آہنگ اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتی تھی، تاکہ وہ گھر پہنچ کر اپنے پیانو پر اس روانی اور آہنگ کی مشق کر سکے۔

ونڈا کے والدین پر جلد ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ اس میں موسیقی کی غیر معمولی صلاحیت موجود ہے

۵۔ ایک پولستانی رقص۔ ۶۔ ایک پولستانی رقص جو مدھم رفتار سے کیا جاتا ہے۔

لیکن، اس کے والدین نے ان کمالات کو کبھی کسی عام تقریب میں پیش نہیں کیا تھا۔ وندا کے بہت سے اساتذہ نے اس کے لیے " ایٹوڈ" کی سخت ترین مشق کی تجویز کی۔ اور اس کی انگلیوں اور راگوں کی تربیت کے لیے وندا کے ہم وطن موسیقار شوپین کے راگ تجویز کئے۔ شوپین ۱۸۴۹ء میں وفات پا چکا تھا۔ وندا کو اس کے راگ پسند تو تھے، لیکن اسے زیادہ دلچسپی باخ سے تھی، حالانکہ اس وقت باخ کا رواج نہیں تھا۔

وندا کے والدین نے اسے وارسا کنزرویٹری آف میوزک میں، شوپین کے ایک مشہور شارح الگزینڈر میخالوسکی سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل کرا دیا۔ وندا کو پیانو بجانے کی طرح گانے کا بھی بے حد شوق تھا۔ چنانچہ وہ اوپیرا میں بھی باقاعدہ حصہ لینے لگی۔ ایک بار اس نے ایک مکمل گانا یاد کیا اور پھر اسے اس طرح گایا جیسے اس کے سامنے تماشائی بیٹھے ہوئے ہوں۔

چودہ برس کی عمر میں وندا نے کنزرویٹری سے سند حاصل کر لی۔ اسے رخصت کرتے ہوئے کنزرویٹری کے اساتذہ نے وندا کے والدین سے کہا: "اب کوئی ایسا سبق باقی نہیں، جو ہمیں وندا کو سکھانا ہو۔"

کچھ ہی عرصہ بعد وندا نے پہلی بار وارسا کے ایک کنسرٹ میں شرکت کی اور باخ کا انتہائی راگ "انگلش سوٹ ان ای مائنر" بجایا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں اور معنی خیز مسکراہٹ والی اس لڑکی کے مستحکم اسلوب اور سر تال کے توازن کو پوری طرح برقرار رکھنے کی صلاحیت سے سامع حیرت زدہ رہ گئے۔

وندا کو ابھی کی بورڈ (ساز کے پردوں کا تختہ) پر معمولی سی تربیت درکار تھی۔ اس استادوں اور والدین نے اسے سمجھایا کہ پیانو نواز کو کس قدر کم مواقع میسر آتے ہیں اور اس فن اس کی آمدنی کس قدر غیر تسلی بخش ہوگی۔ لیکن وندا کسی دوسری جگہ جا کر اپنی موسیقی اور پیانو کی تعلیم برقرار رکھنے پر بضد تھی۔

وندا کی تمام زندگی موسیقی کے گرد گھومتی رہی۔ سترہ برس کی عمر میں اس کے والدین نے برلن جانے کی اجازت دے دی کہ اس زمانے میں برلن تہذیبی مرکز سمجھا جاتا تھا۔ برلن میں موسیقی کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے اسے پولستانی نسل کے ایک متمول شخص موریٹز موزکوفسکی کی قربت حاصل رہی

یہ موسیقی کا ایک مختصر آہنگ۔

نے راگوں کی تربیت کے سبق اس عظیم پیانو نواز، پیڈرووسکی کے استاد ہینرخ اربن سے لئے۔

اربن نے وندا کو بتایا، "اگر تم باقاعدہ پیانو نواز بننے کی خواہش نہ ہو تو جب تمھیں موقع ملے بھی موسیقی ضرور سنا کرو۔" وندا کو یہ تجویز پسند آئی اور وہ تقریباً ہر رات نغمہ و سرود کی کسی محفل (کنسرٹ) میں یا اوپیرا کے کسی مظاہرے میں شرکت کرنے لگی۔ وندا کو یقین تھا کہ ادب کے مطالعے سے اس میں موسیقی کی سوجھ بوجھ اور موسیقی کے مفہوم کو سمجھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوگا۔ اس لئے اس نے ادب کا بھی بھرپور مطالعہ کیا۔

پھر بھی وندا محض ایک بے روح نابغہ ہی نہیں تھی، بلکہ انتہائی خوش خلق اور محبت کرنے والے دل کی مالک تھی۔ برلن میں اس نے بہت سے دوست بنائے تھے۔ ان میں انتہائی پرجوش موسیقار اور یہودیوں کی عام روایات و عقائد کا طالب علم ہنری لیو بھی شامل تھا۔ ایک بار ہنری نے وندا سے محبت جتاتے ہوئے کہا کہ برلن کی زندگی بے روح ہے، اس لئے تعلیم حاصل کرنے کے لئے کیوں نہ وہ پیرس جائیں؟

ہنری کو یہودی رسم و رواج کی تقابلی تحقیق کے لئے پیرس میں ایک وظیفہ مل رہا تھا۔ وظیفہ کی رقم بہت قلیل تھی لیکن وندا اور ہنری ایک دوسرے سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ وہ اسی معمولی سی رقم میں گزارہ کرلیں گے۔ ان دونوں نے شادی کرلی اور شادی کے بعد اپنی تھوڑی سی آمدنی میں گھر کے اخراجات کفایت شعاری سے پورے کرتے رہے۔

ایک دن ہنری دوڑتا ہوا گھر میں داخل ہوا اور ایک ہی سانس میں وندا سے کہا، "ڈگینس نے اپنے ہوٹل کی ہر چیز فروخت کردی ہے جو اس نے آرائش کے لئے رکھ چھوڑی تھی۔"

وندا اپنا کام چھوڑ کر فوراً ہنری کے ساتھ ہوٹل کی جانب چل دی۔ نیلامی کے سامان سے انھوں نے ایک عمدہ چینی سیٹ پسند کیا۔ جب وہ اس سیٹ کو گھر لے آئے تو وندا نے خوشی سے کہا "دیکھو، دیکھو اس کے ہر حصے پر میرا نام 'ڈبلیو، ایل' لکھا ہوا ہے۔"

پیرس کے موسیقاروں نے اپنے حلقے میں وندا کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بہترین دوستوں میں اسکولا کنٹورم کا سرپرست، ونسنٹ ڈا انڈے بھی شامل تھا۔ یہ ادارہ انیس ویں صدی سے قدیم موسیقی کو رواج دینے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ وندا اس اسکولا میں اور پیرس کے دوسرے

مقامات پر کنسرٹ میں حصہ لیتی رہتی پیرس میں ہی باخ کے ایک اسکالر آندرے پیرو نے وانڈا کو ان راگوں کی صحیح ادائیگی کا فن سکھایا جو اسے بہت کم آتے تھے۔

باخ کے اصل راگ ایک ایسے ساز پر بجائے جاتے تھے جو اپنی ساخت کے اعتبار سے نصف بربط اور نصف پیانو ہوتا تھا۔ اس ساز کا نام ہارپسی کورڈ تھا اور اس میں سازوں کے دو تختے ہوتے تھے۔ وانڈا میں یہ احساس پیدا ہو چکا تھا کہ پیانو بجاتے ہوئے اس کے راگوں کی ترتیب صحیح ادا کی حامل نہیں ہوتی ہے۔

پیانو کے راگ اس کے تاروں پر ضرب لگا کر پیدا کئے جاتے ہیں۔ اور ہارپسی کورڈ کے تاروں کو جب جنبش دی جاتی ہے تو اس کے پچھلے حصہ میں یا اوپر کو اٹھے ہوئے ہارپسی کورڈ کے پرزے کی حصہ سے مضراب کی نوک چپک جاتی ہے، اس طرح ہارپسی کورڈ سے راگ پیدا ہوتا ہے۔ ہارپسی کورڈ کا استعمال اب بھی ہوتا ہے۔ لیکن بیشتر موسیقار اسے فیر مانوس قرار دیتے ہیں۔ ان کی رائے میں ہارپسی کورڈ محض دولت مند شائقین کے لئے ہے۔ کوئی دوسرا شخص اس دقیانوسی ساز کی کیونکر مائل ہو سکتا ہے؟

وانڈا نے پلیل اینڈ سائی کمپنی کے چکر لگائے اور کمپنی والوں کو ایک ہارپسی کورڈ کرائے پر دینے کے لئے آمادہ کر لیا۔ اس کمپنی نے شوپن کے ساز تیار کر رکھے تھے۔ جب اسے ہارپسی کورڈ ملا تو اسے پتہ چلا کہ اس کی مہارت پیانو سے کہیں زیادہ دشوار ہے۔ اس کی کئی زیادہ کبھی نہیں اور وانڈا کو اپنے فن میں بے حد خامی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن وہ اپنی مشق کے نتائج سے مایوس نہیں ۱۹۰۳ء میں پیرس میں منعقد ہونے والی پیانو نوازی کی ایک تقریب میں وانڈا نے آخری قسط میں ہارپسی کورڈ بھی بجایا سننے والوں نے ابھی بھی دونوں طرح کی رائے ظاہر کی۔ ایک نقاد نے اس کے اس مظاہرے پر رائے دیتے ہوئے اسے "شرمیلا اور بے سرا راگ" کہا۔ ایک دوسرے مبصر نے کہا "ہارپسی کورڈ کے استعمال سے باخ کے نغموں کو فروغ دینا ایسا ہے جیسے 'نوٹن گاپینزیٹی' میں لوگوں کی دلچسپی بڑھانے کے لئے ناٹک کے ٹکٹ گھر پر بالوں کی ... بنا دی جائے۔"

لیکن وانڈا جو کچھ کر رہی تھی، اسے اس کی کامیابی پر یقین تھا۔ اس معاملے میں ہنری

کاہم خیال تھا۔ اس نوجوان جوڑے کے پاس بعض اوقات کھانے کے لئے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ لیکن وہ دونوں خود اور ان کے خواب، ایک دوسرے کے لئے وقف تھے۔ ذہین اور زندہ دل ہنری عام مقامات پر بھی اپنی مصروفیات اور تجربات جاری رکھتا تھا۔ جب ہنری کے پاس تحقیق کا کام ہوتا تو اکثر وینڈا بھی اس کے ہمراہ لائبریریوں اور عجائب گھروں میں جایا کرتی تھی، جہاں وہ موسیقی کی تاریخ اور نغمہ نگاروں کی زندگی اور ان کے کارناموں کا مطالعہ کرتی تھی۔ اس طرح کے ہوا ۔ اپنے نغمات حقیر محسوس ہونے لگتے تھے۔

پھر جب وینڈا کا اسلوب کچھ نکھر گیا تو اس نے کنسرٹس میں ہارپسی کورڈ کے مظاہروں کی تعداد بڑھا دی۔ گو وینڈا کا قد چھوٹا تھا، لیکن اس کے حوصلے بلند تھے۔ چنانچہ اپنی اس قوت کے بھروسے پر اس نے فرانس، بلجیم، سوئٹزرلینڈ اور اسپین کے دوروں میں سامعین کے دلوں میں دھاک بٹھا دی۔ اسٹیج پر آ کر وینڈا خود کو موسیقار نہیں، بلکہ موسیقی سے محظوظ ہونے والی ایک سامع سمجھتی تھی۔ اس لئے اسٹیج پر وہ کبھی بوکھلائی نہیں۔ وینڈا اکثر کہا کرتی تھی کہ "مجھے ساز بجانے سے عشق ہے، اور موسیقی میری عظیم ترین مسرت ہے"۔

۱۹۰۵ء میں موسیقار اور انسانیت کے عظیم محسن ڈاکٹر البرٹ شیوٹزر نے وینڈا کے متعلق لکھا تھا کہ "جس کسی نے وینڈا لینڈوسکا سے ہارپسی کورڈ پر اس کا نغمہ 'اٹالین کنسرٹو' سنا ہے، وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس نغمہ کو پیانو پر کس طرح گایا جا سکتا ہے"۔

۱۹۰۷ء میں وینڈا نے روس کے ایک کنسرٹ میں شرکت کی۔ اس کنسرٹ کے بعد لیوٹالسٹائی کی بیوی کاؤنٹیس ٹالسٹائی نے وینڈا کا سراغ لگا کر اس سے ملاقات کی اور اس کے فن سے اپنی بے انتہا دلچسپی کا اظہار کر کے اس کی بے حد تعریف کی۔ انھوں نے کہا "میرے معمر شوہر کو بھی اس فن سے دلچسپی ہے۔ لیکن وہ یہاں سے کئی میل دور اپنے گھر میں صاحب فراش ہیں"۔

لنڈوسکا نے کہا، "اگر وہ ماسکو نہیں آ سکتے، تو میں ان سے ملنے وہیں چلی جاؤں گی"۔

مقررہ دن پر کاؤنٹ ٹالسٹائی نے گھوڑوں سے چلنے والی دو برف گاڑیاں بھیج دیں، جن میں سے ایک وینڈا اور ہنری کے لئے تھی، اور دوسری ہارپسی کورڈ کے لئے۔ وینڈا کی روانگی سے قبل ہی رات پالا ہو چکی تھی۔ اور تمام منظر نقرئی برف سے جگمگا رہا تھا۔ ابھی وینڈا اور ہنری، ٹالسٹائی اسٹیٹ

کے راستے ہی میں تھے کہ برف باری نے شدید طوفان کی صورت اختیار کر لی اور ڈرائیور کو گاڑی روک دینی پڑی۔ اس نے کہا "اب ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔"

"نہیں، ہم ضرور آگے بڑھیں گے" ونڈا نے احتجاج کرتے ہوئے ڈرائیور سے کہا "دیکھو، برف بہت زیادہ گہری نہیں ہے۔" پھر وہ تیزی کے ساتھ گاڑی میں سے برف پوش سڑک پر کود پڑی، اور دہشتناک گہرائی میں دھنس گئی۔ اسے ڈرائیور کا ہم خیال ہونا پڑا۔ ہنری نے مشورہ دیا کہ انھیں کسی قریبی کھیت کے مکان میں پناہ لینی چاہیئے۔

طوفان کم ہونے پر انھوں نے دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ ٹالسٹائی کا خاندان ان کے لئے فکرمند تھا۔ جب یہ دونوں وہاں پہنچے تو انھوں نے ہیر تپاک خیر مقدم کیا۔ ونڈا نے سرخوشی کے عالم میں گاڑی سے برف میں کودنے کا واقعہ سناتے ہوئے کہا، "میری اس اونچی ناک نے مجھے برف میں دھنسنے سے بچا لیا۔"

برف پگھلتے ہی ونڈا نے فرانسسکو، کوپیرین اور باخ کے راگ چھیڑ دیئے۔ جب اس نے فرانسسکو کا نغمہ، قدیم لوگوں کا رقص ختم کیا، ٹالسٹائی نے بڑبڑانے کے سے انداز میں کہا "واہ، کیا قاتلانہ حسن ہے، تمھارے نغمے میں!"

لیف ٹولسکا نے اس راگ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "پرانے لوگ رقص و سرود میں لگن رہتے تھے کہئیے آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

ونڈا کو محسوس ہوا کہ ٹالسٹائی کو موسیقی کا اس قدر ذوق ہے کہ کبھی سیری نہیں ہوتی۔ وہ ونڈا سے بار بار کہتے رہے، "ایک دن اور رک جاؤ۔ تمھارے فن کا ایک مظاہرہ اور ہو جائے۔" ٹالسٹائی کے اصرار پر ونڈا کو وہاں کئی روز تک مقیم رہنا پڑا۔

پیرس واپس آنے کے بعد ونڈا اور ہنری نے مل کر ایک کتاب لکھی، جس کا نام 'قدیم موسیقی' رکھا۔ اس کتاب میں قدیم موسیقی کو اس لئے اولیت کا درجہ نہیں دیا گیا تھا کہ اس کی حیثیت کلاسیکل سمجھی جاتی ہے، بلکہ اس لئے کہ قدیم موسیقی واقعی بے حد حسن کی حامل تھی۔ کتاب اگرچہ تمام تر عالمانہ سنجیدگی سے لکھی گئی تھی، لیکن اس میں ظرافت کا پہلو بھی برقرار رکھا گیا تھا۔

جوں جوں ونڈا ہارپسی کورڈ میں مہارت حاصل کرتی گئی، اسے ان ہارپسی کورڈوں سے بے اطمینا

محسوس ہونے لگی جو اس کے پاس موجود تھے۔ کچھ ہارپسی کورڈ تین پٹے والے اور کچھ مختلف لمبائی اور اونچائی کے ہوتے ہیں۔ ان کے تاروں میں اس طرح کا مواد ہوتا ہے جس سے مختلف طرح کے راگ نکلتے ہیں۔ لیکن وانڈا کے پاس صرف دو پٹوں والے ہارپسی کورڈ تھے، جن کی آواز زیادہ نہیں کھنچتی تھی۔

ہنری نے وانڈا کو مشورہ دیا "کیوں نہ ہم خود ایک ہارپسی کورڈ بنالیں؟"

ہارپسی کورڈ کی بناوٹ کے متعلق جو کتابیں لینڈوسکا کو مل سکیں وہ سب کی سب اس نے پڑھ ڈالیں۔ اور عجائب خانوں میں جاکر قدیم سازوں کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد اس نے تین پٹوں، سات بٹنوں اور دو کی بورڈ والے ہارپسی کورڈ کا خاکہ تیار کیا اور پلییل کمپنی بھیج گئی۔ اس نے کمپنی والوں کو اپنے ہارپسی کورڈ کے خاکے کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا: "اس کی تفصیلات باخ کی موسیقی اور میرے راگوں کے لئے بالکل ٹھیک لگتی ہیں۔"

اپنے تصورات کے مطابق ساز حاصل کرنے کے بعد لینڈوسکا، باخ کے اصولوں کے مطابق باخ کی مشق میں مصروف ہوگئی۔ وانڈا سوچتی تھی کہ موسیقی کے بانیوں نے اپنے اصل سروں کو ساز کے کتنے پردوں میں چھپا رکھا ہے۔ وہ ان سروں کو تمام تر حسن کے ساتھ حاصل کرنے کے لئے جدوجہد میں مصروف تھی۔

۱۹۱۳ء میں برلن ہوشیول فر میوزک، کے ڈائریکٹر ہرمن کریسٹر شمر نے لینڈوسکا کو ہارپسی کورڈ کی ایک کلاس پڑھانے کے لئے مدعو کیا۔ ہنری نے بھی وانڈا ہمراہ پھر اسی شہر میں جانا منظور کر لیا، جسے ایک بار وہ بے روح سمجھ کر چھوڑ چکا تھا۔

برلن میں قیام کے ایک برس بعد جنگ کے خطرات سامنے آنے لگے لیکن وانڈا اور ہنری نے برلن ہی میں قیام پذیر رہنے کا فیصلہ کیا۔ پھر پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ برلن کے سرکاری افسران نے وانڈا اور ہنری کو مطلع کیا کہ غیر ملکی ہونے کی حیثیت سے انھیں پیرول پہ چھوڑا ہوا قیدی شمار کیا جائے گا۔ حکام نے گو لینڈوسکا کو حقیقی طور پہ خلوت نشین کر دیا تھا۔ لیکن اس نے ہنری کی رفاقت اور اپنی موسیقی سے اپنی تنہائی کو خوش گوار بنالیا۔ ہنری نے بھی وانڈا کے مضمونوں میں بے تکان اس کا ساتھ دیا، اور اس کا دل بہلا کر اس کا رنج و غم مٹا دیا۔

۱۹۱۹ء میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر ہنری اور وانڈا نے خوشی خوشی پیرس واپس ہونے

کی تیاریاں شروع کر دیں۔ لیکن عین اس وقت جب وہ روانہ ہونے والے تھے ہنری موٹر کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ رنج و غم سے بدحواس لینڈ وسکا کو یوں محسوس ہوا جیسے اب پیرس جانے کا مقصد فوت ہو چکا ہے۔ ہنری نہ صرف اس کا محبوب شوہر تھا، بلکہ اس کے تمام سفروں اور مستقبل کے پروگراموں کی ترتیب و تنظیم کا نگران بھی تھا۔

باسل (سوئٹزرلینڈ) میں چونکہ سینٹ میتھیو پیشن کا پروگرام اس کی حاضری پر منحصر تھا، اس لئے اس نے اس دردناک حادثے کے صرف دو روز بعد اس پروگرام میں شامل ہونے کے لئے خود کو جبراً تیار کیا۔ باسل میں ایم اے کی کلاسیں لینے اور سلسلہ وار لیکچر دینے کے لئے اس نے بہت عرصہ تک قیام کیا۔ اس کے بعد وہ پیرس روانہ ہو گئی۔ پیرس کے دوستوں نے انتہائی جوش و خروش سے اس کی واپسی کا جشن منایا۔

کئی برس بعد وہ نڈا نے اسٹاک ہوم، لندن، قاہرہ، بوئنس آئرس جیسے مختلف ملکوں کا دورہ کیا۔ اس دورے میں اس کا ہارپسی کورڈ اور اس کی بہترین سہیلی ایلسا شونک اس کے ساتھ رہی۔ اس سفر کے دوران میں کہیں کہیں اسے ہچکولے کھاتے بادبانوں پر بھی سوار ہونا پڑا۔ ۱۹۲۵ء میں اس نے کچھ عرصہ تک فلاڈیلفیا کے کرٹس انسٹی ٹیوٹ میں موسیقی کی تعلیم دی۔ فلاڈیلفیا کے طالب علم اس کی فرانسیسی لہجے کی انگریزی اور اس کی خوش مذاقی سے بے حد محظوظ ہوتے۔ اس زمانے میں اس کی کتاب "قدیم موسیقی" انگریزی میں بھی ترجمہ ہو کر شائع ہو گئی۔

لینڈ وسکا خواہ یورپ میں رہی یا امریکہ میں۔ لیکن اس نے موسیقی کی مشق متواتر جاری رکھی وہ اپنے رفیقوں سے بھی یہی کہا کرتی تھی کہ کامیاب موسیقار اسی طرح بنا جاتا ہے۔ اس کے لئے لمحاتی تحریک کی نہیں، بلکہ مسلسل مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ وانڈا کی زندگی ہوٹل کے کمروں، ٹائم ٹیبلوں اور موسیقی کے جلسوں کی پابند ہو کر رہ گئی تھی۔ اب وہ اس زندگی سے اکتا گئی تھی، چنانچہ وہ پیرس سے دس میل شمال میں ایک چھوٹے سے قصبے "سینٹ لُوفا فورے" میں سکونت پذیر ہو گئی۔

لُو لا فورے میں وانڈا کے مکان کے گرد اینٹوں کی اونچی دیوار تھی۔ اس مکان میں اس کے ہمراہ ایک ملازمہ فرانسیسی خاتون نے ڈیتش، ریشانڈ بھی رہتی تھی۔ لینڈ وسکا نے ایک ساتھ نو کتے پال رکھے تھے اور اس نے ان کے نام موسیقی کے ارکان پر "فنٹ" "سے" وغیرہ رکھے تھے۔ کچھ کے نام موسیقی کی اصطلاحوں پر، شیمپو اور میوزیٹ وغیرہ بھی تھے۔

جو موسیقار اس سے موسیقی سیکھنے کی درخواست کرتے، ان میں سے وہ چند با صلاحیت طالب علم منتخب کر لیتی تھی۔ ان طالب علموں سے انٹرویو لے کر وہ ان کے ذوق اور جذبے کی گہرائی کا اندازہ لگا لیتی تھی۔ وہ جو امیدوار منتخب کرتی تھی ان سے کہا کرتی تھی: "آپ لوگ مسلسل مشق کی خواہش رکھیے۔ لیکن یاد رکھیے کہ مسلسل مشق کے باوجود کسی کسی خوش نصیب کو ہی کامیابی نصیب ہوتی ہے۔"

طالب علموں کے تعلق میں بھی ونڈا نے اسی دیانت، دلجمعی اور اعتماد کا مظاہرہ کیا، جو اس نے خود اپنی فنی صلاحیتوں میں کیا تھا۔ وہ اپنے شاگردوں سے کہا کرتی تھی، "میرا اعتقاد ہے کہ ہر چیز کی تکمیل اس کے کبھی ختم نہ ہونے والے حسن میں ہوتی ہے۔" اس کے شاگردوں میں فرانسس پولینس نامی ایک فرانسیسی نغمہ نگار بھی تھا۔ جس نے بعد میں ونڈا کے لئے ہارپسی کورڈ پر بجانے کے لئے نغمہ نگاری کی تھی۔

۱۰ مئی سے جولائی تک ہر اتوار کے دن لینڈوسکا موسیقی کے اپنے ذاتی ہال میں ایک پروگرام پیش کیا کرتی تھی۔ یہ ہال انگور کی بیلوں کے جھرمٹ میں نٹ یا تھ تک پھیلا ہوا تھا۔ اتوار کے دن پیرس سے سینٹ لیو کے لئے روانہ ہونے والی دو بجے کی ٹرین پر اہم ترین موسیقاروں اور موسیقی کے شائقین کا بے انتہا رش ہوتا تھا۔ اس وجہ سے پیرس کے اسٹیشن کے گارڈ اس ٹرین کو "مادام لینڈوسکا کی ٹرین" کہا کرتے تھے۔

ونڈا پورے زور سے اپنے راگ کی ابتدا کرتی تھی۔ لیکن کبھی بے سری نہیں ہوتی تھی۔ وہ خود بھی انتہائی دلفریب اور خوش مزاج تھی۔ علاوہ ازیں پروگرام کو اور بھی دلچسپ بنانے کے لئے مختلف حکایتیں، پروگرام کی تفصیلات اور اپنے باغ اور اسکاریٹی کے مظاہرین اور اپنی دھنوں پر دلچسپ تبصرے بھی سنائی جاتی تھی۔ موسیقی کی محفل کے بعد شرکاء اس کی لائبریری میں چلے جاتے تھے۔ جہاں سینکڑوں کتابیں اور ساز موجود ہوتے تھے۔ تماشائی ونڈا کے جمع کئے ہوئے پرانے سازوں کا، جن میں بہت سے ہارپسی کورڈ بھی شامل تھے۔ دلچسپی کے ساتھ جائزہ لیا کرتے تھے۔

اس پروگرام کے وقفوں میں ونڈا کلسرٹ، لیکچروں اور ریکارڈنگ میں مصروف رہتی تھی
[illegible]ستان کے چار ج سسٹم کی رسم تاج پوشی کے سلسلے بھی اس نے موزارٹ کے رسم تاج پوشی کے

راگ کی ریکارڈنگ کرائی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں وَنڈا نے پیرس کے کنسرٹ میں، گراں فیڈ ڈِسک، کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

دو برس بعد جرمنی کے ایڈولف ہٹلر نے یورپ کو، دوسری جنگ عظیم کے شعلوں میں دھکیل دیا۔ فرانس کے آسمانوں پر بمبار گرجنے لگے تھی۔ ۱۹۴۰ء میں وَنڈا نے ان توپوں کی گرج خود اپنے کانوں سے سُنی جو سینٹ لیو کے شمال میں داغی جا رہی تھیں۔ نازیوں نے جرمن اور پولستانی یہودیوں کو جلا وطن کر دیا تھیں۔ ان کا وَنڈا کو بھی علم تھا۔ فرانس میں بھی اسی طرح کی تدبیروں کا بروئے کار لایا جانا یقینی تھا۔ ان حالات میں اس نے ڈینیس سے کہا، "ہمیں یہاں سے چلا جانا چاہیے۔"

ڈینیس نے دریافت کیا، "مگر ہم کہاں جا سکتے ہیں؟"

"ہم پولائس جا سکتے ہیں۔ میرے ایک شاگرد نے پیشکش کی تھی کہ جب ضرورت ہو، میں وہاں پناہ لے سکتی ہوں۔"

لینڈوسکا کے سیکریٹری نے کار کا انتظام کر دیا۔ اس نے جلدی جلدی کچھ کپڑے منگوائے، کچھ نایاب کتابیں، نغمہ نما اور وہ اسکیچ جو اسے مصور اور سنگتراش رگسٹ روڈِن نے پیش کیے تھے اپنے ساتھ رکھ لیے۔ کار روانہ ہوئی تو راستے میں لینڈوسکا کو گھر پر چھوڑے ہوئے اپنے محبوب ہارپسی کورڈ، کتابیں اور خطوط کے ذخیرے کا خیال آگیا، اور اس کا دل بھر آیا۔

جرمن فوجوں سے بچنے کے لیے اپنے گھروں سے نکلے ہوئے ہزاروں پناہ گیروں سے سڑکیں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔

بالآخر وَنڈا اور ڈینیس پولائس پہنچ گئے، لیکن اسی رات ریڈیو نے یہ منحوس خبر نشر کی، "فرانسیسی فوجیں شکست کھا رہی ہیں ... نازی سینٹ لیو کی جانب بڑھ رہے ہیں ... پولائس پر حملہ کا اندیشہ ہے۔"

وَنڈا اور ڈینیس نے خوف زدہ چہروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور سوچنے لگے کہ اب وہ پولائس سے کیسے نکل سکیں گے؟ کیوں کہ پبلک ٹرانسپورٹ کو حکومت نے فوجی کاموں کے لئے لے رکھا تھا۔

دوسرے دن انہوں نے بےشمار گیراجوں کے چکر لگائے، لیکن ہر جگہ انہیں یہی جواب ملا کہ "ہماری تمام گاڑیاں فوجی کاموں میں لگی ہوئی ہیں۔"

آخیر میں ڈینس کو ایک ڈرائیور مل گیا، جو ایک پارٹی کو پیرس سے جا رہا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے التجا کی، "دشمن شہر کی جانب بڑھ رہا ہے۔ ایسی صورت میں کیا دوسری سمت میں سفر کرنا بہتر نہ ہوگا؟"

کچھ دیر بعد ڈرائیور نے خوف سے اپنی ٹھوڑی سہلاتے ہوئے کہا، "ہاں، ہاں"۔ صبح کے چار بجے یہ قافلہ بولائس سے روانہ ہو گیا۔

کچھ ہفتے بعد ڈینس اور وانڈا بینیلز سر مر نامی ایک گاؤں میں قیام پذیر ہو گئے، جو سپین کی سرحد کے بین شمال میں واقع تھا۔ یہاں وانڈا کے ایک سنگتراش دوست، ارسٹائڈ میلال کا مکان تھا۔ یہاں قیام پذیر ہو جانے کے کچھ عرصہ بعد تک وانڈا پر اداسی اور جمود طاری رہا۔ اس نے اپنی زندگی موسیقی کے لیے وقف کر رکھی تھی، لیکن اب نہ اس کے پاس پیانو تھا اور نہ ہارپسی کورڈ، نہ نغمہ نما تھے اور نہ کتابیں۔ زندگی میں اب کیا باقی رہ گیا تھا؟

لیکن اس جمود کے عالم میں بھی وانڈا میں بے انتہا تخلیقی تحریک موجود تھی۔ ایک دن اسے پتہ چلا کہ اس گھر کے مالک کے پاس ایک چھوٹا سا قدیم عمودی طرز کا پیانو موجود ہے، جسے وہ استعمال کر سکتی ہے۔ اس نے خوش ہو کر کہا، "میں دوبارہ اپنی زندگی بنالوں گی۔" اور اس رات کے بیشتر حصہ میں وہ اس پیانو کو بجاتی رہی۔ یہ پیانو اگرچہ پریشان کن حد تک ناقابلِ عمل تھا، لیکن اس نے کئی ہفتوں تک پورے انہماک سے اسی پر اپنی مشق جاری رکھی۔

۱۹۴۰ء کے اکتوبر میں اسے ایک پوسٹ کارڈ موصول ہوا، جس میں ایسے اشارے موجود تھے، جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ سینٹ لیو میں بھیانک واقعات ہوئے ہیں۔ اس وقت تک اس عارضی صلح نامے پر دستخط ہو چکے تھے، جس کے مطابق فرانس کا نصف شمالی حصہ جرمن نازیوں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ ڈینس نے فیصلہ کیا کہ وہ سینٹ لیو کے متعلق موصولہ اطلاع کی تصدیق کے لیے خود وہاں جائے۔ بینیلز واپس پہنچنے کے لیے ڈینس کو مقبوضہ اور آزاد فرانس کی سرحد غیر قانونی طور پر پار کرنی پڑی۔ واپس پہنچ کر اس نے بتایا، "سینٹ لیو کو جرمن نازیوں نے بالکل تاراج کر دیا ہے۔"

وانڈا نے ملتجی ہو کر پوچھا، "میرا ہارپسی کورڈ... میرے نغمہ نما؟"

"بحری جہازوں میں لاد کر جرمنی بھیج دیے گئے۔" ڈینس نے انتہائی رنج و غم کے ساتھ کہا، "اور تمہاری کتابیں بھی۔ مکان پر بھی فوجیوں کا قبضہ ہے۔"

"کیا کنسرٹ ہال بھی ان کے قبضہ میں ہے؟" لینڈوسکا نے پوچھا۔

"اسے سپاہی ڈپو کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔"

ونڈا کے ہارپسی کورڈوں کی بربادی کا حال سن کر اس کے ایک شاگرد نے اسے کچھ رقم فراہم کی تاکہ وہ پلییل کمپنی کے اسٹاک میں بچا ہوا آخری ہارپسی کورڈ خرید سکے۔ یہ نو خرید ہارپسی کورڈ اس کے اپنے ہارپسی کورڈ کے مقابلے میں بہت معمولی تھا، لیکن ونڈا شکر کر رہی تھی کہ بہر حال کسی قسم کا ساز اسے مل تو گیا۔

ایک دن سنہری بالوں والی ایک حسین عورت لینڈوسکا سے ملنے آئی اور اس سے کہا، "آپ نے میری جان بچائی ہے، میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں نے — میں نے آپ کی جان بچائی!" لینڈوسکا نے حیرت زدہ اور بدحواس ہو کر اسی عورت کے الفاظ دہرا دیئے۔

"میں نے خودکشی کا منصوبہ بنایا تھا۔" اس عورت نے وضاحت کی۔

"بڑے افسوس کی بات ہے۔" لینڈوسکا نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنے ہاتھوں میں ریوالور بھی سنبھال لیا تھا۔" اس عورت نے آپ کے ساتھ اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا، "لیکن اسی لمحے آپ کے باجے کے ریکارڈ 'گولڈ برگ ویریشنز' کی صدا کانوں میں آگئی۔ اس کی موسیقی اس قدر عظیم تھی کہ میں نے اپنا ریوالور پھینک دیا۔"

لینڈوسکا بے حد خوش ہوئی کہ اس کی موسیقی اس قدر اثر کر سکتی ہے۔ اس نے مسکرا کر انتہائی انکسار کے ساتھ اس عورت سے کہا، "آپ نے جو کچھ بتایا، اس سے مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔"

اس عورت نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "جنگ کے باوجود میرے حالات بہت اچھے ہیں۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کو امریکہ کے سفر کے لیے کچھ رقم پیش کر سکوں۔"

یہ بات سن کر لینڈوسکا کے تصورات میں ایک ایسا ملک ابھر آیا، جہاں جا کر اسے کنسرٹ منعقد کرنے اور موسیقی سننے سنانے کی آزادی مل سکتی تھی۔ وہ اس ملک کے خوابوں میں ڈوب گئی۔ پھر اس نے اس فیاضانہ پیشکش سے مغلوب ہو کر کہا، "اب میری باری ہے کہ میں آپ کا شکریہ ادا کر دوں۔"

ونڈا اور ڈینس کسی فرانسیسی بندرگاہ سے جہاز پر سوار نہیں ہو سکتی تھیں اس لیے وہ دونوں ہارپسی کورڈ سمیت لزبن روانہ ہو گئے۔ جب لزبن سے ان کا جہاز روانہ ہوا، اس وقت تک امریکہ ایک

لیکن جب ان کا جہاز نیو یارک کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا، اس وقت تک نازیوں نے پرل ہاربر پر حملہ کر کے ریاستہائے متحدہ امریکہ کو جبراً جنگِ عظیم میں دھکیل دیا تھا۔ ترکِ وطن کر کے امریکہ آنے والے لوگوں کی نگرانی کرنے والے افسر پردیسیوں کا سختی سے جائزہ لے رہے تھے، چنانچہ وانڈا اور ڈینس کو بھی ایلیس آئی لینڈ میں نظر بند کر دیا گیا۔

ان دونوں کی حالت زار سنکر پرستانی اور فرانسیسی کونسل کے اثر و رسوخ سے وانڈا کو ذاتی شہر کی باثر ہستیوں سے اُن کے لئے سفارشی خطوط حاصل کئے۔ ان لوگوں نے لینڈوسکا کی اہمیت اور دیانتداری کی تصدیق کر دی۔ چنانچہ کچھ ہی عرصہ بعد لینڈوسکا اور ڈینس کو رہا کر دیا گیا۔

وانڈا کو تین سو ڈالر سے کچھ کم کی نقد امداد بھی مل گئی۔ ان دونوں نے ٹائمز اسکوائر کے ایک معمولی سے ہوٹل میں کمرہ لے لیا۔ وانڈا کے دوستوں نے ۲۱ فروری ۱۹۴۲ء کو ٹاؤن ہال میں اس کے ایک کنسرٹ کا اہتمام کیا۔ اس کنسرٹ کے خاتمے پر وانڈا کو محسوس ہوا کہ وہ سب کچھ، جس کی وجہ سے سینٹ ہیوسے اسے عشق تھا، دوبارہ امریکہ میں ابھر آسکتا ہے۔

اس کنسرٹ کی آمدنی سے وانڈا نے سینٹرل پارک ویسٹ پر ایک بلڈنگ میں پرانے طرز کا ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ اور اسی سکونتی کمرے میں موسیقی کی کلاسیں شروع کر دیں۔

"اب ہر چیز ارتقا پذیر ہے۔" وانڈا نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ "شاگرد، کنسرٹ، دوست، سب کچھ مل گیا ہے۔ میری زندگی امریکہ میں دوبارہ شروع ہو رہی ہے۔"

ریاستہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے مختلف شہروں میں وانڈا نے پیانو اور ہارپسی کورڈ کے بہترین مظاہرے کئے۔ اپنی شخصیت کو اور زیادہ پُر تاثر بنانے کے لیے وہ سُرخ مخمل کے لہراتے ہوئے گاؤن اور اسی رنگ کے بیلے کے سلیپر پہنے ہوئے، لہراتی ہوئی اسٹیج پر آتی اور اونچی پشت والی انوکھے طرز کی ایک کرسی پر بیٹھ جاتی تھی۔ پھر جیسے ہی وہ اپنے ہارپسی کورڈ کے قریب کے لیمپ کی روشنی کم کرتی تھی تو سامعین کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ازمنۂ وسطیٰ کے ماحول میں پہنچ گئے ہیں۔ لیکن اپنے فن کے مظاہروں کے درمیان لینڈوسکا اپنے سامعین سے جو گفتگو کرتی تھی، اس میں کسی قسم کی ندامت مترشح نہیں ہوتی تھی۔ وہ سامعین سے کہا کرتی تھی" میں نے اپنے فن کو آپ کی مسرت اور آپ کے ذوق کے مطابق بنانے کے لیے شدید محنت کی ہے۔"

جب تک بہت زیادہ مجمع نہ ہو جاتا، وہ اپنا سازو شروع نہیں کرتی تھی۔ موسیقی کے ناقد ورجل تھامپسن نے اس کے متعلق رائے دیتے ہوئے کہا تھا، "وَنڈا خواہ کوئی بھی ساز بجائے صوتیاتی فن کے شائقین کے لئے وہ عظیم ترین اور اعلیٰ ترین تجربہ کی حیثیت رکھتا ہے۔"

لینڈوسکا کو اب بھی فرانس سے بے حد محبت تھی۔ چنانچہ اس نے برلن میں اپنی طالب علمی کے زمانے کے ایک گانے پر "آزادی کا بگل" کے نام سے ایک جوشیلا راگ تیار کیا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ فرانس کی فوجیں پیش قدمی کے وقت اس کے اسی راگ کو بلند تر آہنگ کے ساتھ بجاتی ہیں تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

جرمنی کی شکست کے فوراً بعد یورپ میں امریکی فوج کے ساتھ قیام پذیر لیفٹیننٹ ڈوڈر کونر یڈ کو لینڈوسکا کا محبوب ہارپسی کورڈ دستیاب ہو گیا۔ اس نے بحری جہاز کے ذریعہ اسے وَنڈا کے پاس بھیج دیا۔ اس کے بعد فوجی سپاہیوں کو آسٹریا میں نمک کی ایک کان سے وَنڈا کے بہت سے دوسرے ساز بھی دستیاب ہو گئے۔ لیکن یہ سب کے سب ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔

جب فرانس کے حالات سدھرنے لگے تو وَنڈا کے دوستوں نے اسے کم از کم ایک بار فرانس واپس آنے کے لئے اکسایا۔ وَنڈا نے جوش میں آ کر یورپ کے تین ماہ کے دورے کا ایک پروگرام بنا ڈالا لیکن بعد میں اسے احساس ہوا کہ اس کا منصوبہ کچھ زیادہ بڑا ہے۔ چنانچہ پرانے مناظر اور پرانے دوستوں سے لطف اندوز ہونے کی شدید خواہش کے باوجود اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کی ایک محبوب ترین سہیلی ایلیسا شومک تو اس کے اور ڈینیس کے ساتھ رہنے کے لیے امریکہ ہی پہنچ گئی تھی۔ وَنڈا ان دونوں سہیلیوں کو بے حد چاہتی تھی۔ وہ بھی وَنڈا سے بے حد محبت کرتی تھیں، اور انتہائی سوجھ بوجھ کی حامل تھیں۔ وَنڈا نے بھی کبھی بے رخی یا خود غرضی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

جب آر۔ سی۔ اے وکٹر نے ستر سالہ لینڈوسکا سے افتتاحی نغمات اور کثیر الآہنگ موسیقی کی ریکارڈنگ کے لئے درخواست کی تو وَنڈا کو محسوس ہوا کہ اب وہ اپنے مستقبل کی ایک فیصلہ کن منزل تک پہنچ گئی ہے۔ ان کثیر الآہنگ والے نغمات سے باخ کے نغموں کی تشکیل ہوتی تھی۔ اب وہ ایک ایسی منزل پر پہنچ چکی تھی کہ کنسرٹ جاری رکھ کر عوام کے مطالبات کی تکمیل بھی کر سکتی تھی۔ اور چاہتی تو یکسوئی کے ساتھ ریکارڈنگ میں مصروف ہو کر کم و بیش خلوت نشین بھی ہو سکتی تھی۔

اس نے اپنے ایجنٹ کو بتایا تھا، "میں نے اپنی زندگی میں بے انتہا سفر کئے ہیں۔" وہ کسی بھی 'دی ویل ٹیمپرڈ کلیویئر' کی ریکارڈنگ سے قبل انتہائی غور و فکر کے ساتھ ایک ایک سُر کی مشق کرتی تھی۔ خواہ اسے ایک سُر کو ہزاروں بار دہرانا پڑتا، لیکن وہ ہر آہنگ کو پورے انہماک اور غور و فکر سے تیار کرتی تھی۔

۱۹۴۹ء کی ابتدائی گرمیوں میں۔ ہر شنبہ کو وہ ریکارڈنگ کے لئے آر سی اے وکٹر کے مین ہٹن اسٹوڈیو میں پہنچ جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ڈینس ہاریسی کورڈ کی جانچ پڑتال کرتا اور ایلسا دیگر عملی انتظامات میں مصروف رہتی تھی ہاریسی کورڈ کے سامنے بیٹھ کر وانڈا اپنا افتتاحی نغمہ شروع کرتے ہوئے مذاحیہ انداز میں کہتی، "مادر باخ کی کھوپڑی شکل و شباہت اور بھاری بھرکم ٹوپی سے رعب میں مت آنا۔"

ریکارڈنگ کے درمیان میں لینڈوسکا سینڈوچز اور کالی یا ہور ہاؤنڈ* کے کچھ قطرے پینے کے لئے رک جاتی تھی۔ ہور ہاؤنڈ کا بپارہ ایلسا اپنے پاس رکھا کرتی تھی۔ اس تمام ریکارڈنگ میں لینڈوسکا نے اپنی خواہش کے مطابق انتہائی متوازن اور معیاری فنی بصیرت کا اظہار کیا۔ پینتالیس منٹ کی موسیقی کی ریکارڈنگ میں اس نے بیالیس گھنٹے صرف کئے، کیوں کہ ناپسندیدہ مواقع پر وہ ریکارڈ شدہ حصوں کو رد کر کے دوبارہ ریکارڈ کرایا کرتی تھی اس وجہ سے اس ریکارڈنگ میں اتنا وقت صرف ہوا کرتا۔ ایک بار لینڈوسکا نے اپنا ایک پلے بیک سن کر اسٹوڈیو کے ایک انجینئر سے طنز بہ طور پر کہا تھا میری آواز میں ابھی ۷۰ وی موزیر کی سی تاب اور جوش موجود ہے"

سخت جانفشانی کے ساتھ ریکارڈنگ کرانے یا مشق کرنے کے بعد، لینڈوسکا تفریح کے لئے رات کو دیر تک ٹہلنا پسند کرتی تھی، لیکن اکثر ایسا ہوتا تھا کہ رات کی چہل قدمی کے دوران میں سینٹرل پارک میں اسے پولیس والے روک لیتے اور تند لہجے میں سوالات کرنے لگتے تھے۔ ایک بار تو اسے ذرا دھمکا کر پوچھ گچھ کے لئے پولیس اسٹیشن بھی لے جایا گیا تھا۔ وانڈا لا محدود کمرے میں سانس لینے کی خواہش مند تھی، چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ اب اسے نیویارک چھوڑ دینا چاہیئے۔

---

* ایک بوٹی جس کا عرق تلخ اور خوشبو دار ہوتا ہے، اور کھانسی کے لئے مفید ہوتا ہے۔

پھر وہ ڈینس اور ایک کو لے کر لیک ویل (کنکٹیکٹ) میں پہاڑی کی چوٹی پر واقع ایک سادہ
لیکن کشادہ مکان میں منتقل ہو گئی۔ یہاں آ کر لینڈوسکا نے موسیقی کی تشریحات لکھیں، چند صلاحیت مند
شاگردوں کو تعلیم دی اور کبھی کبھی کنسرٹ منعقد کر کے اپنے فن کے مظاہرے کئے۔ وانڈا کے مکان پر
کلاسیکی ریکارڈنگ کے انتظامات کے لئے ماہرین نے اس کی لکڑی کی دیواروں والی اونچی چھت کی
لائبریری کو ساؤنڈ پروف بنا دیا اور اس میں قیمتی مشینیں نصب کر دیں۔ ہفتوں تک چلنے
والی ریکارڈنگ کے لئے آر سی اے والے، ایک انجینئر کے ہمراہ پورٹیبل مشینیں ٹرک پر لاد کر اس کے
مکان پر پہنچا دیتے تھے۔

سردیوں کے موسم میں لائبریری کا کمرہ سرد رہتا تھا، کیوں کہ ریکارڈنگ سے قبل آتشدان
کو سرد کر دینا پڑتا تھا، کیوں کہ اس کا شور ریکارڈنگ پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔ اس سرد
ماحول میں خود کو سنبھالے رکھنے کے لئے وانڈا اونی موزے اور سرخ رنگ کا گرم لباس پہن لیتی تھی
دی ٹمپرڈ کلیویئر کی ریکارڈنگ میں وانڈا کے چار برس صرف ہو گئے۔ لیکن اس
کی کوششوں سے دنیائے موسیقی کو ایک بے مثال ورثہ میسر آ گیا۔ اس سے قبل ذہانت،
تخیل، شوکتِ الفاظ اور توازن کا ایسا عظیم الشان مجموعہ کبھی محفوظ نہیں ہو سکا تھا۔ ان ریکارڈز
کو سن کر ایک سامع نے وانڈا کے ساحرانہ انفرادیت اور اس کے فن کی وسعتوں کے متعلق جب وانڈا
سے گفتگو کی تو اس نے کہا، "میں جس قدر وسعتیں حاصل کرتی ہوں، ان کے مطابق اپنے
آپ پر قابو بھی رکھتی ہوں"۔ اس کی یہ فنی خود مختاری نصف صدی کے غور و فکر، تحقیق اور علم
و دانش کی سخت ضابطہ پرستی کا نتیجہ تھی۔

ایک بار ریکارڈنگ کے دوران میں ایک انجینئر نے لینڈوسکا کے طربیہ جوہر سے متاثر
ہو کر اس سے دریافت کیا، "آپ ٹیلی ویژن میں شمولیت کیوں نہیں کرتیں؟"
وانڈا نے طنزیہ انداز میں کہا، "ٹیلی ویژن — مجھے ٹیلی ویژن کہاں میسر ہو سکتا ہے"
لیکن ۱۹۵۳ء میں ٹیلی ویژن والے خود اس کے میک ووڈ کے گھر پر حاضر ہوئے
وانڈا بڑی نزاکت سے، کسی ملکہ کی طرح ہارپسی کارڈ کے سامنے بیٹھ گئی۔ اور اس موقع سے
ساز چھیڑا جیسے دیکھنے والے کے خیال میں ڈوبی ہوئی ہو۔ اس کے چہرے کے تاثرات نے

ٹیلی ویژن دیکھنے والوں کو اس کے شکرے جیسے چپٹے چہرے کی طرف متوجہ ہونے سے باز رکھا۔ اس کی توضیحات بھی اس کے سادہ جوڑے کی طرح سادہ پُرکار تھیں۔ اس کے جوڑے میں سیاہ چمک دار بال انتہائی سادگی و پرکاری سے گندھے ہوئے تھے۔ ان میں کہیں کہیں سفید دھاریاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ وانڈا نے ٹیلی ویژن پر موسیقی کے متعلق، اپنے ہارپسی کورڈ اور خود اپنے متعلق ایسے غیر رسمی بے لاگ انداز سے گفتگو کی جیسے وہ اپنے دوستوں کے درمیان خوش گپی میں مشغول ہو۔

ظاہر ہے کہ لینڈوسکا کو کوئی بہروپ بھرنے کی ضرورت نہیں تھی، وہ اپنے سامع کو اپنی خوبیوں سے ہی متاثر کر سکتی تھی۔ ٹیلی ویژن پر اپنی اسی گفتگو میں اس نے کہا تھا، "لوگ مجھے جمال پرست قرار دیتے ہیں، لیکن میں تو محض ایک سادہ سی عورت ہوں، ایسی عورت جسے موسیقی سے عشق ہے۔" اس کے بعد بھی لینڈوسکا کئی بار ٹیلی ویژن پر پیش ہوئی۔ اور کولمبیا ریڈیو نے 'موسیقی کی کھوج' کے عنوان سے اس پر ایک سلسلہ وار فیچر بھی نشر کیا۔

اس کے بعد لینڈوسکا نے تصنیف و تالیف اور تحقیق و تدریس کا کام جاری رکھا۔ وانڈا اپنے شاگردوں کو یا کرتی تھی کہ انہیں ساز کے پردوں پر انگلیوں کی روانی، نقطۂ عروج کے لمحوں کا تعین اور آہنگ پر ری طرح زور دینا چاہیے۔ وہ انہیں ہدایت کرتے ہوئے کہتی، "اپنے ذہن اور احساس کی تمام تر گیرائی اور انی سے اس طرح ساز بجاؤ کہ ساز کے تختے کو نغمہ کا لطف میسر آ جائے۔" تدریس کے دوران میں کبھی کبھی وہ سیقی کے فلسفے پر بھی تھوڑی بہت بحث کرتی تھی۔

ایک بار اپنے ایک شاگرد کو پرانے واقعات سناتے ہوئے اس نے وہ واقعہ سنایا جب وہ ہنری کی ہمراہی ں ٹالسٹائی سے ملاقات کے لئے جا رہی تھی، اور بیوقوفی سے برف کے طوفان میں گھر گئی تھی۔ "زندگی میں ہمیں اتنیاؤں سے سابقہ پڑتا ہے" اس نے اپنے شاگرد کو سمجھایا، "ہمیں دروازوں سے دست و گریباں نہیں ہونا چاہیے۔ تو خود بخود کھل جاتے ہیں۔"

لینڈوسکا کو خود بخود کھل جانے والے بہت سے دروازے ملے تھے۔ اس کی قابلیت کو خراج عقیدت کرنے کے لئے موسیقار والٹر پسٹن نے وائلن اور ہارپسی کورڈ کے لئے ایک سوناٹا ترتیب دیا۔ مینول ڈی فال نے بھی خیال سے ایک نغمہ "ہارپسی کورڈ کنسرٹو" کے نام سے تیار کیا۔ ٹیلی ویژن پر اس کی آمد اور اس کے کنسرٹ اور ریکارڈنگ شات۔ وانڈا کی فنی تکمیل یہ سب کچھ اس کی کامرانی کے وہ دروازے تھے جو خود بخود وا ہوئے تھے۔ اس کے شاگردوں ے ایلیس اہلرس اور سلویا مارلو نے ہارپسی کورڈ کے رواج کو عام کرنے اور اسے مقبول ساز بنانے کیلئے کافی کام کیا

ز کا ایک راگ جس میں کئی آہنگ ہوتے ہیں لیکن سب کا سر ایک جیسا ہوتا ہے۔

لینڈوسکا کے شاگردوں میں آنٹی شا اور روزمیری کلونی نے ہارپسی کورڈ کے مشترکہ آہنگ کے بہت سے راگ گائے۔ کالجوں نے موسیقی کے شعبوں میں ہارپسی کورڈ کی مہارت کے کورس شروع کردیئے۔ ہارپسی کورڈ نوازوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے لینڈوسکا کو بے حد خوشی ہوتی تھی۔ لیکن اس بڑھتی ہوئی مقبولیت سے اس کے دل میں کچھ اندیشے بھی پیدا ہوگئے تھے۔ ان اندیشوں کی نشان دہی کرتے ہوئے اس نے ایک بار کہا تھا: "کچھ لوگ اس ساز کے حقیقی کردار اور اس کے جوہروں کو غلط طریقے پر پیش کرتے ہیں۔"

۱۹۵۶ء میں لینڈوسکا نے اپنی روزانہ کی مشقوں میں پیانو کو بھی شامل کرلیا تھا۔ سب سے پہلے اس کا تعلق پیانو ہی سے ہوا تھا۔ وہ مدت تک اس کی مشق کرتی رہی، تاکہ موزار کے کچھ بہترین نغمات ریکارڈ کرا سکے۔ اس وقت تک لینڈوسکا کی انگلیوں میں رعشہ نمایاں ہونے لگا تھا لیکن اس کے باوجود اس کے سروں کی پاکیزگی سننے والوں کے دل جیت لیتی تھی۔

ایک بار کسی شخص نے لینڈوسکا سے کہا: "اب تو واقعی آپ کو روزمرہ مشق کی ضرورت نہیں رہی۔ اب تو آپ اپنے فن کے کمال کو پہنچ چکی ہیں۔"

لیکن لینڈوسکا ایک باکمال فن کار کی حیثیت سے اپنا ذکر سننا کبھی پسند نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ انتہائے کمال کو وہ فن کی سرحد منزل سمجھتی تھی۔ چنانچہ اس نے جواب دیتے ہوئے کہا:

"میں اس وقت تک مشق جاری رکھوں گی، جب تک کہ میرا تعلق اس فن سے باقی رہے گا۔"

اب لینڈوسکا پر رفتہ رفتہ ضعیف العمری اثر انداز ہوتی جارہی تھی، لیکن وہ پوری مستعدی کے ساتھ اپنے ضابطے پر قائم تھی۔ وہ صبح آٹھ بجے بستر سے اٹھ کھڑی ہوتی۔ ڈینس ایلسا اس کے لئے کافی بنا کر لاتی۔ اور وہ کافی پی کر خطوط لکھنے بیٹھ جاتی تھی۔ پھر انجیر، کھجور اور سلاد کے ناشتے سے فارغ ہو کر ہارپسی کورڈ یا پیانو پر بیٹھ جاتی اور گھنٹوں مشق کرتی رہتی تھی۔ کام کے طویل عرصے کے بعد وہ چہل قدمی کے لئے نکل جاتی تھی۔ اس کے اس دستور پر نہ بارش اثر انداز ہوتی اور نہ سردی۔ سردیوں کے موسم میں وہ کئی چادریں اوڑھ کر اور اوور کوٹ پہن کر ٹہلنے جایا کرتی تھی۔ ٹہلتے ہوئے وہ اپنے کوٹ کی آستینوں میں اپنے ہاتھوں کو اس طرح چھپالیتی جیسے چینی عالم اپنے چوغے میں ہاتھ چھپائے رہتے ہیں۔

چہل قدمی کرتے ہوئے وہ کبھی کبھی دوستوں سے بات چیت کرنے کے لئے راہ میں رک جایا کرتی تھی۔ اس کے دوستوں میں ایک معمر بڑھی بھی تھا۔ یہ بڑھی چونکہ ایک صنعت کار تھا اس لئے اپنے پیشے سے ایسا ہی عشق رکھتا تھا جیسے لینڈ ووسکا موسیقی سے۔ اپنے اپنے فن کے یہ دونوں ماہرین ایک دوسرے کو خوب جانتے تھے۔ اس بڑھی یا کسی اور دوست سے گپ شپ کر کے لینڈ ووسکا عام طور پر ترائی کی جانب نکل جاتی تھی۔ جسمانی اعتبار سے اگرچہ وہ کمزور تھی لیکن اس میں اب بھی لچک موجود تھی۔ اور خود اپنے سے تہائی عمر کے لوگوں سے زیادہ پھرتی کے ساتھ چڑھائی پر چڑھ جاتی تھی۔ اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہ اس وقت گھر لوٹا کرتی تھی، جب اسے بھنے ہوئے گوشت، پھل اور سبزیوں کی شدت سے بھوک محسوس ہونے لگتی تھی۔

شام کے اوقات میں وہ موسیقی کی مشق، راگوں کی ترتیب و تخلیق اور مطالعے میں مصروف رہتی یا پھر دوستوں سے ایسی انگریزی میں بات چیت کرتی تھی، جس میں کہیں کہیں فرانسیسی جملے بھی شامل ہوتے تھے۔ ہمیشہ خوش مزاج رہنے والی لینڈ ووسکا نے ایک بار انسانی زندگی کی نوعیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا، "اگر ہمارے پاس موسیقی موجود ہے تو یہ دنیا مایوسیوں کی جگہ کیوں کر ہو سکتی ہے؟" بیشتر راتوں میں جب پورا سینٹ لیو نیز کے آغوش میں گم ہو جاتا تھا، لینڈ ووسکا کی کھڑکی میں سے ایک روشنی چمکتی ہوئی نظر آتی تھی۔

تھوڑے تھوڑے عرصہ بعد اخباری نمائندے اور انٹرویو لینے والے ملاقات کے لئے آتے رہتے تھے۔ ان سے لینڈ ووسکا نہایت خلوص، دیانت داری اور ذہانت کے ساتھ پیش آتی تھی۔ ایک موقع پر اس نے اپنی کامرانی تسلیم کرتے ہوئے کندھے اچکا کر کہا تھا، "لیکن اس کا مطلب نہیں ہے کہ میں اپنے آپ سے مطمئن ہو چکی ہوں۔ ابھی تو مجھے بہت کچھ سیکھنا ہے۔"

ایک بار ایک اخبار نویس نے اس سے سوال کیا، "کیا آپ کو یہ ملک پسند ہے؟"
اس نے یہ سوچتے ہوئے کہ یہاں وہ اپنی موسیقی، اپنے گھر اور اپنے متعلقین کے ساتھ فارغ البالی سے ہم کنار رہی ہے، اس نے پرجوش لہجے میں اخبار نویس کو جواب دیا، "مجھے امریکہ سے عشق ہے۔"

اسی برس کی عمر میں بھی لینڈ ووسکا تندرست، خوش مزاج اور چاق چوبند تھی اور شاذ و نادر

بھی اپنی مصروفیات ترک کیا کرتی تھی۔ لیکن اگست ۱۹۵۹ء میں اس پر فالج کا حملہ ہوا اور کچھ عرصہ بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

لینڈوسکا جس طرح اپنے اصولوں پہ کاربند رہی، دنیائے موسیقی میں اس کی مثال مشکل سے ہی ملے گی۔ اپنے اسی استحکام کے سبب اس نے ہارپسی کورڈ اور ماضی کی موسیقی پر بے مثال فتح حاصل کی۔ اس نے تمام زندگی اس معصوم لڑکی کے اعتماد کو پیش نظر رکھا جس نے ایک بار بچپن میں ایک کاغذ پہ لکھا تھا، "میرے خوابوں میں صرف یہی ایک چیز بسی ہوئی ہے کہ میں باخ کے راگ بجا سکوں۔"

وانڈا لینڈوسکا نے نہ صرف دیگر ہارپسی کورڈ نوازوں کی نسبت امتیاز و برتری حاصل کی، بلکہ وہ شرافتِ نفس، سادگی اور ایثار میں بھی بہت سی شخصیتوں سے آگے تھی۔ اس نے زندگی اور موسیقی کے حسن سے یکساں طور پر عشق کیا، اس کی خصوصیت، اس کا یہ اعتماد تھا کہ وہ کسی شے کی پرستش کرتی ہے۔ ایک بار اس نے کہا تھا، "وہ لوگ جن کی روح میں کوئی احساس جاگزیں نہیں ہوتا، وہ مفلس ہوتے ہیں۔ لیکن وہ مرد یا عورتیں جنھیں کسی چیز کے حسن کا کامل یقین ہو، صاحب ثروت ہوتے ہیں اور وہی ہماری زندگی کی مایوسیوں کو دور کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔"



(۵)

آئی وی بیکر پریسٹ

دنیا کے عظیم ترین بنک کی خزانچی

ریاست ہائے متحدہ کے خزانچی کا عہدہ سنبھالنے کے برسوں بعد جب آئی وی بیکر پریسٹ اپنے پرانے قصبے بنگھم کینین (۱۹۱۵) واپس آئی تو اس نے اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے وہ استقبالیہ بورڈ دیکھے، جن پر تحریر تھا "آئی وی بیکر پریسٹ کو اپنے وطن آنا مبارک ہو" قصبہ والوں نے کھلی جگہ میں اس کے لئے ایک استقبالیہ جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ اس جلسہ میں میئر ایڈ جانسن نے اسے ایک اسکارف پن پیش کیا جو مقامی کان کنوں کے ماڈل کے طور پر استعمال میں آنے والے صنعتی پتھر کے ٹکڑوں سے بنایا گیا تھا۔ جلسے کے اختتام پر اس کے سابق ہم سبق دوست، اخبار نویس اور آٹوگراف لینے والوں کا مجمع اس کے گرد جمع ہو گیا۔

اس کے بعد مسز پریسٹ کینے کوٹ کی تانبہ کی کان میں، کمپنی کے کارکنوں کو سیونگ بانڈ انعامات پیش کرنے کے لئے روانہ ہو گئی۔ تقریر کے دوران میں اس نے دیکھا کہ سامعین کے چہرے فخر و مسرت اور تعظیم کے احساس سے دمک رہے تھے۔ ان لوگوں میں اس کے کان کن باپ کے بہت سے دوست بھی شامل تھے۔

تقریر کے بعد اپنی کار میں بیٹھ کر واپس آتے ہوئے مسز پریسٹ نے محسوس کیا کہ وطن میں واپس آکر اس کی جو پذیرائی ہوئی ہے، وہ اس کے بچپن کے خوابوں پر بھی سبقت لے گئی۔ پریسٹ کے ذہن میں، ماضی کے وہ تمام واقعات گھومنے لگے، جب اسے ضروریات زندگی بھی میسر نہیں آتی تھیں اور اپنے بوسیدہ کپڑوں کے باعث اسے سخت شرمندگی اٹھانی پڑتی تھی۔ پھر اس کے ذہن میں تصورات

کی وہ تمام پرچھائیاں ابھریں کہ کس طرح اس نے دولت و شہرت حاصل کی اور کس طرح باوقار شخصیت بن کر وہ آج بگھم واپس آئی تھی۔ لیکن ابتدائی عمر میں اسے کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ ایک دن وہ دنیا کے عظیم ترین بنک کے خزانچی کا عہدہ حاصل کرے گی۔

مسز پریسٹ کی یہ محویت اس وقت ختم ہوئی جب اس نے خود کو ان بچوں کے مجمع میں گھرا ہوا پایا جو ڈالر بلوں پر اس سے آٹو گراف لینا چاہتے تھے۔

اس مجمع میں سے ایک اطالوی لڑکی نے شرماتے ہوئے پوچھا "آپ کے خیال میں کیا میں بھی ریاستہائے متحدہ کی خزانچی بن سکتی ہوں؟"

"یقیناً" مسز پریسٹ نے کہا "تم بھی میری طرح خزانچی بن سکتی ہو"

آئی وی بیکر نے ۷ ستمبر ۱۹۰۵ء کو کمبرے (اُٹاہ) میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کی پیدائش کے وقت آئی وی کے والدین سخت مشکلات میں مبتلا تھے۔ اس کا باپ اورینج ڈیکیٹر بیکر سولہ افراد کے ایک مارمن قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی تعلیم تو صرف پانچویں جماعت تک تھی۔ لیکن ڈیکیٹر بیکر نے اپنے طور پر مطالعہ کر کے اپنی استعداد بڑھالی تھی۔ اس چوڑے چکلے کندھوں والے کان کن کو کچیس برس کی عمر میں، مارمن فرقہ کے رواج کے مطابق دو برس کے لئے رضاکارانہ طور پر مذہبی تعلیم کے لئے برٹش آئیلز جانا پڑا تھا اس سفر کے دوران میں وہ پارک شائر میں گارا بنانے والی کی دختر کلیرا فرنلے کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کلیرا چھریرے بدن کی ایک نازک اندام لڑکی تھی۔ ان کا نانیہ بچپن میں ہی اس کے سر سے اٹھ گیا تھا۔ کلیرا گو گھریلو ملازم کے طور پر کام کرتی تھی، لیکن اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اسکاٹ لینڈ کے شاہی اسٹوارٹ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ کلیرا زندگی کی نزاکتوں کے معاملہ میں انتہائی حساس تھی۔ شادی کے بعد بیکر اور کلیرا نے اُٹاہ میں سکونت اختیار کرلی۔ کلیرا اگرچہ انگلستانی کلیسا کی رکن تھی، لیکن اس نے خوش دلی کے ساتھ اپنے بچوں کو مارمن فرقہ کے عقائد کے مطابق پرورش کرنا منظور کر لیا تھا۔

آئی وی کے بچپن میں یہ خاندان کئی بار اُٹاہ کے کان کنوں کے چھوٹے چھوٹے قریوں میں چکر لگاتا رہا ۱۹۱۲ء میں یہ خاندان گراس کریک میں مقیم تھا۔ ایک اتوار کو سہ پہر کے وقت آئی وی اپنے گھر کے باہر میدان میں کاغذی گڑیوں سے کھیل رہی تھی اچانک ایک دھماکا ہوا اور آئی وی کی کاغذی گڑیاں چاروں طرف بکھر گئیں، پھر جیسے ہی وہ انہیں اٹھانے کے لئے جھکی، دھات کا ایک ٹکڑا اس کے سر پر آکر لگا

اور وہ زخمی ہو گئی۔

آئی ڈی کی ماں دوڑی دوڑی آئی اور اسے دھکیل کر گھر میں لے گئی اور اندر لے جا کر اسے اس کے چھوٹے بھائی فرنلے اور میکس کے برابر بٹھا دیا۔ کچھ دیر بعد آئی ڈی نے دہلیز میں جوتوں کی آواز سنی تو اس نے نظر اٹھا کر دیکھا کہ کچھ لوگ ایک اسٹریچر اٹھائے دروازے میں داخل ہو رہے ہیں۔ ان میں سے ایک آدمی نے کہا' "بوائلر پھٹ گیا ہے۔"

"ڈیڈی" آئی ڈی اپنے باپ کے زخمی چہرے پر سفید پٹیاں بندھے ہوئے دیکھ کر چلائی۔
مسٹر بیکر کی ٹوٹی ہوئی پسلیاں تو جلد ہی ٹھیک ہو گئیں، لیکن بوائلر کے ساتھ ساتھ اس کا ٹھیکہ ختم ہو جانے کے سبب اس کا روزگار بھی جاتا رہا تھا۔ چنانچہ بیکر اپنے خاندان کو لے کر کول ول (آٹاہ) چلا گیا۔ اس کے بعد بیکر کو بنگھم کینین میں اپنے لئے زیادہ بہتر مواقع نظر آئے، کیونکہ بنگھم میں کینٹے کوٹ کمپنی کام کر رہی تھی۔ جس کے پاس دنیا کی وسیع ترین تانبے کی کانوں کا ٹھیکہ تھا۔ چنانچہ یہ خاندان وہیں قیام پذیر ہو گیا۔ کینین کی فصیلیں اس قدر بلند تھیں کہ صبح کے وقت دس بجے سے پہلے سورج مشکل سے ہی نظر آتا تھا، اور اس بستی کا منظر بڑے جلال کا حامل محسوس ہوتا تھا۔

ان لوگوں نے بنگھم کینین میں ایک بڑی چار دیواری والا مکان کرائے پر لے لیا۔ اس مکان میں ایک وسیع دالان بھی تھا، لیکن آئی ڈی اکثر گھر سے باہر نکل جاتی اور ایک پرانے مل میں پڑی ہوئی مشینوں اور شہتیروں کے درمیان آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی۔ جب کوئی نگرانی کرنے والا نہ ہوتا تو آئی ڈی اور دوسرے بچے ریل کے تنگی والے پل پر چڑھ جاتے اور کچے لوہے کی بالٹیوں کے ساتھ لٹک لٹک کر انتہائی خطرناک بلندیوں تک پہنچ جاتے تھے۔

سات برس کی عمر میں ہی آئی ڈی کو گھر کی صفائی، کپڑوں کی دھلائی، استری اور چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کے گھریلو کاموں میں حصہ لینا پڑا۔ اب اسے کھیلنے کے لئے بہت کم وقت میسر آتا تھا۔ بچپن کے انھیں دنوں میں ایک بار وہ میکس اور فرنلے کے ساتھ بیٹھی تھی کہ اس کا ایک ہم جولی آیا اور اسے ہاپ اسکاچ کھیلنے کے لئے باہر چلنے پر اکسایا۔ آئی ڈی صرف پانچ منٹ تک کھیلنے کا تہیہ کر کے گھر سے نکل آئی۔

کھیلتے کھیلتے جب اس نے میکس کے دہاڑنے کی آواز سنی تو گھر لوٹ آئی۔ میکس کے ہاتھ میں کسی

طرح تیزابی پانی کا دھند بنکا آگیا تھا جس سے مسز بیکر گھر کی صفائی کرتی تھی۔ اور اس نے اس پانی میں اپنی انگلیاں ڈبو کر چاٹ لی تھیں۔ آئی ذی نے اپنے ریشمی بالوں اور نیلی آنکھوں والے بھائی کو گود میں اٹھا لیا۔ اسے کھیلنے کے لئے اپنے باہر چلے جانے پر ندامت محسوس ہونے لگی، کیونکہ ماں نے میکس کو اسی کے بھروسے پر چھوڑا تھا اور وہ اس کی دیکھ بھال نہیں کر سکی تھی۔

میکس کا منہ چونکہ تیزابی پانی سے جل گیا تھا اس لئے کئی روز تک اسے ایک نلکی کے ذریعے دودھ پلانا پڑا تھا۔ اس دوران میں جب آئی ذی نے دیکھا کہ اس کا معصوم بھائی پوری طرح دودھ نہیں پی سکتا۔ اور کمزور ہوتا جا رہا ہے تو اس نے مایوسی کے عالم میں خدا سے دعائیں مانگیں کہ میکس جلد تندرست ہو جائے۔ اس نے یہ قسم بھی کھائی کہ وہ کسی کی اعتماد شکنی نہیں کرے گی۔

آئی ذی کے والدین میکس کو لئے لئے ڈاکٹروں کے پاس جاتے رہے۔ تب کہیں جا کر انھیں ایک ایسا معالج میسر آیا جس کی دوا سے میکس کو شفا ملی۔ اس کے بعد آئی ذی نے میکس کی متواتر دیکھ بھال کی۔ آئی ذی کے والدین نے جو کچھ بچایا تھا وہ بچے کی بیماری کی نذر ہو گیا۔ اس کے بعد جب مسٹر بیکر کی ٹانگ ٹوٹ گئی تو ان کی آمدنی بالکل ہی ختم ہو گئی۔ ان کا کوئی ایسا بیمہ بھی نہیں تھا جس کے تحت مسٹر بیکر کو بیماری یا بے کاری کا کوئی معاوضہ مل جاتا۔

"ہم ان حالات میں بھی اچھی طرح بسر کر لیں گے" مسز بیکر کی نیلی آنکھوں سے اعتماد اور ثابت قدمی جھلک رہی تھی۔

آئی ذی اس وقت آٹھ برس کی تھی۔ لیکن وہ بھی بچوں کو کھلانے اور پیغام رسانی کی ملازمت کر کے پیسے کمانے کی سعی کرنے لگی۔ جب وہ گھر ہوتی تو سب بچے آپس میں ہنستے بولتے تھے اور بیکر بھی ان کے ساتھ ہنسی مذاق میں شریک رہتا تھا۔ لیکن جب بچوں کے درمیان اچانک کسی بات پر لڑائی ہونے لگتی تو بیکر انھیں گھڑک کر یا غضبناک نظروں سے دیکھ کر چپ کرا دیتا تھا۔

آئی ذی کو اپنے ایک عام مارمن، رسم و رواج والے خاندان میں گذارے ہوئے لمحات اطمینان و شگفتگی کے حامل محسوس ہوتے تھے۔ اس طمانیت بخش عرصے کے دوران میں اس خاندان کے تمام افراد اپنے پرشکوہ اور گمبھیر نظر آنے والے باپ کے ساتھ بائبل یا مارمنی کلیسا کے صحیفوں کی تلاوت کیا کرتے تھے تلاوت کے بعد بیکر اپنے تجربات پر مبنی معلومات سے اپنے بچوں کو آگاہ کیا کرتا تھا۔ اکثر و بیشتر اس کی

بھی جانچ پڑتال کی جاتی کہ خاندان کا ہر فرد اپنی صلاحیتوں کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ بیکر کا عقیدہ تھا کہ صلاحیت خدا داد ہوتی ہے۔ لیکن اس میں خود بھی اضافہ کرنا چاہیئے۔ اس خاندان کی ایسی نشستیں عام طور پر لطیفوں پر ختم ہوتی تھیں۔

ایک سہ پہر کو بیکر کے دوست شطرنج کھیلنے کے لئے کچھ دیر اس کے یہاں ٹھہر گئے۔ آئی وی کی مہمان نوازی نے ان سے درخواست کی کہ وہ شام کا کھانا کھا کر واپس ہوں۔ بیکر کے یہ دونوں دوست ابھی کنوارے تھے، چنانچہ ان میں سے ایک نے مسز بیکر سے دریافت کیا کہ وہ قیمتاً ان کے کھانے کا انتظام اپنے یہاں کر سکتی ہیں؟ مسز بیکر نے اپنے بھورے بالوں کی چوٹی کو پیچھے کی جانب جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔ "اس سے تو ہمیں اپنی ترقی میں معاونت ملے گی۔"

اس کے بعد بیکر کے گھر پر قیمتاً کھانا کھانے والے کچھ اور "لوڈر" بھی آ گئے۔ اور آئی وی پہر تینوں کی سجائی، کھانے کی میزوں کی ترتیب و تزئین اور چھوٹے بھائی بہنوں کی نگہداشت میں پہلے سے بھی زیادہ وقت صرف کرنے لگی۔ جب بیکر دوبارہ کام کرنے کے قابل ہو گیا۔ اور تمام قرضے ادا ہو گئے تو مسز بیکر نے "لوڈروں" کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اس کے بعد اس خاندان میں لین اور گریٹ روڈ نامی دو بہنوں اور ایک بھائی کیتھ کا اور اضافہ ہو گیا۔

اس اثنا میں مسٹر بیکر نے کانوں کے بیکار پڑے ہوئے حصوں کو لے کر مزدوروں کے ذریعے کار آمد بنانے کے ایک منصوبے پر عمل شروع کر دیا چنانچہ اب اس خاندان کے افراد کو شام کے کھانے میں بھنا ہوا بڑا گوشت میسر آنے لگا۔ گھر میں کچھ نئی کتابیں بھی آ گئیں، اور آئی وی نے پیانو اور فرنیلے نے وائلین سیکھنا شروع کر دیا۔ پھر جب اس خاندان کی آمدنی میں اور اضافہ ہوا تو بھنے ہوئے بڑے گوشت کی جگہ سور کا گوشت اور سیم کی پھلیوں کی جگہ بھنا ہوا بڑا گوشت استعمال میں آنے لگا۔

بگھم کی زندگی انتہائی ڈرامائی تھی۔ کئی بار یہاں اس قدر برف باری ہوتی تھی کہ مکانات برف میں دب گئے تھے۔ دوبارہ آگ لگ جانے سے نصف قصبہ تباہ ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی کانوں کے پھٹنے کے خطرات کا سامنا کرنا پڑتا، اور آئی وی اس وقت تک خوف زدہ رہتی جب تک وہ اپنے باپ کو زندہ سلامت نہ دیکھ لیتی۔ ایک بار بیکر کو کان میں دبے ہوئے چار آدمیوں کو بچانے والی ایک جماعت کے ساتھ جانا پڑا۔ اس موقع پر آئی وی کو چھتیس گھنٹے تک بے چینی کے ساتھ باپ کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ ان دبے ہوئے

چار آدمیوں میں سے یہ لوگ صرف ایک آدمی کو باہر نکالنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ایسے دردناک حادثوں
کے وقت آئی ڈی کو محسوس ہوتا تھا کہ جیسے بیگلم کے لوگ مختلف قبیلوں اور فرقوں سے تعلق رکھنے
کے باوجود ایک بڑے خاندان کے رشتے میں منسلک ہو گئے ہوں۔ ایسے موقعوں پر آئی ڈی کی ماں
ہمیشہ ضرورت مندوں کو خوراک اور کپڑے وغیرہ دیا کرتی تھی۔

کان کنی کے باعث نشیب کے نالوں کا تمام پانی خندقوں میں بھر جاتا تھا۔ پھر جب بارش یا برف باری کے
سبب ان میں سیلاب آتا تو کچھ سڑکیں کیچڑ سے لت پت ہو جاتیں۔ بیگلم کی سڑکوں پر پٹریاں کبھی نہیں تھیں۔ اسی لئے
سڑک کی ساری گندگی گھروں میں در آتی تھی جس سے خواتین ہمیشہ پریشان رہتی تھیں۔

"سڑک کی پٹریاں لگوانے کا وعدہ کیجئے" مسز بیکر نے اپنے اس میونسپل کونسلر سے کہا جو ری پبلکن پارٹی
کے ٹکٹ پر میئر کے عہدے کا الیکشن لڑ رہا تھا۔ "یہ وعدہ کیجئے، تبھی آپ کو قصبے کی تمام خواتین کے ووٹ ملیں گے"
اس تحریک کو مسز بیکر نے پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ چلایا۔ آئی ڈی اس وقت دس برس کی تھی۔ اس الیکشن
میں اس نے پیغامبر کے فرائض ادا کئے اور زندگی میں پہلی بار کسی امیدوار کی انتخابی مہم کا تجربہ حاصل کیا۔

اس خاندان کو دو برس بعد پھر انحطاط کا سامنا کرنا پڑا۔ اور مسز بیکر نے ایک بار پھر بورڈروں،
سلسلہ شروع کر دیا۔ اب اگرچہ کوئلے کا اسٹوو ہر وقت باورچی خانے میں جلتا رہتا تھا لیکن آئی ڈی کا کمرا
مستقل سرد رہنے لگا تھا۔ کڑکڑاتی سردیوں میں وہ صبح پانچ بجے اٹھ جاتی اور جلدی جلدی زیر جامہ، سیاہ
رنگ کی لمبی جرابیں اور سوتی کپڑے پہن کر بھاگتی ہوئی باورچی خانے میں پہنچ جاتی تھی۔ اسے کان کنوں کے لئے
ناشتہ بنانا ہوتا تھا اور دوپہر کے کھانے کے لئے سینڈوچ تیار کر کے ان کے ناشتے دانوں میں رکھنے ہوتے تھے۔
جیسے ہی کان کنوں کا ایک گروہ رخصت ہوتا، آئی ڈی کے کام کی دوسری شفٹ شروع ہو جاتی۔
وہ دلیئے کے بجائے، سور کی رانیں اور انڈے، گرم کیک یا گھریلو ڈبل روٹیاں بنانی شروع کر دیتی تھی۔ اسکول
سے واپس آنے کے بعد اسے رات کے کھانے کی تیاریاں کرنی پڑتی تھیں۔ پھر بستر پر دراز ہونے سے قبل
وہ اپنی ماں کے ساتھ مل کر رات کی ڈیوٹی پر جانے والوں کے لئے ناشتے دان تیار کرتی تھی۔

لیکن بورڈر اس خاندان کی مسرتوں میں حائل نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ بہت اچھا داستان گو تھا۔
[illegible] امریکہ کے قدیم باشندوں اور بھوتوں کی کہانیاں نیز اپنے تبلیغی سفر کے دوران میں واقع ہونے والے
حادثات کی روداد سنا کر انہیں حیرت زدہ یا مسرتوں سے ہمکنار کر دیتا تھا۔ آئی ڈی کو جب کبھی موقع

وہ تاریخ، سوانح، ناولوں اور مغربیہ کے باشندوں سے متعلق کتابوں کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتی تھی ایک بار جب چیچک پھیل جانے کی وجہ سے آئی ڈی کو بہت دیر تک حفظ ماتقدم کے لیے خلوت نشین رہنا پڑا تو اس نے اس عرصہ میں بک آف نالج (کتاب معلومات) کی بیس کی بیس جلدیں پڑھ ڈالیں۔

آئی ڈی قومی تیوہاروں کا بیتابی کے ساتھ انتظار کیا کرتی تھی۔ ۴ جولائی کے روز وہ علی الصبح اٹھ جاتی، تاکہ کوئی پروگرام اس سے چھوٹ نہ جائے۔ اس کے پیچھے پتنگ کی ڈور کی طرح اس کے چھوٹے بھائی بہنوں کی لائن ہوتی اور وہ جھنڈیوں سے آراستہ شاہراہ سے ہوتی ہوئی جنرل اسٹور کے سامنے ایک پلیٹ فارم پر پہنچ جاتی تھی۔ مسز بیکیر چونکہ مقامی سیاست میں حصہ لیتی تھی۔ اس لئے وہ میئر اور اس روز کے مقرر کے ہمراہ اسٹیج پر بیٹھا کرتی تھی۔ اپنی ماں کو اسٹیج پر بیٹھا ہوا دیکھ کر آئی ڈی کو انتہائی مسرت ہوا کرتی تھی۔ اس موقع پر مختصر دوڑ سے لے کر پائی[1] کھانے تک جس قدر بھی مقابلے ہوتے ان میں بیکیر کا خاندان متواتر انعام حاصل کرتا رہا تھا۔

آئی ڈی نے اپنے دراز قد، الھڑپن اور معمولی وضع قطع کے ساتھ عنفوان شباب میں قدم رکھا تاہم وہ باطنی طور سے ایکٹریس بننے کی خواہش مند تھی اور وہ فلم کی فلم اسٹار پرل وہائٹ کی ہمسری کرنا چاہتی تھی۔ انھیں دنوں سالٹ لیک ٹیلی گرام نے اپنی ایک اشاعت میں یہ اعلان شائع کیا کہ سالٹ لیک سٹی میں فلمائے جانے والے ایک فلم میں ان لوگوں کو رول دیئے جائیں گے جو اس اخبار کے سب سے زیادہ خریدار فراہم کریں گے۔ اس اعلان کو پڑھ کر آئی ڈی نے بنگھم میں گھر گھر جاکر اخبار کے خریدار بنانے شروع کردیئے۔ چنانچہ اس نے دوسرے درجے کا ایک انعام حاصل کر لیا اور اس فلم کے ایک مختصر سے منظر میں اسے خوبصورت کپڑے پہن کر رقص کرنے کا موقع مل گیا۔

جس رات یہ فلم بنگھم میں دکھائی جانے والی تھی۔ آئی ڈی نے رات کا کھانا پہلے ہی کھا لیا اور فلم دیکھنے چل پڑی۔ لیکن جب اس نے فلم میں خود کو بہت سے لوگوں کی ٹولی میں دیکھا اور بدصورت پایا تو وہ چپکے سے تھیٹر سے باہر نکل آئی اور خود کو نیند کے آغوش میں چھپا دینے کے لئے گھر چلی گئی۔

اب تقریبات اس کے لئے بے معنی ہوگئیں اور وہ ان لڑکیوں سے بھی الگ رہنے لگی جو اسے رقص

---

[1] ایک قسم کا کھانا، جس میں اوپر نیچے کی پیسٹری بھی ہوتی ہے اور اندر گوشت، ترکاریاں اور پھل وغیرہ بھرے ہوتے ہیں۔

کرنے مدد کر تے تھے ۔ آئی ڈی اسکول کے دوسرے سال میں تعلیم پا رہی تھی۔ مسٹر بیکر نے اسے اسکول کے ایک رقص کے لئے نو د ساٹھ کا جبا لمبنا رسوٹ خرید دیا تھا تاکہ وہ خوش وضع نظر آسکے لیکن جب یہ رقص شروع ہوا تو صرف ایک لڑکے نے اسے اپنے ساتھ رقص کرنے کے لئے کہا ۔ دوسری صبح اس نے اسکول کے الماریوں والے کمرے میں ایک لڑکی کو کہتے ہوئے سنا ، "جم نے کسی کے ملکا منے بہائی ڈی کے ساتھ رقص کیا ۔"

یہ جان کر کہ جم نے اس کے ساتھ کیسے رقص کیا ۔ آئی ڈی پژمردہ ہوگئی ۔ لیکن اسی لمحے اس نے یہ عزم کرلیا کہ وہ آئندہ کسی ایسے عمل یا مذاق میں شامل نہیں ہوگی جس سے دوسرے کے جذبات مجروح ہوسکتے ہوں ۔

پھر اپنے اسکول اور تقریبات کے لئے بہتر کپڑے بنانے کے خیال سے اس نے سلائی سیکھنا شروع کردی ۔ لیکن دوسرے موضوعات میں اچھا معیار قائم کرنے کے باوجود وہ دستکاری کے لئے نااہل ہی نظر آتی تھی ۔

یونیورسٹی کے ابتدائی سال کے دوران میں آئی ڈی لیٹر ڈے سینٹس ہائی اسکول میں داخل ہونے کے لئے سالٹ لیک سٹی چلی گئی ۔ وہاں اس نے اپنی ماں کی چھوٹی بہن گریٹ روتھ اور اپنے تند خو مزاج والے خالو جی کے یہاں قیام کیا ۔ آئی ڈی کی خالہ اس کی ماں کی طرح سے اسے چاہتی تھی ۔ سالٹ لیک کے ہائی اسکول کے پارکوں اور اونچی اونچی عمارتوں اور سینما گھروں نے آئی کو مسحور کردیا ۔

پھر وہ بلیکم واپس آگئی ۔ لیکن اسے شہر کی تیز رفتار زندگی یاد آنے لگی اور اس کے دل میں تجربات کرنے کی امنگیں بیدار ہونے لگیں ۔ آئی ڈی کی ایک سہیلی مریم ایکیلسن تھی ، جس کا خاندان سان فرانسسکو میں منتقل ہوگیا تھا ۔ ایک بار جب مریم نے آئی ڈی کو گرمیاں گزارنے کے لئے سان فرانسسکو میں مدعو کیا تو وہ اس موقع کو غنیمت جان کر فوراً روانہ ہوگئی ۔ لیکن اس کا بہترین لباس استعمال کرنے میں ایکیلسن کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہ تھا ۔ ایکیلسن کے مقابل میں وہ ایسی نظر آتی ، جیسے اس کی کوئی دیہاتی رشتہ دار ہو ۔

پھر جب مریم نے اسے آمادہ کرکے اس کے محبوب طرز کے بال کٹوا دیئے اور مریم کی ماں اس کے لئے کچھ چست کپڑے سلوا دیئے تو آئی ڈی کا حوصلہ کچھ بلند ہوگیا ۔ اس کے بعد آئی ڈی

بیگم کی سہیلیوں کے ہمراہ کلف ہاؤس میں کھانا کھایا۔ چائنہ ٹاؤن اور فشرمینز وہارف کی سیر کی
نوب ہل تک تاروں کی گاڑی میں سفر کیا۔ اب اسے فلمیں دیکھنے، تقریبات میں شرکت کرنے اور
رقص کے لئے دعوت نامے بھی موصول ہونے شروع ہو گئے۔

ایک دن ایک سیاہ خم دار بالوں والے ایک شائستہ نوجوان ہیری ہچنڈکس نے اس سے
ملاقات کا وعدہ لیا۔ ہیری سے ملاقات کے بعد ان دونوں کی دوستی اتنی بڑھی کہ آئی وی نے
باقی ماندہ گرمیاں ہیری کے ساتھ ہی گزاریں۔ سردیوں میں آئی وی بنگھم واپس آگئی اور اس نے
اسٹوڈینٹ کونسل کے ایک ممبر کی حیثیت سے کام کیا۔ اسے اسکول کے رسالہ کا نائب مدیر اور ڈیبیٹ
ٹیم کا کپتان بنا دیا گیا۔ اپنی کلاس کے کھیلوں میں بھی اس نے نمایاں حصہ لیا اور اپنی خواہش کے
مطابق دوستوں کے ساتھ بھی وقت گزارا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہیری سے بھی باقاعدہ خط و
کتابت کرتی رہی۔ ہیری کی خواہش تھی کہ اسکول کی چھٹیاں ہوتے ہی انھیں شادی کر لینی چاہیے۔

آئی وی نے ہیری کو لکھا کہ " میں اتنی کم عمری میں شادی کرنے کی بجائے قانون کی تعلیم
حاصل کرنا چاہتی ہوں "

آئی وی کے امتحان پاس کرنے کے بعد ہیری اس سے ملاقات کے لئے بنگھم آگیا۔ پھر
اسے سالٹ لیک سٹی میں ہی ملازمت مل گئی۔ اب وہ ہر طرح آئی وی سے ملاقات کر سکتا تھا۔ اسی
اثنا میں آئی وی نے اپنے باپ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ وکالت پڑھنا چاہتی ہے۔

مسٹر بیکر نے اس سے کہا، " جہاں تک میرے امکان میں ہوگا، میں تمھیں داخل تو کرا دوں گا
لیکن میں بڑھے ہوئے اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

چنانچہ آئی وی نے اپنی کچھ آمدنی کے لئے پرنسس تھیٹر میں ٹکٹ فروخت کرنے کا کام لے لیا۔
ٹکٹ گھر بند ہونے کے بعد وہ کھیل بھی دیکھ سکتی تھی۔ چنانچہ جب اس نے اس تھیٹر میں فلمیں دیکھیں تو اسکرین پر
دکھائی جانے والی زندگی اور اپنی زندگی کا تضاد محسوس کرنے لگی اور وہ اپنی زندگی میں تبدیلیاں پیدا کرنے
کی خواہش مند ہو گئی۔ ہیری اس کی اس خواہش کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس لئے اس نے آئی وی کو سبز باغ
دکھانے شروع کر دیئے اور اس سے ان رومانی عوامل کا ذکر کیا جو انھیں شادی کر کے حاصل ہو سکتے
تھے۔ اور آخر ایک چاندنی رات میں اس پر ہیری کی ترغیب کا افسوں چل گیا۔

۱۲ جولائی ۱۹۴۲ء کو ان دونوں نے معمولی طریقے سے شادی کی رسوم ادا کیں اور پھر ہنی مون منانے کے لئے یلو اسٹون چلے گئے۔ ہنی مون ختم ہونے کے بعد ہیری نے آئی ڈی کو بتایا کہ اس نے نوکری چھوڑ دی ہے اور اب کیلی فورنیا یا اپنے آبائی وطن، شمالی کیرولینا میں ملازمت کرنا چاہتا ہے۔ کسی فیصلے پر پہنچنے کے لئے اس نے ایک سکہ اپنی انگلیوں پہ رکھا اور اسے اچھال کر چت پٹ دیکھنے لگا۔

آئی ڈی کو معلوم ہوا کہ ہیری اپنے بیشتر فیصلے اسی طرح توکلی انداز سے کرتا ہے اور مضطرب رہتا ہے اور بہت عرصہ تک ایک ملازمت پر قائم نہیں رہتا۔ شادی سے قبل ہیری خوش مزاج تھا، اور اس کے حوصلے بلند تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس میں تیکھا پن، غصہ اور بے وفائی کا جذبہ بڑھتا جاتا تھا قرض خواہوں نے اب انہیں پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ آئی ڈی نے ایک ڈیپارٹمنٹ اسٹور میں سیلز کلرک کے طور پر ملازمت کر لی۔ لیکن ہیری نے اس کی اس خود کفالت کا بھی برا مانا۔

آخر اس پریشانی، اداسی اور ناخوش گواری میں چار برس گزارنے کے بعد آئی ڈی کچھ اطمینان حاصل کرنے اور اپنے گھر والوں سے مشورہ کرنے کی غرض سے اپنے گھر چلی آئی۔

"کیا تم نے اپنا فرض نبھایا ہے؟" آئی ڈی کی ماں نے اس سے دریافت کیا۔

آئی ڈی نے محسوس کیا کہ اس نے اپنا فرض نبھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے ذہن میں کچھ سوالات پیدا ہونے لگے۔ اس نے سوچا کہ کیا اس نے بہت زیادہ بے صبری کا مظاہرہ کیا ہے؟ اس ذہنی کشمکش سے اس نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ اس نے شادی بے سوچے سمجھے اور جلدی میں کی تھی۔ پھر وہ ان تمام حالات پر پوری طرح غور کرنے کا موقع حاصل کرنے کے خیال سے، نیز اپنے شکستہ خوردہ اعتماد کو بحال کرنے کے لئے کچھ عرصہ تک اپنے گھر میں مقیم رہی۔

لیکن ایک روز آئی ڈی کو خبر ملی کہ ہیری ہوائی جہاز کے حادثے میں ہلاک ہو گیا ہے۔ یہ خبر سن کر اس میں خود اعتمادی دوبارہ عود کر آئی۔ لیکن باپ کے گھر میں روزمرہ کی زندگی کی شگفتگی نے اسے اپنے آپ پر افسوس کرنے کا موقع نہیں دیا۔ پھر یوں ہوا کہ ملک گیر پیمانے پر واقع ہونے والے بحران کا اثر مسٹر جیکب پر بھی پڑا اور ان کی آمدنی کم ہو گئی۔ بیماری اور بڑھتی ہوئی قرضے اور ٹیکس کی ملازمتیں بھی ختم ہو گئیں۔

ایسے حالات میں آئی ڈی کا باپ سالٹ لیک سٹی میں ایک مکان کا کرایہ ادا کرتا رہا۔ جیکب کا

ارادہ تھا کہ وہ دن کے کچھ حصہ بیں بنگھم میں بھی کام کرتا رہے گا لیکن اسے سالٹ لیک سٹی کے اس مکان میں منتقل ہونے میں بہتری نظر آئی۔ چنانچہ یہ لوگ وہاں چلے گئے۔

آئی وی کو طویل فاصلے کی ٹیلی فون آپریٹر کے طور پر ملازمت مل گئی۔ اس ملازمت میں اس نے رات رات بھر ڈیوٹی دی اور اضافی آمدنی کے لئے اور شام کو بھی کام کرتی رہی۔ میکس اور لانڈ نے اخبارات کی تقسیم کا کام شروع کر دیا اور مسز بیکر نے نرسنگ کا پیشہ اختیار کر لیا۔ فروری کے مہینے میں آئی وی کا باپ شدید برف باری کے دوران میں ایک موٹر سے زخمی ہو گیا اور تقریباً ایک ماہ تک بے ہوش پڑا رہا۔ پھر وہ صحت یاب تو ہو گیا لیکن اس کے معالجوں کو پتہ چلا کہ وہ سلی کوسس میں مبتلا ہے۔ یہ پھیپھڑوں کی ایک مہلک بیماری تھی جو فضا میں شامل شدہ دھات اور پتھروں کے انتہائی خفیف ذرات کی یورش سے ہو جاتی ہے۔

اس کرب کے باوجود بیکر کی حیران اور شفیق آنکھوں سے مترشح تھا اس نے رجائیت آمیز رویہ برقرار رکھا۔ مسز بیکر جو ایک حوصلہ مند اور خوبصورت تھی۔ بیکر کی تیمارداری اور گھریلو کام کاج کے علاوہ سیاسی سرگرمیاں بھی جاری رکھے ہوئے تھی اور اپنے گھر میں بنائی ہوئی پائیاں تقسیم کرنے کا کام بھی جاری رکھتی تھی۔ اس کے پاس سیاسی تنظیموں کے خواہش مند لوگ مشوروں کے لئے متواتر آتے جاتے رہتے تھے۔

آئی وی اور اس کی ماں انتہائی جبر کر کے کسی ایک چیز کی خریداری کو کسی دوسری چیز کے خرچ ضرورت کا بہانہ کر کے ٹال دیتی تھیں۔ خاندان کے سب لوگ سر جوڑ کر بیٹھ جاتے اور سوچنے لگتے بینک میں کونسی چیز گروی رکھ کر انھیں قرض سے چھٹکارا مل سکتا ہے؟ اس موقع پر گھر کا ہر فرد دوسرے کو دلاسا دینے کی کوشش کرتا تھا۔

جب حالات بہت زیادہ خراب ہو گئے تو بیکر کے خاندان نے مارمن کلیسا سے مدد لینی شروع کی۔ مسز بیکر نے اپنے بچوں کو سمجھاتے ہوئے کہا، "یہ خیرات قطعاً نہیں ہے۔ اچھے حالات میں ہم کلیسا کی مدد کے لئے اپنی آمدنی کا دسواں حصہ دیتے رہے ہیں، اور اب بھی اس مدد کے عوض ہم اچھے کام کریں گے۔"

اسی دوران آئی وی کو "ایکسچینج" کے ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان میں سیلز لیڈی کے طور پر ملازمت مل گئی۔ ملازمت کے پہلے ہی دن دکان میں چھوٹے بہلاتے کپڑوں میں ملبوس ایک معمر عورت

داخل ہوئی۔ اس کی حالت دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے خریداری کے لئے اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس لئے دکان کے کلرکوں نے اس کی جانب توجہ نہیں دی لیکن آئی وی کا چونکہ ہر قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑ چکا تھا، اس معمر عورت کی جانب پوری طرح متوجہ ہوئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ عورت معدنیات کی بے تاج ملکہ ہے، وہ دکان میں کھڑے کھڑے اس نے پانچ سو ڈالر کی خریداری کی۔

پھر ایورینگ والوں نے آئی وی سے آرٹ اور کشیدہ کاری کے شعبہ کی ذمہ داری سنبھالنے کی درخواست کی۔ آئی وی نے اس شعبہ کی فروخت کو دوگنا کرنے کے لئے پوری جانفشانی کے ساتھ اضافۂ فروخت کی تحریکیں چلائیں، لیکن اسے اپنی کوششوں میں پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ اس ملازمت کے دوران میں وہ اس فرم کے ریڈیو پروگراموں میں بھی پیش ہوئی اور فیشن شو کے موقع پر موڈل گرل کا کام بھی کیا۔ شام کے وقت سینینہ پبلک اسکول میں تاریخ امریکہ اور امریکی شہریت کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔

آئی وی کو اس کے ایک دوست ایڈیل ہوول نے مشورہ دیا کہ وہ نئے انداز سے سنگھار کی چیزوں چیزوں کا کاروبار کر سکتی ہے۔ چنانچہ یہ کاروبار شروع کرنے کے لئے وہ کیلی فورنیا چلی گئی لیکن اس کی تجارت کامیاب نہ ہو سکی۔ پھر اس نے یہ کاروبار ترک کر دیا۔ اور بلوکس ولشائر اسٹورس میں موڈل گرل کے طور پر کام شروع کر دیا۔ یہ کام آئی وی کو پسند نہیں تھا۔ لیکن تعلیم کی کمی نے اس کو اس کے بنیادی ذوق و رجحانات سے قطعی بے تعلق کر دیا تھا۔ پھر جب اسے باپ کی شدید بیماری کی اطلاع ملی تو وہ بہت جلد اپنے گھر پہنچ گئی۔

جب مسٹر بیکر کی طبیعت سنبھل گئی تو آئی وی نے ان سرگرمیوں کا جائزہ لینا شروع کیا، جو اس کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی تھیں۔ دراصل ۱۹۳۲ء میں آئی وی کی ماں نے ری پبلکن پارٹی کی جانب سے گورنری کی امیدواری کا منصوبہ بنایا تھا۔ اور کامیابی حاصل کرنے کے لئے سیاسی حکمت عملی کا ایک پروگرام بھی مرتب کر لیا تھا۔ چنانچہ آئی وی نے بھی ارادہ کیا کہ اگر وہ ری پبلکن اسٹیٹ کنونشن میں ایک نمائندہ کے طور پر شریک ہو سکے تو مزہ آ جائے گا۔ اس نے سوچا کہ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے ملاقاتی اعتبار سے اپنی جدوجہد کی ابتدا کرنی چاہیئے لیکن کسی طرح اسے پتہ چلا کہ ایک مختصر سی ٹولی اس کی راہ میں حائل ہے۔ اس لئے وہ مایوس ہو گئی۔

آئی وی اپنی تدبیروں سے پرانے تجربہ کار لوگوں کو تنزل کرنے کے مواقع تلاش کرتی رہی

اس نے اپنے بعض دوستوں کو بھی اس صورت حال سے آگاہ کیا۔ پھر جس رات ایک نجی مکان میں اس سلسلے کی ایک ملاقاتی میٹنگ منعقد ہونے والی تھی۔ آئی ڈی اپنے تیس سازشی ساتھیوں کے ہمراہ میٹنگ کی کارروائی ختم ہونے سے چند منٹ پہلے لوگوں کی صفوں میں شامل ہوگئی۔ میٹنگ میں شامل ہونے کے بعد آئی ڈی کے ایک ساتھی نے اس کا نام تجویز کیا۔ جلسے کے باضابطہ شرکا پہلے ہی ایک امیدوار کا انتخاب کر چکے تھے۔ لیکن آئی ڈی کا نام پیش ہوجانے سے بعد ووٹنگ کرنا پڑا۔ جس میں آئی ڈی جیت گئی۔

اسٹیٹ کنونشن کے موقع پر پرانے سیاسی گھاگ آئی ڈی کا جوش و خروش اور سیاست کے معاملے میں اس کی بے تصنع سوجھ بوجھ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ آئی ڈی نے خود کو پارٹی کے لئے انتہائی سود مند ثابت کرنے کے لئے معمولی سے معمولی کام سے بھی دریغ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اس نے لفافے بھرنے دروازوں پر گھنٹیاں بجانے اور رائے دہندگی کی نگرانی کے کاموں میں بھی پوری خوش دلی اور حسن کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

سیاست میں شامل ہونے کے بعد آئی ڈی کو معلوم ہوا کہ سیاسی مصروفیات اس کے تصور کے مطابق دلچسپ اور متاثر کن نہیں ہیں۔ بلکہ انتہائی دقت طلب ہیں۔ تاہم اسے امیدواروں سے تعارف کرنے، اپنے اعتقاد کے مطابق موضوعات کی حمایت کرنے اور لوگوں کو بلند مقاصد کی تحریک دلانے میں خاصا مزا آتا تھا۔ اپنے ضلع کی ری پبلکن وائس چیرمین منتخب ہوجانے کے بعد اس نے جلسے منعقد کئے۔ غیر درج شدہ ووٹروں کی چھان بین کی اور اپیلوں کے منصوبے بنائے۔

جن دنوں آئی ڈی مقامی سیاست میں حصہ لے رہی تھی، اس کی ملاقات رائے پرپٹ نامی فرنیچر کے ایک تھوک بیوپاری سے ہوئی۔ رائے پرپٹ کا کاروباری مرکز تو اوماہا تھا۔ لیکن کچھ وقت وہ سالٹ لیک سٹی میں بھی گزارا کرتا تھا۔ عمر میں وہ آئی ڈی سے بڑا تھا۔ لیکن اس نے آئی ڈی کو تیراکی اور دعوت اور رقص کے لئے اپنا شریک بنالیا تھا۔ رائے انتہائی مضحکہ خیز انداز سے ہنسا کرتا تھا۔ لیکن اپنی اسی بے ڈھب روش سے اس نے خود کو خوش مذاق ثابت کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔

۱۹۴۳ء میں آئی ڈی کو ریاستی مجلس قانون ساز کی ایک امیدوار کی حیثیت سے دور دراز علاقوں تک تقریریں کرنے کے لئے جانا پڑا۔ اس سفر میں رائے بھی اکثر اس کے ساتھ رہا اور بعض

اتفاقات ایک ہی شام میں تین تین مقامات پر ہونے والی ایک جیسی تقریبوں میں راسے شروع سے آخر تک جم کر بیٹھا رہا۔ سامعین میں اس کا محبت بھرا چہرہ دیکھ کر اسٹیج سے دہشت کھانے والی آئی ڈی کو ڈھارس بندھ جاتی تھی۔

جب آئی ڈی اپنی تقریر ختم کر کے اسٹیج سے اترتی تو راسے اس سے کہتا "تم عظیم خدمات انجام دے رہی ہو۔"

آئی ڈی سمجھتی تھی کہ راسے اس سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے اور وہ محسوس کرتی تھی کہ راسے کی سیرت میں ایسی امتیازی خصوصیات موجود ہیں جن کے سبب وہ ہمدرد، بامروت اور خود غرضی سے خالی ایک اچھا شوہر ثابت ہوگا۔ بیکر اس وقت تک انتہائی نحیف ہو چکا تھا لیکن ذہنی اعتبار سے چاق چوبند تھا۔ آئی ڈی نے جب بیکر سے راسے کے متعلق گفتگو کی تو اس نے بھی آئی ڈی سے اتفاق کیا۔

کچھ عرصہ بعد بیکر کا انتقال ہو گیا۔ اور آئی ڈی کو راسے کی ہمدردی اور اس کی قوت کا سہارا لینا پڑا۔ باپ کی موت کے صدمے سے دوچار ہونے کے باوجود اس نے مجلس قانون ساز کے لئے اپنے منصوبے کی تکمیل تو کی لیکن بے دلی کے ساتھ۔ چنانچہ وہ شکست کھا گئی۔ لیکن ایک جمہوری ریاست میں اس طرح کی شکست کوئی حیرتناک بات نہیں تھی۔ اس شکست کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ گیارہ مغربی اضلاع کی لیگ، ری پبلیکنز آرگنائزیشن کی چیرمین منتخب ہوگئی۔

۱۰ دسمبر ۱۹۳۵ء کو آئی ڈی اور راسے نے شادی رچائی۔ آئی ڈی کی خالہ گرٹروڈ نے بڑی محنت سے شادی کا کیک تیار کیا تھا۔ آئی ڈی کی ماں نے اس جوڑے کے لئے شادی کا ناشتہ تیار کیا تھا جسے کھانے کے بعد یہ دونوں ہنی مون کے لئے روانہ ہو گئے اور سفر میں کئی جگہ قیام کرتے ہوئے اوماہا پہنچ گئے جہاں راسے کو ایک تجارتی جلسے میں شرکت کرنی تھی۔

سالٹ لیک سٹی واپس آنے کے بعد ان دونوں نے ایک چار کمروں والا مکان کرائے پر لے لیا راسے اگر گھر پہ نہ ہوتا، تب بھی آئی ڈی اس سے بے حد وابستگی محسوس کرتی تھی۔ راسے جس طرح ٹیلی فون اور خطوط کے ذریعے اس سے اپنا تعلق قائم رکھتا تھا، اس سے وہ بے حد متاثر ہوتی تھی۔ پھر جب پٹریسیا این پیدا ہوئی تو آئی ڈی اور راسے دونوں کو بے انتہا خوشی ہوئی۔ اس

بچی کی پیدائش کے بعد انھیں اور زیادہ بڑے گھر کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ انھوں نے سالٹ لیک سٹی سے آٹھ میل کے فاصلے پر خوبصورت باغوں والے ایک پہاڑی علاقے باؤنٹی فل میں سفید دیواروں والا ایک کھلا ہوا مکان خرید لیا۔

باؤنٹی فل میں آئی وی کو نئے دوست اور نئی طمانیتیں میسر آئیں، وہ گھر کے اطراف میں یا باغ میں گولف کھیلتی رہی اور بچی اس کے قریب پڑی ہوئی غوں غوں کرتی رہتی تھی۔ بچی کی زندگی کو ہر اعتبار سے مکمل بنانے کے لیے آئی وی نے سیاست کو بھی ضمنی حیثیت دینی شروع کر دی۔ تاہم وہ مجلس قانون ساز کی ممبری پر اب بھی قائم تھی۔ یہ ممبری اسے مجلس قانون ساز کے سالٹ لیک میں منعقد ہونے والے اجلاسوں کے دوران میں زیر غور بلوں کی تائید یا مخالفت کرنے کے باعث ملی تھی۔

آئی وی کے احباب نے اسے مجلس کے صدر کا عہدہ قبول کرنے کے لئے اکسایا، پہلے پہل تو اس نے بچی کی وجہ سے کچھ پس و پیش کیا، لیکن اس کی ماں اور رائے نے اسے یہ عہدہ قبول کرنے کے لئے آمادہ کر لیا۔ بعد ازاں دو برس تک اس عہدے پر مامور رہنے کے بعد اس نے اسے ترک کر دیا، کیونکہ وہ مکمل طور پر ایک خانہ دار بیوی اور بیٹی نیز نومولود بچی نونس کی ماں کے طور پر وقت گزارنا چاہتی تھی۔

آئی وی کو بچوں کے ایک معالج نے بتایا کہ اس کی بڑی بڑی آنکھوں والا بچی دل کی ایک خطرناک بیماری میں مبتلا ہے یہ سن کر آئی وی کے ہوش اڑ گئے۔ چنانچہ وہ اس توقع پر کہ شاید کم بلندی والے مقام پر رہنے سے بچی کو کچھ افاقہ ہو، بچیوں کو لے کر کئی ماہ تک کیلی فورنیا میں مقیم رہی کیلی فورنیا میں رہتے ہوئے موسم بہار میں بچی نونس کی حالت کچھ بہتر ہو گئی۔ اس لئے وہ باؤنٹی فل واپس آ گئی۔ لیکن جولائی میں بچے کا انتقال ہو گیا۔ اس حادثے کے بعد آئی وی نے سیاست اور دیگر تمام معمولات سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور ہفتوں تک سخت ترین رنج و غم میں مبتلا رہی۔

ماں نے آئی وی کو سمجھایا، "تمہیں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہیے" لیکن آئی وی سیاست میں جس ہمت سے احساس فرض شناسی کے ساتھ حصہ لیتی تھی، وہ اب ٹوٹ چکی تھی۔ ایک دن اس نے باغیچے میں بیٹی کے قہقہوں کی آواز سنی اور اس کے دل میں یہ خیال

پیدا ہوا کہ اسے بیٹی کی خاطر اور ان دوسرے افراد کی خاطر جو اس سے متعلق ہیں اپنی زندگی کے معمولات کو دوبارہ بحال کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس نے سیاست میں دوبارہ حصہ لینا شروع کر دیا اور دوسری خواتین کو بھی ایسا ہی حوصلہ پیدا کرنے کی ترغیب دلائی۔

خواتین سے وہ کہا کرتی تھی "آپ حکومتی نظم و نسق کے لئے انسانیت پرستی، رعایت، اور بصیرت کا قابل قدر سرمایہ رکھتی ہیں۔ اپنی پارٹی میں شامل ہو جائیے اور اس کے لئے کام کیجئے۔"

سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ آئی ڈی خواتین کے کلبوں کی جنرل فیڈریشن کی بھی ممبر منتخب ہو گئی تھی۔ اس نے ڈیوس کاؤنٹی کے جونیر ریڈ کراس کے چیرمین کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ سالٹ لیک سٹی میں نوجوان افراد کی ایک تنظیم کے لئے بھی کام کیا اور کارکن خواتین کے لئے معاوضہ کی کم از کم شرح کے قانون کے لئے ایک تحریک کی رہنمائی کی۔

جولائی ۱۹۴۱ء میں اس کے یہاں ایک اور لڑکی نینسی ایلن پیدا ہوئی۔ اسی سال ۷ دسمبر میں جاپانیوں نے پرل ہاربر پر بمباری کر دی۔ آئی ڈی نے اپنے بھائی کلیتھ کو ریڈ کراس میں کام کرنے اور ڈسٹرکٹ گارڈ مین میں مجروحین کی تیمارداری کے لئے میرٹن کورپس میں بھیج دیا۔ ان دنوں آئی ڈی کے باغیچے پر مختلف قسم کے چھوٹے چھوٹے کیڑوں نے یلغار کر دی تھی۔ چنانچہ اس نے گھر سے باہر تک ایک میز کپڑا لٹکا دیا۔ ہر صبح وہ ان کیڑوں کو جھاڑو سے جمع کر کے جلا دیا کرتی تھی۔

جنگ کے زمانے میں اتحادیوں کی شکستوں اور جانی نقصانات کی خبروں سے اکثر دہشت زدہ آئی ڈی انتہائی پریشان رہتی تھی۔ پھر جب ملک اقتصادی ابتری کا شکار ہوا تو آئی ڈی کے برے دنوں کے تجربات اس کے کام آئے۔ جنگ کے باعث فرنیچر کی تیاری تقریباً بند ہو گئی تھی۔ نیز پٹرول پیمائش ہو جانے کے سبب مائیکل اپنے تجارتی علاقے کا موٹر کے ذریعے دورہ نہیں کر سکتا تھا۔ آئی ڈی اپنے تین بچوں میں بری طرح گھری ہوئی تھی۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو ایک لڑکے کا اور اضافہ ہو چکا تھا۔ جس کا نام باپ کے نام پر رکھا گیا تھا۔ بچوں کے متعلق اپنی بے انتہا مصروفیت کے باوجود آئی ڈی سیاسی کاموں کی تکمیل کے لئے بھی حوصلہ اور قوت باقی رکھتی تھی۔ اب وہ ریاستی کمیٹی کی ممبری سے ترقی کر کے نیشنل کمیٹی کی ممبری تک پہنچ چکی تھی اور وہ اس کنونشن میں بھی حصہ لے چکی تھی جس میں تھامس ڈیوی صدارت کے لئے منتخب کئے گئے تھے۔ آئی ڈی اب اکتالیس برس

کی ہو چکی تھی، لیکن نیشنل کمیٹی میں سب سے کم عمر خاتون ممبر تھی۔

۱۹۴۴ کے صدارتی انتخاب میں ریاست الماوہ اور ملک میں ری پبلکن پارٹی کی سرگرمیاں کمزور رہیں۔ چنانچہ آئی ڈی نے دوسری انتخابی مہم کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے علاقائی سطح پر خواتین کی تنظیم قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس بار انتخابی تحریک کو پوری قوت سے چلانے کے لئے اس نے مطالعاتی کلب اور انتخابی مہم کے طور طریقے سکھانے کے لئے مکتب قائم کئے، ٹیلیفون لگوائے، لٹریچر کی تقسیم کا اہتمام کیا اور چندہ فراہم کرنے والی کمیٹیاں قائم کیں۔ جب آئی ڈی کی گھریلو مصروفیات زیادہ ہوگئیں تو عارضی طور پر مسز بیکر نے گھر بلو محاذ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

۱۹۴۷ میں مسز بیکر پر فالج کا حملہ ہوا۔ آئی ڈی نے تمام سیاسی مصروفیات ترک کر دیں اور صرف وہی کام جاری رکھے جنھیں وہ ٹیلی فون کے ذریعے انجام دے سکتی تھی۔ اس نے اپنا تمام وقت ماں کی تیمارداری اور اپنے تین معصوم بچوں کے لئے وقف کر دیا۔ پھر جیسے ہی مسز بیکر صحت یاب ہوئی اس نے آئی ڈی سے اصرار کیا کہ وہ اپنی سیاسی سرگرمیاں دوبارہ جاری کر دے، چنانچہ آئی ڈی نے اپنی سرگرمیاں دوبارہ شروع کر دیں۔

جب شیخ چشم پیٹی کو معلوم ہوا کہ اس کی ماں کا نام ۱۹۴۸ کے فلاڈلفیا میں منعقد ہونے والے انتخابی کنونشن کے لئے تجویز ہوا ہے تو اس نے کہا، "میں فکرمند ہوں"

"فکر کیوں؟" آئی ڈی نے بیٹی سے دریافت کیا۔

"ممکن ہے آپ ہار جائیں"

اس کنونشن میں پیٹی بھی آئی ڈی کے ہمراہ گئی۔ اس کی عمر تو صرف گیارہ برس کی تھی، لیکن اس نے ایک کم عمر خدمت گار کے طور پر کام کیا۔ کنونشن ہال میں لوگوں کا اتنا اجتماع تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مندوبین اپنے پسندیدہ نمائندوں کے لئے مظاہرے کر رہے تھے اور ان کا جوش و خروش ہیجان انگیز حد تک بڑھ گیا تھا۔ آئی ڈی بھی اس جم غفیر کا ایک تکمیلی جز تھی۔ لیکن اس کی اہم ترین ذمہ داریاں ری پبلکن کے صدر دفاتر سے وابستہ تھیں، جہاں مندوبین کے تصدیقی ٹکٹوں کا کام، بلّے، سواریوں کے انتظامات اور اطلاعاتی کاموں کی ذمہ داریاں اس کے سپرد تھیں۔ آئی ڈی نے ریزولیشن کمیٹی کے چیئرمین کے طور پر بھی کام کیا۔ اس کمیٹی میں تجویزیں مرتب

کرنے والی یہ پہلی خاتون تھی۔ اس کنونشن میں ڈیویی تو منتخب ہو گئے۔ لیکن آنی ڈی اپنی یقینی کامیابی کے باوجود شکست کھا گئی۔

دو برس بعد ری پبلیکن پارٹی ایک ایسے امیدوار پر غور کر رہی تھی جو ریڈا یوسون کے مقابلے میں ری پبلیکن کانگریس کے امیدوار کے طور پر انتخاب لڑ سکے۔ ریڈا یوسون ایک باصلاحیت اور خوبصورت خاتون تھی۔ اور طویل عرصے سے ملکی مسائل میں حصہ لے رہی تھی۔ ایک دن ری پبلیکن کانگریس کے مندوب اور ساٹ لیک سٹی میں کانگریس کے اسٹنٹ فرینک ریشٹر نے آنی ڈی سے ملاقات کی اور اس سے کہا، "ہم نے ایک ایسے امیدوار کا انتخاب کر لیا ہے جو مسز یوسن کو شکست دے سکتا ہے۔"

"کون ہے وہ ؟" آنی ڈی نے پوچھا۔

"آپ — !"

آنی ڈی نے سوچا کہ اس مقابلہ کے لئے نہ اس کے پاس وقت ہے اور نہ سرمایہ۔ اس لئے اس نے انکار کر دیا۔ لیکن آنی ڈی کی ماں اور رائے کی خواہش تھی کہ وہ اس مقابلہ میں ضرور شریک ہو۔ چنانچہ انھوں نے آنی ڈی کو تیار کر لیا۔ مسز یوسن انتہائی ہوشیار، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہترین مقرر تھی اور ایک ناقابل شکست حریف کی حیثیت رکھتی تھی۔ آخر کار ان دونوں عورتوں نے ایک دوسرے کے خلاف بھرپور زور آزمائی کی۔ لیکن دونوں کے درمیان دوستانہ تعلقات بحال رہے۔ مسز یوسون نے آنی ڈی کے متعلق رائے دیتے ہوئے کہا تھا "ایک انتہائی وفادار اور خوش خلق خاتون جسے تقریباً کل طور پر پیش کیا جاتا ہے۔"

اس انتخابی مہم پر بچوں نے بھی دل چسپی لی۔ نو عمر رائے کے سانپ اور بچھوے اس قدر پلے تھے کہ وہ کسی دن نینسی کی گڑیوں کو بھی شکست دے سکتے تھے۔ لیکن ننھے منے رائے نے اپنے ان سانپ بچھوؤں سے کھیلنا ترک کر دیا اور اپنی ماں سے کہا، "آپ بھی اس طرح بچوں کو بہلا سکتی ہیں" نینسی نے اس پڑوس میں پوسٹر لگانے کا کام کیا اور پٹی نے ایک سائیکل سوار فوج کی تنظیم کی۔ جب کبھی گھریلو معاملات میں کوئی الجھن پیدا ہوتی تو خالہ گریٹ یا مسز بیکیان معاملات کی دیکھ بھال کرتیں۔ آنی ڈی دیہات کے جلسوں میں، دوپہر کے کھانے کی دعوتوں، عصرانوں اور ڈنر کی تقریبات نیز غیر رسمی بحث و مباحثے میں مصروف رہتی تھی۔ پھر اس خاموش مہم کی سرگرمیاں اتنی بڑھیں کہ

آئی وی کو اپنے بچوں کا بھی ہوش نہیں رہا۔ آئی وی کی پبلیشنگ کے منتظم قومی وہیل رائٹ نے اس موقع پر آئی وی کے بچوں کی تصویریں اس عنوان کے ساتھ شائع کیں "کانگریس کے لیے میری اس انتخابی مہم کی تین وجوہات" اس تصویر کے ساتھ ہی ایک مضمون بھی شائع کیا گیا جس میں یہ وضاحت کی گئی تھی کہ مسز پیسٹ کے خیال میں ہمارے بچے ایک بہتر ملک کے مستحق ہیں ان کے لئے ہمیں ملک کو بہتر بنانا ہے۔

انتخابی مہم ختم ہو گئی اور مسز پیسٹ اس انتخاب میں شکست کھا گئی۔ لیکن آئی وی نے اس شکست کو بھی انتہائی فراخ دلی کے ساتھ قبول کیا۔ اس مہم سے باؤنٹی فل کی ایک گھریلو خاتون کی حیثیت دوبارہ اختیار کرنے میں اسے قطعاً کوئی عار محسوس نہیں ہوئی۔ پھر ۱۹۵۲ء میں وہ دوبارہ نیشنل کمیٹی کی خاتون ممبر منتخب ہو گئی اور خدمات انجام دیں۔ جب وہ نیشنل کنونشن میں شرکت کے لیے روانہ ہو رہی تھی ماں کی پرجوش اور حسین ماں نے پکار کر کہا تھا، "یاد رکھنا، ملک کو تم جیسے بہادر کی ضرورت ہے۔"

اس کنونشن کے دوران میں آئی وی کو اس کے بھائی نے ٹیلیفون پر اطلاع دی کہ آئی وی کی ماں پر فالج کا دوسرا حملہ ہوا ہے۔ چنانچہ وہ سخت اذیت ناک اضطراب کے عالم میں واپسی کے لیے ایک جہاز پر سوار ہو گئی۔ مسز بیکر ساڑھے تین ہفتے تک بے ہوش رہی اور اس کے بعد اس کا انتقال ہو گیا سینکڑوں اشخاص نے "مسز ری پبلیکن" کو خراج عقیدت پیش کیا۔ مسز بیکر کی وفات پر سارے کو بھی اتنا ہی صدمہ ہوا، جتنا آئی وی کو ہوا تھا۔

ایک ہفتے بعد آئزن ہاور کی انتخابی مہم کے ڈائریکٹر آرتھر سمر فیلڈ نے آئی وی سے ملاقات کی اور خواتین کے شعبے میں اسسٹنٹ چیرمین کے طور پر کام کرنے کی درخواست کی۔

"مجھے افسوس ہے میں یہ خدمت انجام دینے سے بالکل معذور رہوں گی" آئی وی نے اپنی ماں کی وفات سے پیدا ہو جانے والے خلا کو محسوس کرتے ہوئے مسٹر آرتھر کو جواب دیا۔

"تمہاری ماں کی بھی یہی خواہش تھی" آرتھر نے مسکین لہجے میں کہا۔ سارے اور آئی وی کے بچے بھی اس پر متفق تھے۔ خالہ گرٹ نے بھی اپنی جانب سے پیش کش کی کہ "گھر کو میں سنبھال لوں گی"

انتخابی مہم کے سلسلے میں ٹرین پر سفر کرتے ہوئے آئی وی آئک کی انتہائی پر خلوص اور سرگرم شخصیت سے، نیز مسز آئزن ہاور کے دائمی خلوص اور ان کی بے حد محبت سے بہت متاثر ہوئی۔ کمیٹی کے تمام اراکین

نشریات کے مضمونوں، تقریروں اور ٹیلی ویژن پہ پیش ہونے میں پوری تندہی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ آئی وی کی بنی سنہری شکل و صورت اور بے تکلف دوستانہ پیش قدمی یقینی طور سے مفید ثابت ہو رہی تھی۔

پھر آئی وی کی راہ میں کچھ مشکلات پیدا ہو گئیں۔ کیونکہ سرمایہ کی شدید ضرورت کے وقت غالباً خزانہ میں سرمایہ بالکل نہیں تھا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی مقرر جلسے میں نہ پہنچ پاتا اور آئی وی کو اس کی جگہ خود تقریر کرنی پڑتی تھی۔ ان تقریبات میں اسے گڑبڑ کرنے والے گروہوں کو خاموش کرانا پڑتا تھا۔ ذمہ داری کے احساس کے نیچے دبی ہوئی آئی وی کے سامنے کچھ نہ کچھ مشکلات موجود رہتی تھیں۔ لیکن وہ ان سے نبرد آزما رہتی تھی۔ جب وہ مسز رچرڈ نکسن کو اپنے ہمراہ سالٹ لیک سٹی لائی تو اس نے ان کے تعارف کے خاتمے پر کہا، "میں ریاست ہائے متحدہ کے نائب صدر کی دوسری بیوی کو آپ سے روشناس کرا رہی ہوں۔"

اس رات آئی وی نے باؤنٹی فل میں اپنے گھر قیام کیا۔ دوسری صبح جب نکسن کا کارواں آئی وی کو ساتھ لینے کے لئے اس کے گھر آیا تو آئی وی کے بچوں کو بے حد خوشی ہوئی۔ مسز نکسن نے خود انھیں اپنی گاڑی میں اسکول تک پہنچایا۔

الیکشن کے دن کمیٹی کے کارکنان امید و بیم کی کیفیت میں ڈوبے ہوئے تھے اور سب کے سب نیویارک کے ہوٹل کو موڈور میں جمع تھے۔ ان لوگوں کو جب یہ اطلاع ملی کہ گورنر ایڈلائی سٹیونسن نے شکست تسلیم کر لی ہے تو ہوٹل کوموڈور شور اور قہقہوں کا مرکز بن گیا۔ کمیٹی کے ارکان خوشی خوشی ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر، اور بغل گیر ہو کر اپنی مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ آئی وی نے جب صدر کا عہدہ حاصل کرنے والے آئزن ہاور کو اپنی کامرانی کا کیک کاٹتے ہوئے دیکھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسے اس کی محنتوں کا ثمر مل گیا ہے۔

اب وہ مسلسل سفر، سرگرمی، ہوٹل کے کمروں اور ناشتے کے وقت جلدی جلدی اندر لینے والے مشروبات سے عاجز آ کر گھر میں اپنے خاندان کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ لیکن تہنیتی نامے اور شکریے کے خطوط لکھنے اور معاہدات پر غور کرنے کی وجہ سے رکنا پڑا۔ سب سے زیادہ خوشی اسے اس بات کی تھی کہ جب ووٹوں کا تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ خواتین کے باون فیصدی ووٹوں

کی وجہ سے آئزن ہاور کو کامیابی حاصل ہوئی۔ آئی ڈی کو اب صرف مہم کے سربراہ کے لئے ایک مکمل رپورٹ کی تیاری کا کام باقی رہ گیا تھا۔

آئزن ہاور نے آئی ڈی سے ملاقات کے وقت اس کی پر خلوص مبارک باد کے جواب میں حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا، "مسز ہیسپ، میں چاہتا ہوں کہ آپ ریاستہائے متحدہ کے خزانچی کا عہدہ سنبھال لیں۔"

آئی ڈی کو مسٹر آئزن ہاور کی اس بات کا یقین نہ آیا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے ایک لمبی سانس لے کر کہا، "بلاشبہ یہ میرے لئے عظیم ترین اعزاز ہوگا۔"

جب وہ آئزن ہاور کے پاس سے واپس ہوئی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے ابھی ابھی کوئی خواب دیکھا تھا۔ اس عہدے کو وہ محض اپنا ذاتی اعزاز نہیں سمجھ رہی تھی۔ بلکہ اس کے نزدیک یہ عہدہ حکومتی نظم و نسق میں خواتین کے رول کی قدردانی کا اعتراف تھا۔ وہ لپک کر ایک ٹیلی فون پر پہنچی اور رائے کو ٹیلی فون کال کی۔ لیکن رائے گھر پر موجود نہیں تھا اور اس کا کوئی بھائی یا بہن بھی اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ زندگی کے عظیم ترین اعزاز کے موقع پر اس کے خاندان کا کوئی فرد اس کے قریب نہیں جو اس وقت اس کی مسرتوں میں شریک ہو سکے۔

جب وہ باؤنٹی فل پہنچی تو پر مسرت خاندان نے اسے اپنی بانہوں کی گرفت میں لے لیا۔ تھوڑے دن بعد آئی ڈی اور رائے واشنگٹن کے لئے پرواز کر گئے تاکہ وہاں سکونت کا انتظام کر سکیں۔ انہیں واشنگٹن میں سرخ اینٹوں کا ایک نو تعمیر مکان، بہت جلد پسند آ گیا۔ یہ ان کی ضروریات کے عین مطابق تھا باؤنٹی فل واپس آ کر وہ کرسمس کی ابتدائی تقریبات اور واشنگٹن منتقل ہونے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ آئی ڈی کے نقطہ نظر کے مطابق اس تبدیلی مکانی کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ رائے صرف کاروبار کی سرد بازاری کے دنوں میں ہی واشنگٹن میں رہ سکتا تھا۔

منتقلی کے لئے سامان کی تیاری اور الوداعی دعوتوں کے بکھیڑوں کے دوران میں ہی آئی ڈی کو بیورو آف اینگریونگ اینڈ پرنٹنگ کی جانب سے ایک خط موصول ہوا جس میں مسز پریسٹ سے اس کے دستخطوں کا وہ نمونہ طلب کیا گیا تھا جو اس کے عہدہ سنبھالنے کے بعد کرنسی نوٹوں پر چھپنے والے تھے۔ آئی ڈی کے دستخطوں پر غور کرنے کے لئے خاندان کے تمام افراد جمع ہو گئے۔ لیکن تقریباً ایک سو

اور باقی دستخطوں میں سے کسی ایک پر بھی دو افراد متفق نہ ہوسکے تو مسٹر پیپٹ نے وہ تمام کے تمام دستخط بھیج دیئے۔

دسمبر کے آخر میں روانگی کے وقت جب اس نے خالہ گرٹ اور خالو جی کو خدا حافظ کہنا چاہا تو شدت جذبات سے اس کا دم گھٹنے لگا اور وہ اپنی زبان سے ایک حرف بھی ادا نہ کر سکا۔

"تمھارے ماں باپ بھی تم پر فخر کر رہے ہوں گے، میری بیٹی ___ اور مجھے بھی تم پر ناز ہے۔" خالہ گرٹ نے کہا۔

مسٹر پیپٹ کو نیا دفتر سنبھالنے سے پہلے سینیٹ فائننس کمیٹی کے روبرو پیش ہونا تھا اسے یہ فکر لاحق تھی کہ نہ جانے کمیٹی میں اس سے کیا کچھ پوچھا جائے۔ ممکن ہے سینیٹ کے ممبر اس سے بہت مشکل سوال پوچھیں۔ لیکن ضابطے کے مطابق شائستگی کے ساتھ چند سوالات کے بعد سفید بالوں والے سینیٹر بول اٹھے: " مجھے انتہائی مسرت ہے کہ کمیٹی آپ جیسی دلفریب اور شاندار خاتون کی تقرری کی تصدیق کر رہی ہے۔"

خزانے کا نیا سکریٹری جارج ہمفری، چوڑے چکلے سینے والا شخص تھا۔ اس سے اور دوسرے عہدے داران سے ملاقات کے دوران میں خرچ کے سرمائے کی تفصیلات، قرض کے انتظامات اور صیغۂ مال سے متعلق پالیسیوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے آئی وی کا سر چکرا گیا۔ لیکن اس نے مستعد اور ہوشیار نظر آنے کی پوری پوری کوشش کی اور بعد میں غور کرنے کے لئے جلدی جلدی کچھ مختصر سوالات نوٹ کر دیئے۔ اس میٹنگ کے خاتمہ پر اس نے خود اپنے آپ سے سوال کیا کہ کیا واقعی وہ میٹنگ میں اپنے فرائض ادا کر سکی ہے؟

جس وقت آئی وی نے خزانچی کے عہدے کا حلف لیا، اس کے بچے بھی اس تقریب میں شریک ہوئے اور پھر اس کے ہمراہ اس کے دفتر بھی گئے۔ ننھے منے رائے نے آئی وی کے دفتر میں نصب شدہ شاہ بلوط والے گھنٹے کو جس کے اوپری سرے پر "ٹریشیا آف دی یونائیٹڈ سٹیٹس" کی مہر لگی ہوئی تھی بڑے غور سے دیکھا۔ اس گھنٹے اور عظیم الشان فرنیچر کو دیکھ کر اس نے کہا "ممیا! امی، ریاست ہائے متحدہ کا خزانچی بن کر آپ کو کیا محسوس ہو رہا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم، میرے بیٹے" آئی وی نے جواب دیا۔

بچوں کے چلے جانے کے بعد مسز پیپٹ کو گزرے ہوئے دنوں کا خیال آیا کہ کس طرح اس کی ماں اسے سیاست میں لائی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں اپنی مرحوم ماں کا مختصراً شکریہ بھی ادا کیا۔ پھر اچانک پینسلوانیا ایونیو سے گزرنے والی ایک کار کی آواز نے اسے ماضی سے حال کے آغوش میں واپس پہنچا دیا۔

اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد آنے والے عرصے میں مسز پیپٹ سول سروس کے ایک مسکین اور معتمد ملازم فریڈ چرچ پر انتہائی بھروسا کرتی تھی۔ فریڈ برسوں سے سول سروس میں خدمات انجام دے رہا تھا۔ مسز پیپٹ کا کام ایک طرح کارپوریشن کے خزانچی کے کام کے مطابق ہی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس پر زیادہ بڑی رقموں کی ذمہ داری تھی اور طرز کارکردگی زیادہ پیچیدہ تھا۔ آئی ڈی کو ان تمام رقموں کا حساب رکھنا ہوتا تھا جو بہ استثنائے متوقع کہ افراد سے یا ریاستوں اور بیرونی ممالک سے موصول ہوتی تھیں اور تمام ادا کی ہوئی رقوم کا بھی حساب رکھنا پڑتا تھا۔ حکومت کی تحویل میں سونے اور چاندی کی جو سلاخیں تھیں ان کی فہرستوں کی نگرانی بھی آئی ڈی کے ذمے تھی، اور وہ جعلی سکے بنانے والوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی نگرانی بھی کرتی تھی۔ ان تمام کاموں کے لئے اس کے پاس بارہ سو اسسٹنٹ موجود تھے لیکن تین سو کھرب ڈالر کی ذمہ داری تنہا اس کے سر تھی۔

ایک دن ایک اسسٹنٹ نے مسز پیپٹ کو اعداد و شمار کی ایک پیچیدہ فہرست پیش کی۔ چونکہ اس فہرست کو ماہرین نے تیار کیا تھا اس لئے اسے صرف دستخط کرنے کی ضرورت تھی لیکن کسی چیز نے اسے اعداد و شمار چیک کرنے پر اکسایا۔ چنانچہ اس نے فہرست چیک کی اور اس میں ایک غلطی بھی تلاش کر لی۔ اس سے نہ صرف اس کی خود اعتمادی کو اور زیادہ تقویت ملی بلکہ دوسروں کا بھی اس پر اعتماد اور بڑھ گیا۔

مسز پیپٹ کو دفتر سے باہر کی زندگی بڑی پریشان کن معلوم ہوتی تھی۔ اس کی میز پر بھی اور سرکاری تقریبات کے دعوت ناموں کا انبار لگا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے گھر کو باقاعدہ رکھنے کے لئے گھریلو کاموں میں بھی دلچسپی لیتی تھی۔ کپڑوں کی خریداری بھی خود کرتی تھی۔ نیشنل کمیٹی کے کاموں کی تکمیل میں بھی مصروف رہتی اور اپنے بچوں کے ساتھ مصروفیات کے منصوبے بھی بناتی

رہتی تھی۔ اس کا صبح کا ناشتہ ہی ایسا کھانا تھا جس میں وہ اپنے گھر اور اپنے بچوں کے ساتھ شریک ہو سکتی تھی۔ اس لئے وہ صبح چھ بجے ناشتہ تیار کرنے کے لئے اٹھ جاتی تھی۔ باؤنٹی فل سے جو گھریلو ملازم وہ اپنے ہمراہ لائی تھی، وہ اپنے گھر کی یاد میں ملول ہو کر واپس اپنے وطن چلا گیا تھا۔ اس ملازم کے چلے جانے کے بعد گھریلو کام کاج بچوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ کیونکہ آئی ڈی نے اپنے بچوں کو شروع ہی سے ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا سکھا دیا تھا۔ بچوں میں کبھی آپس میں جھڑپ بھی ہو جاتی تھی لیکن اپنے فرائض سے پہلو تہی کرنے کا خیال کبھی ان میں پیدا نہیں ہوتا تھا۔

آئی ڈی کی تنخواہ بارہ ہزار ڈالر تھی۔ لیکن واشنگٹن میں اسے جو معیار زندگی برقرار رکھنا پڑتا تھا، اس کے لحاظ سے یہ تنخواہ کم تھی، چنانچہ وہ کچھ کفایت شعاری سے بھی کام لیتی تھی۔ مثلاً فنا کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے اسے منجمد کر لیا کرتی تھی۔ یا شرٹ چھیلنے کا کام وہ اپنے واشر زنگر سے کیا کرتی تھی۔ ہر ہفتے کے دن یہ خاندان بازار سے اشیاء کی خریداری کرتا تھا اور ہر بچہ بازار کے کسی مخصوص شعبے کی خریداری کا کام انجام دیتا تھا۔ مسز پیسٹ کی خواہش تھی کہ اس کے بچے سادہ زندگی گزارنے کے عادی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان میں یہ احساس بھی پیدا کرتا چاہتی تھی کہ بچے اپنے گھر میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو دوسروں کی ہوتی ہے۔ اتوار کا دن وہ آزادی سے بسر کرنے کی کوشش کرتی تھی چہ پہچاسے آنے کے بعد خاندان کے سب افراد کچھ کام کرتے تھے یا اپنی اپنی پسند کے مطابق اپنے ذوق کی مصروفیات میں لگ جاتے تھے۔ بیٹی کو مصوری اور اداکاری کا شوق تھا۔ نینسی بیٹے کی دلدادہ تھی۔ ارائے میکانکی اور سائنسی ذہن کا حامل تھا اور اپنے کیمسٹری کے سیٹ پر تجربات کر کے سارے گھر کو کیمیاوی بخارات سے بھر دیا کرتا تھا۔ مسز پیسٹ مہینے میں کم از کم ایک بار سینیچر اور اتوار منانے کے لئے کہیں نہ کہیں چلی جایا کرتی تھی۔

ماہ اپریل میں مسز پیسٹ نے اپنی زندگی میں پہلی بار وہائٹ ہاؤس کے ڈنر میں شرکت کی۔ سفید کپڑے سے ڈھکی ہوئی ایک ٹیبل پر سنہرے ظروف سجے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی نشست سنبھالی۔ اس کی ٹیبل سے تیسرے نمبر پر خوش شکل صدر آئزن ہاور کی ٹیبل تھی۔ آئی ڈی کے خیالات گزرے ہوئے ان دنوں کی جانب چکر کاٹنے لگے جب وہ وقتاً فوقتاً کانوں کے ویران قصبوں میں موٹے اور بھدے پیالوں میں پتلا دھواں سا سوپ پیا کرتی تھی۔ یہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ کبھی وہائٹ ہاؤس کے قریب بھی پھٹک سکے گی۔

دفتر کے ضابطے دشوار سے دشوار تر ہوتے گئے۔ اسے کسی دن اپنے مقررہ پروگرام میں کسی ڈپلومیٹ کے استقبال کو شامل کرنا پڑتا، یا کسی کلب میں خطبۂ صدارت پڑھنے کی مصروفیت نکل آتی۔ یا کسی دن اپنے کاموں میں بجٹ کانفرنس یا سٹی ویمن پیش ہونے کا اضافہ کرنا پڑتا تھا پالیسی اگرچہ وہ خود طے نہیں کرتی تھی لیکن اسے اکثر و بیشتر مختلف جماعتوں میں پالیسی کی وضاحت کے لئے بھی مدعو کیا جاتا تھا۔

مسز پرپیٹ کے پاس بے شمار خطوط آتے تھے، ان میں کچھ حماقت آمیز خطوط بھی شامل ہوتے تھے مثلاً ایک خط میں اُسے مشورہ دیا گیا تھا کہ امریکہ کو ڈالر نوٹوں کی پشت پر معاوضے کے عوض اشتہاروں کی اشاعت کرنی چاہئے۔

پھر فالج کے ایک حملے کے باعث رائے کے لئے زندگی کی مصروفیات سے کنارہ کشی کرنا ضروری ہو گیا۔ آئی وی کو یہ فکر لاحق ہو گئی کہ ایسی حالت میں رائے کیسے گزارہ کرے گا، چنانچہ وہ رائے کو فلیٹ لے آئی۔ تب کہیں اسے سکون حاصل ہوا۔ رائے کو مکمل آرام پہنچانے کے خیال سے دروازوں کی چوں چوں اور بچوں کا شور و غل ختم کرا دیا گیا۔ گرمیوں کے موسم میں آئی وی کا خاندان یا تو یادنٹی فل میں خالہ گرٹ کے یہاں چلا جاتا، یا پھر جیکسن ہول (وایومنگ) جہاں دونوں رائے مچھلی کا شکار کھیلا کرتے تھے۔

پھر بیٹی نے وہائٹ ہاؤس کے ایڈی کانگ اور نیوی کے ہوا باز پرسی جیکسن سے شادی کی تو پرپیٹ اور اس کے خاندان نے پوری دھوم دھام سے شادی کی تقریب منعقد کی۔ اگلے سال موسم بہار میں آئی وی اور رائے یونان کے لئے روانہ ہو گئے، جہاں آئی وی کو خواتین کی جماعتوں سے خطاب کرنا تھا۔ آئی وی نینسی اور رائے جونیئر کی دیکھ بھال کا کام بیٹی اور پرسی کے سپرد کر گئی۔ اس سمندری سفر کے دوران میں آئی وی کو پتہ چلا کہ اس کا سوٹ کیس جس میں تقریباً سب اسی کے کپڑے تھے روانگی کے وقت کہیں رہ گیا ہے۔ اس اطلاع سے آئی وی بے حد پریشان ہوئی۔ جہاز کے عرشے پر آئی وی کی ایک خاتون سے دوستی ہو گئی تھی۔ اس خاتون نے اسے ایک سفید چادر مستعار دی جس سے وقت کے وقت اس نے اپنے لئے لباس بنا لیا۔

جبرالٹر کے باہر ایک بحری تار کے ذریعے آئی وی کو خالہ گرٹ کے انتقال کی افسوسناک اطلاع ملی اس رات آئی وی جہاز کے عرشے پر بیٹھی ہوئی اس نقرئی راستے کو تکتی رہی جو چاند نے اپنی کرنوں سے

سیاہ پانی کی سطح پر بنا دیا تھا۔ اس کے رخسار دن بہ دن مرجھا رہے تھے۔ لیکن خالد اب ملک عدم سے واپس تو نہیں آ سکتی تھی۔

پرپیٹ اور رائے نے ویرنگ نیلیس میں قیام کیا۔ یہاں وہ اپنے کپڑے خریدنا چاہتی تھی۔ اور دھوپ میں نہاتے ہوئے، سمندر کے نظارے کے ساتھ اطالوی کھانے اور نیلپی موسیقی سے بھی لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔ جہاز کے عرشے پر واپس آنے کے بعد پرپیٹ نے یونان کی ملکہ فریڈریکا سے ملاقات کی۔ ملکہ ایک مسحور کن خاتون تھیں۔ ملکہ نے مادرانہ شفقت کے ساتھ آئی ڈی کو سمور کا وہ کوٹ دکھایا جو انھوں نے شہزادی صوفیہ کے لئے خریدا تھا۔ انھوں نے پرپیٹ اور رائے کو اپنے ساتھ کھانے پر بھی مدعو کیا۔

پرپیٹ اور رائے کو آٹھ روز تک یونان کا دورہ کرنا تھا۔ موٹر کار کے ذریعے انھوں نے انجیر زیتون اور پستے کے درختوں سے ڈھکی ہوئی ناہموار سڑکوں کا سفر کر کے اپنا یہ دورہ مکمل کر لیا۔ کورنتھ میں انھوں نے کھدائی کے ذریعے برآمد شدہ آثار قدیمہ دیکھے۔ ڈیلفس میں قدیم گول نما شاہراہ کے کھنڈرات کی سیاحت کی۔ اور ایتھنز میں بالا حصار دیکھا جو قدیم یونانی شہروں کی خصوصیت ہوا کرتا تھا۔

واشنگٹن واپس آ کر آئی ڈی کو اپنے داماد پرسی کا ٹیلی فون موصول ہوا۔ اس نے بتایا کہ پرسی اینڈریو جینیس سوئم کی پیدائش ہوئی ہے۔ یہ خبر سن کر آئی ڈی کا دل باغ باغ ہو گیا۔

۱۹۵۶ء میں مسز پرپیٹ نے سان فرانسسکو میں منعقدہ ری پبلکن کنونشن میں شرکت کی پھر کار کے ذریعہ کنیڈا جاتے ہوئے رینی پولیس میں اپنے خاندان کے افراد سے ملاقات کی۔ اگلے سال ستمبر میں آئی ڈی نے آئزن ہاور کے دوبارہ انتخاب کے لئے انتہائی تندہی اور تیز رفتاری سے انتخابی مہم میں حصہ لیا۔ یہاں تک کہ اس دوران میں اس کی آواز بیٹھ گئی۔ ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق کچھ عرصہ آرام کرنے کے بعد وہ الاسیڈا روانہ ہو گئی جہاں بیٹی اور اس کا خاندان بیٹی کے صحت یاب ہونے تک کے لئے منتقل ہو گیا تھا۔

اس کے بعد ایک بار پھر وہ اپنے کام پر واپس آ گئی۔ اس نے اپنے گھر کے بجٹ کی طرح بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ کھربوں ڈالر کی بچت کر دکھائی اور اپنے شعبے کے چالو اخراجات میں بیس لاکھ ڈالر سالانہ کی کمی کر دی۔

آئی ڈی کو اپاہج بچوں کے لئے چندہ جمع کرنے سے بھی دلچسپی تھی چنانچہ ۱۹۵۰ء میں ایسٹر کے ٹکٹوں کی فروخت کے لئے اس نے اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کر دیں۔ ایک شام لاس اینجلس میں این بی سی کے اسٹیشن میں وہ ایسٹر کے ٹکٹوں کی فروخت سے متعلق اپنی تقریر شروع کرنے ہی والی تھی کہ رالف ایڈورڈز اسٹوڈیو میں آیا اور اس سے ہال میں چلنے کی درخواست کی۔

"یہ آپ کی زندگی ہے" کی اسٹیج پر آئی ڈی کو بیکر کا بچپن والے مکان کا نقشہ نظر آیا۔ اس کا بھائی فرنٹ اسٹیج کی جانب لپکا۔ آئی ڈی کے دوسرے بھائی کینتھ اور لائیڈ اور اس کی بہن گرٹروڈ نے بھی فرنٹ کی تقلید کی۔ جب یہ منظر تبدیل ہوا تو آئی ڈی کے پرانے دوست دکھائے گئے۔ اور پھر اپنے تین بچوں کے ساتھ اس کا داماد پرسی اور بچی بھی اسٹیج پر نظر آئے۔ یہ مناظر دیکھ کر آئی ڈی اس قدر متاثر ہوئی کہ اس میں باقی مناظر دیکھنے کی سکت باقی نہیں رہی۔

دوسری صبح وہ پھر اپنی انتخابی مہم میں مصروف ہو گئی۔ لیکن مسلسل کئی دنوں کے سفر اور تقریروں کے باعث وہ بے حد تھک گئی تھی۔ انڈیاناپولیس میں اس کی آواز بیٹھ گئی اور اسے مجبوراً اپنا دورہ منسوخ کرنا پڑا۔ واشنگٹن میں بیماری کے بعد کی نقاہت کے دوران میں اس کے خاندان کے افراد بے چینی کے عالم میں اس کے گرد چکر کاٹتے رہے۔ آئی ڈی انتہائی کرب کے ساتھ سوچتی تھی کہ اس نے گھریلو زندگی اور عوامی زندگی دونوں میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش میں دونوں طرح کی زندگی تباہ کر ڈالی ہے۔ لیکن صحت یاب ہو جانے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ ایک عورت اگر ان دونوں چیزوں میں توازن قائم رکھے تو وہ اپنے گھر کی ملکہ بھی بن سکتی ہے اور ایک ترقی یافتہ خاتون بھی۔ چنانچہ آئی ڈی نے اپنی زندگی کے عوامی پہلو کو اس کے مطالبات کے مطابق محدود کر لیا۔ اپنے پروگراموں کو دوبارہ ترتیب دے کر وہ سیاست اور سوسائٹی کے لئے اپنی خدمات جاری رکھ سکتی تھی۔ لیکن اس نے بہت سے سماجی کام اور تقریری مصروفیات ترک کر دیں۔

صحت یاب ہونے کے بعد مسز پیسٹ نے دوبارہ دفتر جانا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں اس نے اپنے معمولات کو محدود رکھا لیکن بعد میں دفتر میں پورا وقت دینے لگی۔ ۱۹۵۰ء میں آئی ڈی نے اپنی ایک کتاب "گریٹ گرینڈ آئی ڈی" شائع کرائی۔ اس کتاب کو اپنے شوہر، اپنے بچوں اور اپنے والدین کے نام منسوب کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ "جنھوں نے آئی ڈی کو (عشق پیچہ) اس طرح

دکھایا گیا وہ بڑھتا ہی رہے گا۔ انتہائی پُر تاثر اسلوب اور بے لاگ طریقے سے لکھی ہوئی اس کتاب میں ایک افسرِ دفتر کارکن کے حکومت کے اعلیٰ عہدے تک پہنچنے کی ارتقائی داستان بہت سے ڈرامائی اور پرمزاح واقعات کے ذریعہ بیان کی گئی ہے۔

تنگ دستی آفس کی بیکر پریسٹ کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی تھی۔ لیکن اس کے خواب، اس کا راسخ عقیدہ اور یہ خیال کہ لیاقت کو دوسروں کے فائدے کے لئے استعمال کرنا چاہئے، اس کو ایک عظیم خاتون کے مرتبے تک پہنچا دینے کا باعث ہوئے۔

---

*

فلورنس سیبن

معلم، سائینس داں اور انسان دوست

یہ سائینس کا عہد ہے۔ اس عہد میں سائینسی تحقیقات سے دلچسپی رکھنے والی لڑکیوں کو وہ مواقع اور امکانات میسر آئیں گے۔ جن سے خواتین کو اپنے ترقی یافتہ ہونے کی مثالیں پیش کرنے کا موقع ملے گا۔ ابھی کچھ برس پہلے تک سائینسی لیبارٹریوں میں عورتوں کو شامل نہیں کیا جاتا تھا لیکن ڈاکٹر فلورینس رینا سیبن جیسی پیشواؤں کے کارناموں نے سائینس کے دروازے خواتین کے لئے وا کردیئے ہیں۔

سیبن کے خاندان میں دو طبیعاتی علوم قدرتی طور پر موجود تھے۔ سیبن کے دادا ورمونٹ میں طبیب تھے۔ اس کے والد جارج کمپل سیبن نے اپنی گھوڑا گاڑی میں گھوم پھر کر چلتا پھرتا ڈاکٹر کے طور پر اپنا مستقبل بنانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ جارج کمپل نے اپنے بچپن میں کہانیوں میں سنا تھا کہ سینٹرل سٹی (کولوریڈو) کے اطراف کی پہاڑیوں میں سونے کی کانیں ہیں۔ ان کہانیوں نے ان کے خیالات میں گرمی پیدا کردی تھی۔

۱۸۶۰ء میں اس مشہور شہر میں آجانے کے بعد مسٹر سیبن کو جلد ہی کان کنی کے نگراں کے طور پر ملازمت مل گئی لیکن کمپل سیبن سینٹرل سٹی میں آنے کے بعد اس حسین دوشیزہ کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوگیا جو ایک گاڑی پر سوار شہر میں چکر لگاتی رہتی تھی۔ سیبن کو پتہ چلا کہ اس لڑکی کا نام سیرینا منر ہے اور وہ اسکول میں پڑھاتی ہے۔ ان دونوں میں موسیقی وغیرہ کا ذوق مشترک تھا چنانچہ جلد ہی یہ ایک دوسرے کے قریب آگئے۔

شادی ہوجانے کے بعد انھوں نے ایک ڈھلوان پہاڑی کے دامن میں بنے ہوئے ایک کمرے والے

منزلہ مکان میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کی پہلی بچی میری کے بعد ۹ر نومبر ۱۸۷۰ء کو ایک لڑکی فلورینس پیدا ہوئی۔ جب یہ لڑکی چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو پہاڑی کے دامن میں ارغوانی کو بلیا ئن اور انڈین پینٹ برش کے پھول توڑنے کے لئے ادھر ادھر پھرنے لگی۔ یہ پھول توڑ کر وہ انتہائی محبت سے اپنی ماں کو پیش کیا کرتی تھی۔

فلورینس جب چار برس کی تھی، اس وقت کانوں سے سونے کی برآمد روز بروز کم ہو رہی تھی۔ چنانچہ کانیں عملی طور پر اس وقت بند کر دی گئیں اور سیبن کو ایک معمولی سے قصبے میں منتقل ہو جانا پڑا۔ یہ قصبہ آج کل ڈینور کے نام سے مشہور ہے۔ بعض اوقات فلورینس اور میری چھت کر کے ڈینور کی سکسٹینتھ اسٹریٹ تک چکر لگا آتی تھیں۔ اس اسٹریٹ پر اکثر انھیں یوٹی اور ایپا ہو قبائل نظر آ جاتے تھے جو شہر کے نواح میں پڑاؤ ڈالے پڑے رہتے تھے۔

ایک ہیلووین[۱] کے موقع پر مسز سیبن نے اپنی بیٹیوں کو بتایا کہ ان کے یہاں ایک ننھا سا بھائی آیا ہے جس کا نام البرٹ رکھا گیا ہے۔ فلورینس نے بچے کو پیار کیا۔ لیکن ماں کی دھندلائی ہوئی اشک آلود آنکھیں دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی۔ ماں کی علالت کے باعث گھر کا کام کاج لڑکیوں نے سنبھال لیا تھا اور مسٹر سیبن انھیں کھانا پکانا بھی سکھا رہے تھے۔ لیکن مسز سیبن کے چہرے پر دائمی طور پر نقاہت بدستور موجود رہی پھر جب فلورینس سات برس کی تھی اس وقت ماں کا انتقال ہو گیا۔

ماں کی تجہیز و تکفین کے لئے سینٹرل سٹی سے خالہ من اور شکاگو سے خالو البرٹ سیبن ڈینور آئے، لیکن یہ لوگ فلورینس کی پامال شدہ دنیا کو دوبارہ زندگی سے ہمکنار نہ کر سکے۔ فلورینس اپنے بستر میں پڑی بڑی رنج و غم کے باعث اپنے گلے میں اٹکی ہوئی گانٹھ کو نگلنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس نے خالہ من کو کہتے ہوئے سنا، "میرے بس میں ہوتا تو میں انھیں لے جاتی —— لیکن ...." خالہ من کی آواز ان کی سسکیوں میں ڈوب گئی تھی۔

بعد ازاں مسٹر سیبن نے ڈینور کے ایک بورڈنگ اسکول میں لڑکیوں کا انتظام کر دیا۔ گو لفٹ ہال نامی اس بورڈنگ اسکول میں ان لڑکیوں کو جھولے، اوپر نیچے ہونے والے تختے، دوست، احباب اور مشفق نرسنگ میسر تھے، لیکن ماں کی جگہ کون لے سکتا تھا؟ ہر رات فلورینس ماں کو یاد کر کے چلانے لگتی تھی۔

---

[۱] عیسائیوں کا ایک مقدس مذہبی دن جو ۳۱ر اکتوبر کو واقع ہوتا ہے۔

شروع شروع میں مسٹر سیبن لڑکیوں سے ملنے بلاناغہ آتے رہتے تھے۔ لیکن بعد میں انہیں اپنے کام کے سلسلے میں لیشغل منتقل ہو جانا پڑا۔ اس سال گرمیوں میں اس وقت تک ان دونوں کو اسکول لڑی میں رہنا پڑا جب تک مسٹر سیبن نے انہیں دو ہفتے اپنے ساتھ گزارنے کے لئے اپنے پاس نہ بلا لیا۔ فلورینس نے ایک طویل عرصہ سے باپ کو نہیں دیکھا تھا۔ اب وہ باپ سے شرمانے لگی تھی۔ لیکن مسٹر سیبن اسے ایک واٹر پروف کوٹ اور سرخ رنگ کا موٹا سا ہیٹ پہنا کر اپنے ہمراہ کان ہن لے گئے۔ کانوں کی اس سیر میں باپ اور بیٹی کے درمیان پرانا تعلق پھر بحال ہو گیا۔

نومبر ۱۹۰۰ء میں ننھے البرٹ کا بھی انتقال ہو گیا۔ وہ صرف ایک برس تک ہی زندہ رہ سکا تھا۔ بھائی کے انتقال کے بعد فلورینس کا تعلیم کی جانب سے دل اچاٹ ہو گیا اور کھانے پینے کی چیزوں، کھلونوں اور کھیلوں سے بھی اس کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ وہ بڑی فکر سے یہ سوچتی رہتی تھی کہ کیا اسے اور میری کو ہمیشہ ودلف ہال ہی میں رہنا پڑے گا۔ مگر خالو البرٹ نے جو شکاگو کے ایک اسکول میں معلم تھے غیر متوقع طور پر ان لڑکیوں کو اپنے گھر رکھنے کے لئے شکاگو بلا لیا۔

فلورینس کی خالہ نے پوری شفقت کے ساتھ ان کی پرورش شروع کر دی۔ خالو البرٹ فلورینس کو موسیقی کے اجتماعات میں لے جانے لگے۔ فلورینس ایک ہونہار لڑکی تھی، چنانچہ خالو نے اس کے نشوونما پاتے ہوئے ذوق و شوق میں دلچسپی لی اور اس کے مطالعے کے ذوق کی ہمت افزائی کی۔ سب سے زیادہ پذیرائی ظاہر کرتے تھے اور اس سے کہا کرتے تھے کہ: "ایک دن تم اپنے باپ کا گھر بساؤ گی لیکن سردست تو یہی تمہارا گھر ہے۔"

جب فلورینس بارہ برس کی ہوئی تو اس وقت تک اس کے دادا اور دادی بھی حیات تھے اور ورمونٹ میں ووڈسٹاک کے قریب سیبن خاندان کے قدیم دیہاتی مکانوں میں سکونت پذیر تھے۔ انہوں نے سردیاں گزارنے اور اس دوران میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے فلورینس کو اپنے پاس بلا لیا۔ دادی نے فلورینس کو مزے دار کہانیاں سنائیں اور نئے طرح طرح کے کھانے پکا کر کھلائے۔ فلورینس نے دادی سے یہ سبق سیکھا کہ پہلے اپنا کام کرنا چاہیے اور اس کے بعد کھیل یا تفریح میں شریک ہونا چاہیے۔ ورمونٹ میں فلورینس کا دل لگ گیا تھا اور وہ وہاں بہت دنوں تک رکنا چاہتی تھی لیکن بدقسمتی سے دادی کا انتقال ہو گیا۔ ایک بار پھر بے آسرا ہو جانے کے بعد وہ اپنی بہن میری سے ملنے کے لئے شکاگو چلی آئی۔ وہاں سے

یہ دونوں بہنیں اپنے باپ کے پاس ڈنیوڈ چلی گئیں۔

فلورنس کو چودہ سال کی عمر میں موسیقی سے بے حد دلچسپی ہو گئی تھی۔ جب وہ اور میری ووڈنٹ اکاڈمی میں داخلہ لینے کے لئے سیکس ٹنس پڑھنے گئیں تو ایک پیانو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ ایک دن فلورنس اپنے پیانو پر ایک طرز کی مشق کر رہی تھی۔ اس کے ہم جماعتوں نے اسے گھیر لیا اور اس سے کوئی راگ سنانے کی درخواست کی۔

ایک سہیلی نے اس سے پوچھا "میں نہیں سمجھ سکتی کہ تم ہمیشہ پیانو بجاتی کرتی مشقیں کیوں کرتی رہتی ہو؟"

"میں موسیقار بننا چاہتی ہوں، اسی لئے یہ مشقیں کرتی رہتی ہوں"

"لیکن تم ایک معمولی موسیقار سے زیادہ کچھ نہ بن سکو گی" ایک لڑکی نے منہ پھٹ طریقے سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

یہ رائے بہت سخت تھی، لیکن فلورنس اتنی صداقت پرست تھی کہ اس نے سوچا، شاید یہ لڑکی ٹھیک ہی کہتی ہو۔ پھر وہ پیانو سے اٹھی اور تنہا ٹہلنے کے لئے باہر چلی آئی۔ اس نے سوچا کہ اس میں جو صلاحیتیں بھی موجود ہوں ان کو بروئے کار لانا اس کا فرض ہے اور ساتھ ہی اس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ اگر وہ موسیقی میں امتیازی حیثیت حاصل کرنے کی اہل نہیں ہے تو اسے موسیقار کے طور پر اپنا مستقبل نہیں بنانا چاہئے

اس نے یہ بھی سوچا کہ اگر وہ گوٹے کھیلنے میں اور بلوری کنواریوں کے کھیل میں اپنی تمام صلاحیتوں کا کم سے کم وقت ضائع کرے اور اپنا فالتو وقت موسیقی کی مشق میں لگائے تو ...... لیکن اسی لمحے اس نے محسوس کیا کہ موسیقی سے اُسے لگاؤ تو ہے، لیکن اتنا نہیں کہ وہ اپنی تمام زندگی موسیقی کے لئے وقف کر دے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آئندہ زیادہ سے زیادہ وقت مطالعے میں صرف کرے گی یہی اس کے لئے بہتر ہوگا۔

فلورنس جب اپنی تعلیم کے آخری سال میں پہنچی تو اسے وظیفہ ملنے لگا اور اسکول کے انتخابات میں اپنی جماعت کی صدر منتخب ہو گئی۔ اس کی اس کامیابی کو دادا نے بے حد سراہا اور اسے خط میں لکھا "جب تم کامیابی کی سند حاصل کر لوگی تو میں تم سے ملنے آؤں گا" لیکن مئی کے مہینے میں دادا کا انتقال ہو گیا۔

دوسرے سال خزاں کے موسم میں فلورنس میری کے ساتھ ہو گئی جنا سمتھ کالج میں تعلیم حاصل

کر رہی تھی۔ دونوں بہنوں میں اگرچہ بہت سی چیزیں مشترک تھیں، لیکن بہت سے معاملات میں ان دو نوں میں اختلاف بھی رہتا تھا۔ اسی تنازعہ چیزوں میں ٹینس بھی شامل تھا۔ میری نے ٹینس کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا تھا لیکن فلورینس کو ٹینس سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکی تھی۔ اسے ٹینس کھیلنے کے لیے پہنے جانے والے ان لمبے لمبے لہنگوں سے، جن کے دامن گرد و غبار میں گھسٹتے رہتے تھے سخت الجھن ہوتی تھی میری خوشی خوشی سماجی تقریبات کی منتظر رہا کرتی تھی۔ لیکن فلورینس شرمیلی طبیعت کی تھی اور روزمرہ کی عام گفتگو میں بھی ہوشیار نہیں تھی۔ اس لئے بعض اوقات وہ ان تقریبات میں شرکت کرتے ہوئے جھجک محسوس کرتی تھی۔ لیکن جب کیمسٹری کے پچیس طلبا کا ایک گروہ اپنے پروفیسر سے سیمینار میں گفتگو کرنے اور لیبارٹری میں تیار کردہ چائے پینے کے لئے جمع ہوتا تو اس موقع پر فلورینس کو کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔

جب میری امتحان پاس کرنے کے بعد ڈرہمند کے پبلک اسکول میں استانی بن گئی تو فلورینس کو بڑی شدت سے اس کی کمی محسوس ہونے لگی، اور اسے ہر چیز تغیر پذیر نظر آنے لگی۔

فلورینس کے ایک ہم جماعت نے جب اس سے مستقبل کے منصوبوں کے متعلق دریافت کیا تو اس نے کہا، "ابھی تک میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ لیکن مجھے فیصلہ کر لینا چاہیئے۔ مجھ جیسی معمولی شکل و صورت کی لڑکی کو شادی کرنے کا موقع تو میسر ہی نہیں ہو سکے گا۔"

"لیکن تم معمولی لڑکی نہیں ہو۔" اس کی سہیلی نے اس کی بات کو رد کرتے ہوئے پورے خلوص سے کہا۔

"میرے بال کس قدر بل دار ہیں، اور چشمے کے بغیر تو میں بالکل اندھی ہوتی ہوں۔" فلورینس نے پلٹ کر جواب دیا۔

مگر فلورینس نے اپنی شکل و صورت کی شائستگی پر وقت ضائع نہیں کیا۔ اس نے حیوانیات، حیاتیات اور متعلقہ کورسوں کو ختم کرنے کے بعد ڈاکٹر بننے کا فیصلہ کر لیا۔

اسمتھ کالج کے معالج ڈاکٹر کیرس پریسٹن نے اس کی ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا، "تم میں صلاحیت ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا کہ ایک عورت کے روپ میں تم اس میدان کی پہلی مہم جو ہوگی۔"

اس موضوع پر پوری طرح غور و فکر کرنے کے بعد فلورینس اپنے ان کاموں کو انجام دینے کے لئے اپنی سیٹ پر واپس آگئی جو دوسرے دن کے لئے اس کے سپرد کئے گئے تھے۔ لیکن ان کاموں میں

اس کا دل نہیں لگا اور وہ ایک کاغذ سامنے رکھ کر بے مقصد ہی اس پر بار بار "فلورینس، سیمن، ایم، ڈی" لکھتی رہی۔

مسٹر سیمن کا کاروبار اچانک سرد پڑ گیا اور فلورینس کی طبی تعلیم کا بار اٹھانا ان کے لئے نا ممکن ہو گیا لیکن اس کے باوجود وہ فلورینس کو ڈاکٹری کی تعلیم دلانے کے خواہش مند تھے۔

فلورینس کے آخری سال کے دوران میں ڈاکٹر پیسٹن نے اسے بتایا کہ آنے والے موسم خزاں میں جانسن ہاپکنس یونیورسٹی میڈیکل اسکول میں پہلی بار لڑکیوں کو داخلہ دیا جائے گا۔ انھوں نے فلورینس کو مشورہ دیتے ہوئے کہا، "تم بھی پہلے سال میں داخلہ لے سکتی ہو۔"

فلورینس نے مایوسانہ لہجے میں کہا، "داخلہ لینے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔"

ڈاکٹر پیسٹن نے اس کی دشواریوں کا اندازہ کرتے ہوئے کہا، "یہ تو معمولی بات ہے۔"

فلورینس نے محسوس کیا کہ واقعی بات تو معمولی ہے۔ گرمیوں کے صرف ایک موسم میں تو اس کی بچت اتنی نہیں ہو سکتی کہ وہ داخلہ لے سکے لیکن کبھی نہ کبھی تو داخلہ لے سکے گی۔

اسمتھ کالج سے امتیازات کے ساتھ ڈگری لینے کے بعد فلورینس ڈولف ہال میں ملازمت کر کے سرمایہ جمع کرنے کے خیال سے ٹرینوڈ چلی گئی۔ اسی اسکول میں وہ میری کے ساتھ طالب علمی کا زمانہ گزار چکی تھی۔

فلورینس کو تدریس کا پیشہ پسند آیا۔ ہفتے کے دن وہ قدرتی مناظر، سیر اور ورزش کے شوقین پیدل جانے والے طلبا کی نگرانی کرتی تھی۔ اس تفریح کی انتہا ایک پکنک کی صورت میں ہوتی تھی۔ اسکول کی سالانہ چھٹیوں کے موقع پر ڈینور کے ایک مالدار معالج کی بیوی مسز ایلا اسٹرونگ ڈینیسن نے فلورینس کو وسکونسن میں ایک جنیوا پر بنے ہوئے اپنے خاندان کے گرمائی مکانات میں چھٹیاں گزارنے کی پیش کش کی اور اس سے کہا، "آپ میرے اور اسٹرونگ کے پوتے پوتیوں کو نیچر میں زیادہ سائنٹفک انداز سے دلچسپی لینے پر مائل کر سکتی ہیں۔"

جنیوا میں قیام کے زمانے میں فلورینس ہر قسم اسٹرونگ کے چار بڑی عمر کے بچوں اور دو کم عمر بچوں کی نگہداشت کیا کرتی تھی۔ اسٹرونگ کے ایک رشتے کے بھائی شیلڈن کے دو بچے بھی اسٹرونگ کے یہاں آئے ہوئے تھے۔ انھیں بھی دوسرے بچوں کے ہمراہ فلورینس اپنے ساتھ لے لیتی تھی۔ ان بچوں کو دنیا ان کے معیار کے مطابق ان کی سمجھ میں آ جانے والی اصطلاحات کے ذریعہ انتہائی ولولہ انگیز طریقے پر بتا!

کرتی تھی کہ پھول کس طرح نشوونما پاتے ہیں، اور مینڈک کے انڈے سے ببلیا (مینڈک کا بچہ) کیسے بنتا ہے۔ اکثر اوقات بچے جو کچھ دیکھتے تھے اس کی تصویریں بھی بناتے تھے اور ان پر "جنگلی گلاب"، یا "مینڈک کا اندرونی شکم"، جیسے عنوان بھی چسپاں کرتے تھے۔

گرمیوں کے خاتمے تک فلورینس نے بچوں اور مسز ڈینیسن کو اپنا انتہائی گرویدہ بنا لیا تھا حالانکہ شروع شروع میں وہ مسز ڈینیسن کے حسن درشائستگی کے سامنے خود کو غیر مہذب اور بے سلیقہ محسوس کرنے لگی تھی۔ اس خاندان کے حسن ظن نے فلورینس کو حجاب اور تنہائی کے اس دلدل سے باہر نکلنے میں مدد دی جو تمام زندگی اسے گھیرے رہا تھا۔ مسز ڈینیسن نے اسے نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا: "اپنی ذہانت اور استعداد سے فائدہ اٹھانے کی خواہش مند رہا کرو۔"

ڈولف ہاں میں دو سال گزارنے کے بعد فلورینس اسمتھ کالج واپس چلی گئی۔ لیکن اب وہ یہاں اتالیق بن کر لوٹی تھی۔ اسی سال اسے گرمیوں میں میرن بائیولوجیکل لیبارٹری کی جانب سے وظیفہ مل گیا۔ فلورینس کا خیال تھا کہ اس نے ہاپکنس میں براہ راست داخلہ لینے کے لئے کافی رقم جمع نہیں کی ہے۔ لیکن اب وہ تقریباً پچیس برس کی ہو چکی تھی اور مزید انتظار کرنا قطعاً نہیں چاہتی تھی

جانس ہاپکنس کی یکسانیت آمیز عمارتوں نے فلورینس کو مرعوب نہیں کیا۔ لیکن اسے اپنی استعداد کی جانب سے فکر تھا کہ کیا وہ اس اعلیٰ شعبے کے سخت مطالبات پورے کر سکے گی۔ اس وقت اس شعبے کے صدر، ڈاکٹر ولیم اوسلر تھے جو دنیا کے مشہور ترین، ماہران علم الادویہ میں شمار ہوتے تھے فلورینس اپنی کارکردگی کو منتہائے کمال تک پہنچائے بغیر کبھی اپنے کام سے مطمئن نہیں ہوتی تھی۔ اس نے اپنی سرگرمی اور اپنی پرکار ترین روش سے پروفیسروں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ ڈاکٹر فرینکلن پین مال جو ایک ذہین سائنس داں تھے۔ فلورینس کے پسندیدہ استاد تھے۔ انھوں نے اپنی بیشتر تعلیم جرمنی میں مکمل کی تھی۔ وہ اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے، "تحقیقات میں حقیقت اور نظریے کے درمیان ایک واضح حد فاصل قائم کیا کیجیے۔"

فلورینس اپنا بیشتر وقت کلاس اور لیبارٹری میں گزارتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ "بین ہاؤس" میں رہنے والے میڈیکل کے دوسرے طالب علموں کے ہمراہ خوش وقتی بھی کیا کرتی تھی بے تکلفی اور خوش ذوقی نے اسے ایک زندہ دل دوست بنا دیا تھا۔ خواہ وہ بالٹی مور کی بیس بال ٹیم

کا کھیل دیکھ کر نعرہ تحسین بلند کررہی ہو یا والٹرس آرٹ گیلری میں کسی آرٹسٹ کی تصویریں دیکھ کر ان پر تبصرہ کررہی ہو۔ اس کا ہر جذبہ خلوص پر مبنی ہوتا تھا۔

جانس ہاپکنس میں سال دوئم کے دوران میں فلورینس نے ایک تحقیقی مقالہ لکھا جس کی بے حد تعریف ہوئی۔ اس نے مسٹر سیبن کو اس مقالے کی ایک کاپی ارسال کرتے ہوئے لکھا "آپ نے جو کچھ مجھے دیا ہے، میری یہ پیش کش اس سے کہیں کمتر درجے کی ہے" دسمبر میں اسے اپنے باپ کے انتقال کی خبر ملی۔ باپ کی تجہیز و تکفین کے لئے وہ طویل سفر کرکے ڈینور گئی۔ وہاں اسے اس بات کا شدید ملال رہا کہ وہ گھر رہ کر باپ کی خدمت نہ کرسکی۔ اس رنج و ملال کے عالم میں وہ اپنی بہن میری سے رخصت ہوکر واپس چلی آئی اور اپنے کاموں میں مصروف ہوگئی۔

جن دنوں وہ دماغ کی ساخت کے تشریحی مطالعے میں مصروف تھی۔ اس نے دماغ کا ایک ایسا سہ رخی ماڈل تیار کیا جس میں دماغ کے عام ڈھانچے پر نئے انداز سے روشنی ڈالی گئی تھی۔ ڈاکٹر مال نے بعد میں اسے مشورہ دیا کہ وہ عام استعمال کے لئے اس ماڈل کی نقلیں تیار کرائے چنانچہ یہ نقلیں تیار کرانے کے لئے وہ جرمنی روانہ ہوگئی۔ ۱۲ جولائی ۱۹۰۰ کو اسے فارغ التحصیل ہونے کی سند ملنے والی تھی۔ اس روز فلورینس نے زمردی رنگ کی ٹیوبل اور بڑے گھیر کی آستینوں والے اکاڈمک گاؤن کو پہنتے ہوئے انتہائی مسرت محسوس کی یہ گاؤن اس کے ڈاکٹر بن جانے کا اعلان تھا۔

اسی سال گرمیوں میں فلورینس نگراں کی آسامی پر مامور ہوگئی اور ریسرچ کے لئے کام نہیں کرسکی۔ ایک بار پھر وہ ایک چوراہے پر پہنچ چکی تھی۔ جہاں اس کے سامنے مختلف راہیں تھیں۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ اسے معالج بننا چاہئے یا لیبارٹری کا سائنس داں ؟ ممکن ہے ڈاکٹر کے طور پر وہ زیادہ شہرت حاصل کرلے۔ لیکن ایک محقق سائنس داں کے طور پر شاید اسے لیبارٹری کے باہر کوئی نہیں جان سکے گا اور جب کافی عرصہ تک تحقیقی کام کرنے کے باوجود اس کی تحقیقات تشنہ رہیں گی تو کیا اس عرصہ میں اپنی لگن کو برقرار رکھنے کے لئے اس میں صبر و تحمل اور ہمت برقرار رہے گی ؟ سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ بیماریوں کا شکار ہونے والوں کی خدمت کرنے کی بجائے بیماریوں پر فتح پانے کی کوشش کرے گی۔

پھر بالٹی مور کی ایک انجمن کی جانب سے جو خواتین کو سائنٹیفک تحقیقات کے لئے وظائف دیتی تھی۔ فلورینس کے لئے وظیفہ منظور ہو گیا، جس سے اسے اپنے فیصلہ پر قائم رہنے میں مدد ملی اس نے بے رنگ شریانی عروقِ جاذبہ کے عمل پر کام کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ یہ ان باریک شریانوں کی تحقیق کا کام تھا جو جسم کے تمام خلیوں میں وہ بے رنگ رطوبت پہنچانے کا کام کرتی ہیں جو ملف کہلاتی ہے۔ فلورینس یہ متعین کرنا چاہتی تھی کہ عروق جاذبہ کیسے پیدا ہوئے۔ اور کس طرح ان کا دائرۂ عمل بڑھا۔ اس تحقیق کے ساتھ ساتھ فلورینس نے دماغ کے مطالعے کا کام بھی جاری رکھا۔ چنانچہ لیبارٹری سے شائع ہونے والے ایک رسالے میں اس کی تحقیقات پر بحث کی گئی۔ اس رسالے کو جان ہاپکنس کے شعبہ سائنس نے بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور پسند کیا۔

کچھ لوگ فلورینس کو ناگوار حد تک سنجیدہ سمجھتے تھے، لیکن اسے کچھ اس کے دوست ہی بہتر جانتے تھے۔ فلورینس قدیم روابط کو زندہ رکھنے کے لئے کام کر رہی تھی۔ اور ان میں اس کا اہم ترین ربط اپنے خالو البرٹ سے تھا۔ ۱۹۰۱ء کے اختتام پر اس نے ایک خط میں خالو البرٹ کو لکھا "اس صدی کو میں آپ سے منسوب کرتی ہوں۔ آپ نے جس کام کی ابتدا کی تھی میں اسے انتہا تک پہنچانے والی ہوں"

گرمیوں کی چھٹیاں فلورینس ڈینور میں میری کے ساتھ اور لیک جنیوا میں ڈینیسن گھرانے میں گزارتی تھی۔ لیک جنیوا میں وہ خوب گھومتی پھرتی تھی۔ اور تیراکی کشتی رانی، ٹینس اور گھوڑ سواری کا لطف اٹھاتی تھی۔ وہ میری کے ہمراہ بھی اپنی چھٹیاں سرگرمی سے گزارتی تھی۔ دونوں بہنیں کسی دور دراز مقام پر ڈیرہ جمانے چلی جاتیں۔ اکثر اوقات وہ مختصر سی تیاری کر کے سمندر کے کنارے نیشنل پارک یا کسی ایسے مقام کی جانب روانہ ہو جاتیں جہاں انھیں قدرتی مناظر اور پہاڑوں کی سیر کا لطف میسر آ سکتا تھا۔

وظیفہ ختم ہو جانے کے بعد فلورینس نے لیبارٹری اسسٹینٹ کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ بعد ازاں اسے لیبارٹری کا شریک (ایسوسی ایٹ) بنا دیا گیا۔ پھر جان ہاپکنس کے اسٹاف میں تشریح الاعضاء کے معاون پروفیسر کے طور پر اس کی تقرری ہو گئی۔ فلورینس کی نمایاں تحقیقات نے اسے اس منصب تک پہنچا دیا تھا اور اس پر فائز ہونے والی وہ پہلی خاتون تھی۔

ڈاکٹر فلورینس سیبن جلد ہی سخت دشوار کام لینے والے استاد کے طور پر مشہور ہو گئی

لیکن وہ کسی چیز کو باطل دعویٰ کر کے آسان ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے علم تھا کہ علم الادویہ اور سائنٹفک ریسرچ، دونوں چیزوں کے لئے عزم و استقلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے خیالات جو اذہان میں جوشش پیدا کرتے ہیں، اس کے نزدیک معلومات سے بھرے ہوئے دماغوں سے زیادہ اہم تھے اس نے اپنی مدھر اور پرجوش آواز میں انتہائی تحریک انگیز لکچر دیئے۔ ان لکچروں میں اکثر اوقات وہ اپنی تحقیقات کے نتائج بھی شامل کر لیتی تھی۔ طالب علم اسے اپنا سمجھتے تھے اور محبت سے خالہ فلوسی، کہا کرتے تھے۔

لیبارٹری میں اگر کوئی طالب علم بدسلیقگی سے کام کرتا تو ڈاکٹر سیبن اسے تنبیہہ بھی کرتی تھی لیکن ان طالب علموں کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی ہمدردانہ ہوتا جو ریسرچ کا کام بہتر طریقے سے انجام دے سکتے تھے اور ریسرچ کے کام میں اپنی مہارت، استقلال، ذہانت اور دیانتداری کو پیش نظر رکھتے تھے۔ ایسے طالب علموں کو وہ ان کے ذوق کے مطابق چیدہ اختراعی منصوبے ان کے سپرد کرتی تھی۔ اس کے عزیز ترین شاگردوں میں ایک شاگرد ہنری ڈینیسن تھا جو منیویاس ایک کم عمر لڑکے کے طور پر اس کے لئے بلبلئے، سمندر (ڈاگ کے کیڑے) گھونگھے اور جینڈک پکڑ کر لایا کرتا تھا۔

تدریسی کاموں کی مصروفیات فلورینس کے اپنے محبوب تحقیقی منصوبوں کی راہ میں حائل نہیں ہوئیں۔ وہ اپنے منصوبوں پر بھی گھنٹوں کام کرتی تھی۔ سن ۱۹۱۳ء میں اسے جانس ہاپکنس یونیورسٹی نے لیپزگ جا کر پروفیسر اسپالٹی ہولز سے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے رخصت دے دی تاکہ وہ پروفیسر موصوف سے اجزا کے خوردبینی مطالعے کے طریقے سیکھ سکے۔ اسی سال اس نے اپنے ساتھ عروق جاذبہ پر تحقیقات کرنے کے لئے مزید سات اشخاص کو تیار کر لیا۔ اس کے اس نظریے سے اگرچہ یونیورسٹی کے بعض ذمہ داران کو اختلاف تھا کہ عروق جاذبہ وریدوں کی دیواروں سے نکلتے ہیں، لیکن اس کی تحقیقات قابل توجہ ضرور سمجھی گئی تھیں۔

جب فلورینس کو اس کے ان لوداد دوستوں نے روزمرہ دیرینہ تک تحقیقی کاموں میں مصروف رکھا تو اس نے احتجاجاً اپنے دوستوں سے کہا "میں جس قدر تندہی سے اپنے کام میں مصروف رہتی ہوں اسی قدر ذوق و شوق سے تفریح بھی کرتی ہوں" فلورینس کو تفریح کے بھی بھرپور مواقع میسر آتے تھے، جوان اور بچے اس کی قربت سے یکساں طور پر مستفید ہوتے تھے۔ فرینکلن ال کے یہاں

اس کی حیثیت تقریباً خاندان کے ایک فرد کی سی تھی۔ بہار کے موسم میں وہ اور مسیں مل پھولوں کی کلیاں توڑتے ہوئے باغوں میں دور تک پیدل قدمی کیا کرتی تھیں۔

فلورینس کے بہترین دوستوں میں ایڈتھ اور ڈاکٹر ڈونلڈ ہوکر شامل تھے۔ ان کے بیوی بچوں کے ساتھ وہ نانیاں چوستی، کتابیں پڑھتی اور کرسمس کے موقع پر رنگ برنگی ٹوپیاں پہنا کرتی تھی۔

ڈاکٹر سیبن کو اچھی باورچن ہونے کا تو دعویٰ نہیں تھا، لیکن اپنی لیبارٹری کی طرح سلیقہ مندی سے جگمگاتے ہوئے اپنے باورچی خانے میں وہ منفرد قسم کے سلاد تیار کیا کرتی تھی اور اس کے مہمان سیبن کی بنائی ہوئی آئس کریم پر، جسے وہ "سیبن آئس کریم" کہتے تھے، خوب خوب چٹخارے لیتے تھے۔ اس آئس کریم کو وہ شراب میں حل ہوئی شکر سے بنایا کرتی تھی۔ وہ جہاں کہیں رہتی، گھر کے اندر، اور اگر ممکن ہوتا تو گھر کے باہر بھی پھول اگایا کرتی تھی۔

ریاستہائے متحدہ کے پہلی جنگ عظیم میں شامل ہو جانے کے بعد ڈاکٹر سیبن نے اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ خود اپنی بڑھی ہوئی ذمہ داریوں کو محسوس کیا اور شدید گرمیوں کے موسم میں نرسوں کی تربیت کا کام کیا۔ پھر جب بالٹی مور میں انفلوئنزا پھیلا اور سینکڑوں افراد اس کا شکار ہوئے تو اس نے بالٹی مور جا کر خود ہی نرس اور خود ہی ڈاکٹر کے طور پر خدمات انجام دیں۔

۱۹۱۷ء میں فلورینس کے سابق استاد اور دوست ڈاکٹر مال کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت تقریباً ہر شخص کا یہی خیال تھا کہ فلورینس ڈاکٹر مال کی جگہ مامور کر دی جائے گی۔ لیکن اس کے بجائے جانس ہاپکنس یونیورسٹی نے فلورینس کو نسیجیات کے پروفیسر کا عہدہ دے دیا۔ یونیورسٹی کے طلبا نے اس معاملے پر دوبارہ غور کرنے کے لئے یونیورسٹی کے ذمہ داروں سے اپیل کی۔ پھر بالٹی مور کی خواتین کے ایک گروہ نے، جس نے وظیفہ دلانے میں فلورینس کی مدد کی تھی، اس سے دریافت کیا کہ کیا وہ انفلوئنزا کی وبا ختم ہونے کے بعد بھی بالٹی مور میں ہی قیام کرنا پسند کرے گی۔

فلورینس نے اس جماعت سے کہا، "ہاں، ہاں میں یہیں رک جاؤں گی۔" لیکن اپنا منکسر مزاجی کے باعث اس صورت حال کو قبول کر لینے کے بعد اس نے خود کو اس کا مورد الزام ٹھہرایا کہ اس نے ان تمام افراد کی توقعات کو ختم کر دیا ہے جو سائنٹفک تحقیقات میں خواتین کی ترقیات

کا جائزہ لے رہے تھے۔

اس صدمے کا مداوا کرنے کے لئے فلورینس انتہائی تیزی کے ساتھ خورد بینی تشریح الابدان کی تحقیقات میں مصروف ہو گئی۔ ایڈتھ ہوکر اور میبل مال کی تجویز یہ تھی کہ فلورینس کو خواتین کے حق رائے دہندگی کے موضوع پر رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لئے کام کرنا چاہیے۔ لیکن فلورینس چونکہ اپنے کام میں مستغرق تھی اس لئے اس تجویز پر عمل کرنے سے اجتناب کرنا چاہتی تھی تاہم وہ اس تحریک پر یقین رکھتی تھی۔ اس نے اس تحریک کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے خطوط اور مضامین لکھے اور انھیں تقسیم کرایا۔ پھر جب اس نے ایک فرینکلن کار خریدی تو اس کا نام خواتین کے حق رائے دہندگی کے لئے جہاد کرنے والی خاتون کے نام پر "سوسن۔ بی۔ انتھونی" رکھا۔

شریانی رطوبت (عروقِ جاذبہ) کی تحقیق کے بعد ڈاکٹر سیبن نے خون کے خلیوں پر کام کرنا شروع کر دیا، اور انھیں گھنٹوں تک برقرار رکھنے کے لئے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا۔ شریانی رطوبت کے عمل اور خون کے خلیے دار اجزا پر فلورینس کی تحقیقات نے امراض کی زیادہ بہتر سوجھ بوجھ پیدا کر دی اور جسم کی حفاظت کے مزید عوامل دریافت ہو گئے۔ اس کی ان خدمات کے صلے میں اس پر انعام و اعزازات کی بارش شروع ہو گئی۔

۱۹۲۰ء جانس ہاپکنس میں بانیان یونیورسٹی کی یاد میں جلسہ منعقد ہوا۔ اس موقع پر فلورینس کے احباب اور ساتھیوں نے میڈیکل اسکول کو فلورینس کی ایک قد آدم تصویر پیش کی، جسے مصور گرینفیلڈ بیل کول نے بنایا تھا۔ اس موقع پر فلورینس کا چہرہ خوشی سے جگمگا اٹھا تھا۔

اگلے سال امریکی یونیورسٹیوں کی خواتین کی انجمن نے فلورینس کو ریڈیم کی محقق میری کیوری کے استقبال کے لئے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ پیکنگ (چین) میں یونین میڈیکل کالج کے افتتاح کے موقع پر فلورینس نے راک فیلر فاؤنڈیشن کے زیر سرپرستی افتتاحی خطبہ پڑھا۔ خواتین کی قومی جماعت نے اسے دنیا کی بارہ عظیم خواتین میں سے ایک کا خطاب دیا۔ ۱۹۲۴ء میں امریکن اکاڈمی آف سائنس نے اسے اپنی رکنیت پیش کی۔ یہ اکاڈمی ممتاز سائنس دانوں کی ایک مخصوص تنظیم تھی۔ فلورینس اس اکاڈمی میں شامل ہونے والی پہلی خاتون تھی۔ تشریح الابدان کے امریکی ماہرین کی ایسوسی ایشن نے سیبن کو اپنا صدر منتخب کیا۔

کچھ عرصہ کے بعد راک فیلر انسٹی ٹیوٹ فار میڈیکل ریسرچ کے انتہائی ہوشیار ڈائریکٹر ڈاکٹر سائمن فلیکسنر بالٹی مور تشریف لائے اور انھوں نے فلورینس کو اپنے انسٹی ٹیوٹ میں خلیاتی تحقیقات اور خون سے متعلق مسائل پر ایک شعبہ قائم کرنے کے لئے نیویارک مدعو کیا۔

اس پیش کش سے فلورینس کو خوشی تو ہوئی لیکن وہ الجھن میں مبتلا ہو گئی۔ نیویارک انسٹی ٹیوٹ میں مکمل ترین لیباریٹریاں موجود تھیں۔ اسے مطالعے اور تجربات کے دوران میں مالی معاونت کا بھی یقین دلایا گیا تھا۔ لیکن وہ اس تذبذب میں تھی کہ کیا وہ جانس ہاپکنس اور اپنا تدریسی کام چھوڑنا پسند کرے گی؟

ڈاکٹر فلیکسنر نے اس سے کہا، "تمھاری دریافتیں انسانی تکالیف کا مداوا کر سکتی ہیں پھر بھی تم سوچ سمجھ کر فیصلہ کرلو۔" فلورینس نے نیویارک جانے کا ارادہ کر لیا۔ پھر وہ اداسی کے ساتھ دوستوں سے الوداعی ملاقاتیں کرنے کے لئے بالٹی مور کی سڑکوں کے چکر کاٹتی رہی۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ اپنے آنے والے دنوں کے متعلق سوچ کر مسرور بھی تھی۔

جب وہ راک فیلر انسٹی ٹیوٹ کی سفید پتھروں سے بنی ہوئی عمارت میں داخل ہوئی، اس پر ایک رعب سا غالب آگیا۔ ایک بار پھر اُسے ایک چیلنج کا سامنا تھا۔ اس سے پہلے کسی عورت کو انسٹی ٹیوٹ کا مکمل طور پر ممبر نہیں بنایا گیا تھا۔

فلورینس کو بہنے والی لمبی چوڑی لیبارٹری میں سورج کی کرنیں رقصاں رہتی تھیں۔ یہیں ایک کھڑکی میں سے ایسٹ ریور کے پانی پر چلتی ہوئی اور فضا میں گول دائروں کی صورت میں پرواز کرتی ہوئی مرغابیوں کی باہمی لڑائی بھی دیکھ سکتی تھی۔ فلورینس خوشی سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیتی۔ یہاں ہر قسم کی سہولیات کے باعث وہ اپنی آرزو کے مطابق انتہائی عجلت سے انتہائی ترقی کر سکتی تھی۔ اس نے طے کیا کہ وہ ان مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھائے گی۔

رفتہ رفتہ اس نے سیکریٹریوں، ٹیکنیشنوں اور اسسٹنٹوں کا اسٹاف بھی جمع کر لیا۔ ان میں کچھ اس کے سابق طالب علم بھی شامل تھے۔ ایک بار اس نے اپنے اسٹاف کے لوگوں سے کہا تھا "ریسرچ ایک اکیلے آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔" اپنے اسٹاف کو اپنے اسسٹنٹ سے زیادہ اپنا ہم کار سمجھتے ہوئے اس نے ان سب کو ایک ٹیم کی صورت میں متحد کر دیا تھا۔

فلورنس کو اپنے کام سے کس قدر عشق تھا، اس کا اندازہ اس کے اس جملے سے ہوتا ہے جو اس نے ایک موقع پر اپنے ایک دوست سے کہا تھا "اب رات ہو گئی ہے، اور میں خوش ہوں کیونکہ بہت جلد پھر صبح آ جائے گی اور میں دوبارہ اپنی محبوب لیبارٹری کا دروازہ کھول سکوں گی"

فلورنس کو اس انسٹی ٹیوٹ میں آتے ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ نیشنل ٹیوبر کلوسس ایسوسی ایشن کے شعبۂ تحقیق کے ڈائریکٹر، ڈاکٹر ولیم چارلس وائٹ نے اس سے درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو وہ ان کی اس تشخیص میں معاونت کرے کہ خلیے کس طرح تپ دق کے اثرات سے محفوظ رہنے کی صلاحیت پیدا کر سکتے ہیں۔

اس تحقیق کی ایک منزل میں ڈاکٹر سیبن نے ہر پندرہ منٹ بعد ایک انگلی سے خون کا قطرہ نکالا اور اسے شیشے کے ٹکڑے پر پھیلا دیا۔ پھر اس کا جائزہ لینا شروع کیا۔ سرخ جسیموں اور سات اقسام کے سفید جسیموں کی تعداد کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے اور اس کے معاونین نے دریافت کیا کہ ان کا تناسب متواتر تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن کیوں؟ یہ جسیمے تپ دق کے مقابلے کے لئے کیونکر متحرک ہو سکتے ہیں؟ ان سوالات کا حل تلاش کرنے کے لئے اس نے ایک تحقیقی مقابلہ ان کی میزان ایک منحنی خط پر لکھی۔

بعض اوقات کسی خاص منصوبے پر متواتر کئی کئی دن یا کئی کئی ماہ تک کام کرنے کے باوجود کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تھا۔ ایسی ہی ایک بے سود جدوجہد کے بعد فلورنس کے ایک اسسٹنٹ نے اس سے دریافت کیا، "آپ کے خیال میں کیا ہم کبھی نتائج تک پہنچ سکیں گے؟"

ڈاکٹر سیبن، جو صداقت کی بے تکان جستجو کرنے والی کے طور پر مشہور تھی اپنے اسسٹنٹ کی بدگمانی دور کرنے کے لئے مسکراتے ہوئے بولی، "اگر مجھے یہ یقین نہ ہو کہ ہم نتائج برآمد نہیں کر سکتے تو میں ایسی صورت میں تحقیق جاری نہیں رکھوں گی۔"

بعض اوقات ایسا بھی محسوس ہوتا کہ جب وہ کوئی نیا حل برآمد کرے گی تو اس وقت بہت سے نئے سوالات پیدا ہو جائیں گے لیکن اپنی تحقیق کے دوران میں وہ کہیں نہ کہیں خود کو یہ یقین دلاتی رہتی تھی کہ وہ کسی عمدہ نتیجے تک پہنچ جائے گی۔

سائنس میں پوری طرح مستغرق ہو جانے کے باوجود ڈاکٹر سیبن نے اپنی مصروفیات

کی صحت مند توازن برقرار رکھا تھا۔ وہ دوستوں کے ساتھ کشتی رانی کے لئے بھی جاتی تھی، اچھا پسندیدہ بیس بال ٹیموں کا کھیل دیکھنے کے لئے میدان میں بھی رہتی تھی۔ ڈرامے اور موسیقی کے جلسوں میں بھی شریک ہوتی تھی۔ چینی کی بنی ہوئی پلیٹیں اور جاپانی تصویروں کی تلاش میں دکانوں کے چکر بھی لگاتی رہتی تھی۔ گھر میں وہ علمی اور افسانوی کتابوں کے مطالعے، موسیقی اور دوستوں کی خاطر مدارات کا لطف اٹھاتی تھی۔

۱۹۲۸ء میں اس نے اسپین کا سفر کیا۔ اسی سال پکٹوریل ریویو میگزین نے ڈاکٹر سیبن کو امریکی سائنس میں نمایاں خدمات انجام دینے پر پانچ ہزار ڈالر کا انعام پیش کیا۔ پھر جب اس نے سنا کہ اسے نوع انسانی کی ایک محسن کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا ہے تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔

ڈاکٹر سیبن سائنس میں خواتین کے ذوق کو بیدار کرنے کے لیے بہت زیادہ مصروف ہونے کے باوجود کبھی نہیں اکتائی۔ وہ سمجھتی تھی کہ صلاحیت کا جنس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ سائنسی تحقیقات کی لازمی صلاحیت، صحت، مشاقی اور استقلال حاصل کر کے عورتیں مردوں سے سبقت لے جا سکتی ہیں۔

جو نوجوان لڑکیاں اپنے مستقبل کے بارے میں فلورینس کے پاس مشورہ طلب کرنے آتی تھیں۔ وہ ان سے کہا کرتی تھی، "نہیں، لیبارٹری میں کوئی منصب حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ کالج کی ڈگری ہی ضروری نہیں ہوتی۔ تاہم یہ ایک بیش بہا سرمایہ ہے۔"

جب کوئی لڑکی فلورینس سے سوال کرتی کہ "مجھ میں کیا قابلیت ہونی چاہیئے؟" تو وہ ہمیشہ ذہانت، ذوق اور کام کرنے کی لگن کا حوالہ دیتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ ان چیزوں کے علاوہ ریسرچ کے لئے استقلال، عام سوجھ بوجھ اور تخیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ان نوجوان لڑکیوں کو ابھارتے ہوئے کہتی تھی کہ مردوں کے مماثل منصب حاصل کرنے کے لیے عورت کو مرد سے زیادہ تندہی سے کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ پورے ذوق اور ولولے کے ساتھ کہتی تھی، "علاوہ ازیں سائنس میں مثالیت پسندی تک پہنچنے کا بہترین راستہ بے غرض تحقیق ہے۔" کچھ باصلاحیت لڑکیوں کی نہ صرف اس نے ہمت افزائی کی تھی، بلکہ ان کی مالی یا رسد وغیرہ کی ضروریات بھی پوری کی تھیں۔

نوجوان لڑکیوں نے بھی اس کے ذوق و شوق سے فائدہ اٹھایا۔ ایک انتیس سالہ جواں مرگ

نوجوان کی یاد میں قائم شدہ ، ہنری اسٹرونگ ڈینیس فاؤنڈیشن کی درخواست پر فلورینس نے ان درخواست گزاروں کی معاونت کی جو فاؤنڈیشن کے لئے چندہ جمع کر رہے تھے ۔ جن لوگوں نے اس کی درخواست منظور کی ، انہیں اس نے اپنا خاص ہمدرد محسوس کیا ۔

وہ دوسروں کو سکھانے سے کبھی گریز نہیں کرتی تھی ۔ اس کے معاونین انسٹی ٹیوٹ سے دیانت دارانہ خیالات اور محققانہ کارناموں کا سرمایہ لے کر گئے اور ان میں سے بیشتر ممتاز سائنس دان بن گئے ۔

ڈاکٹر سیبن اور اس کے اسسٹنٹوں نے اپنی تحقیقات کے وہ نتائج شائع کرائے جو تپ دق کی مزاحمت میں معاونت کر سکتے تھے ۔ فلورینس سیبن اپنے اسٹاف کا پورا پورا خیال رکھتی تھی اور جہاں کہیں ممکن تھا وہ اپنے اسٹاف کو مقدم سمجھتی تھی ۔ اکثر و بیشتر مشترکہ رسائل کی اشاعت کے موقع پر وہ اپنے مضامین پر بھی اپنے اسٹاف کے لوگوں میں سے کسی کا نام لکھ دیتی تھی ۔

یہ اور اسی طرح کی بہت سی وجوہات سے فلورینس کے مختلف اسسٹنٹ اس سے بے انتہا محبت کرتے تھے ۔ لیبارٹری میں وہ انتہائی باقاعدہ اور مستعد رہتی اور عام گفتگو کو ناپسند کرتی تھی لیکن لیبارٹری سے باہر وہ اپنی دلکشی اور شگفتہ مزاجی کے باعث ایک مقبول ساتھی سمجھی جاتی تھی ۔ اور سمجھی ہوئی دھنوں کے نظارے سے لے کر کستورا مچھلی کھانے تک کے مقابلہ میں تمام دلچسپیوں میں یکساں ذوق و شوق کے ساتھ شامل رہتی تھی ۔ اسٹاف کے لوگوں کو وہ اپنے گھر بلا کر دعوتیں دیتی تھی اور انھیں ڈراموں ، موسیقی کے جلسوں اور اوپیرا کے ٹکٹ پیش کیا کرتی تھی ۔ راک فیلر انسٹی ٹیوٹ کے لوگوں کو وہ اپنے بچوں کی طرح سمجھتی تھی اور جب کبھی اس کے ان بچوں کو کچھ مسائل درپیش ہوتے تو وہ انھیں خود اپنے مسائل محسوس کرتی تھی ۔

۱۹۳۰ء کی ابتدا میں " گڈ ہاؤس کیپنگ " نامی جریدے نے رائے شماری کا اہتمام کیا ، جس میں دنیا کی عظیم ترین خواتین میں ڈاکٹر سیبن کا نام بھی تجویز ہوا ۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے اسے سمتھ کالج ، جان ہوپ کنز ، اور مشیگن یونیورسٹی اور دوسرے اداروں کی جانب سے اعزازی ڈگریاں پیش کی گئیں ۔ برین ماور کالج کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر فلورینس کو " ایم ، کیری تھامس پرائز " پیش کیا گیا ۔ یہ اعزاز اس کالج کے ایک طالب علم نے کالج کے ایک سابق صدر کی یاد میں قائم کیا تھا ۔ یہ انعام پیش کئے جانے کے موقع پر صدر پارک نے فلورینس کو " سائنس میں تحقیقی کام کرنے والی امریکہ کی

خاتونِ اول، کے اعزاز سے نوازا۔

ڈاکٹر سیبن نے اپنی جوابی تقریر میں کہا: "سائنس میں کام کرنے پر دیا جانے والا کوئی انعام خوف اور حجاب کے احساس کو ابھارتا ہے کیونکہ کوئی بھی وثوق کے ساتھ اپنی تحقیق کے کامیاب نتائج کا ادراک نہیں کر سکتا ...... خود اپنی تحقیقات کے متعلق میں انتہائی طور پر سمجھ سکتی ہوں کہ یہ اپنے مقاصد سے کس قدر بعید ہیں۔

جب ڈاکٹر سیبن پر انعامات، تمغوں اور ڈگریوں کی بارش ہوئی تو اس سے انٹرویو لینے والوں نے بھی اس کی زندگی اور اس کے ہنر کا قریب سے جائزہ لینے کی کوشش کی۔ لیکن اس میں انھیں بڑی دشواری پیش آئی۔ جب اس سے پوچھا جاتا کہ اس کی لیبارٹری میں ان دنوں کیا ہو رہا ہے تو وہ عام طور پر صرف یہی جواب دے دیتی تھی کہ: "ہاں صاحب، ہم ...... "

جب اس سے اس کے مقاصد کے متعلق سوال کیا جاتا تو وہ کہتی: "اسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ پھر بھی مجھے لیونارڈو دا ونسی کی یہ سطریں بے حد پسند ہیں: "اے خداوند تو ہمیں ہماری محنتوں کے بدلے تمام اچھی چیزیں دے۔"

ڈاکٹر سیبن سائنس کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی غور و فکر کرتی تھی۔ عالمی مسائل سے دلچسپی رکھنے کے باعث اسے فارن پالیسی ایسوسی ایشن کے بورڈ کی رکنیت پیش کی گئی۔ وہ گگن ہیم فاؤنڈیشن کی مجلس مشاورت میں بھی شامل تھی۔ یہ ادارہ تعلیمی اور تحقیقی کاموں کی ترقی کے لئے کام کر رہا تھا۔ عوام کی خدمت کا جذبہ رکھنے والی خواتین معالجوں کے ایک گروہ کے ساتھ اس نے گوتم ہسپتال کے منصوبے پر بھی کام کیا جو خصوصیت کے ساتھ متوسط آمدنی والے لوگوں کی معالجاتی سہولیات فراہم کرنے کے نقطۂ نظر سے تیار کیا جا رہا تھا۔ اس قسم کے اسپتال کے منصوبے کو اگرچہ نیو یارک میں پسند نہیں کیا گیا۔ لیکن اس کا یہ منصوبہ بعد میں تعمیر ہونے والے اسپتالوں کی بنیاد بن گیا۔

سنہ ۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر سیبن کی سوانحی کتاب "ڈاکٹر سیبن، ایک ذہن کی داستان" شائع ہوئی۔ اس کتاب پر بہت اچھے تبصرے ہوئے۔ لیکن تصنیف و تالیف کا کام اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے قسم کھائی کہ وہ آئندہ کسی دوسری کتاب کے لئے قلم نہیں اٹھائے گی۔ لیکن اپنی اس قسم کے باوجود وہ تحقیقات اور سائنسی کام کرنے والی خواتین پر مضامین تحریر کرتی رہی۔

چونکہ فلورینس سائنسی تحقیقات کے موضوع پر بھی سادہ زبان میں نہایت سلیس اور عام فہم تقریر کر سکتی تھی، اس لئے ایک مقرر کے طور پر بھی اس کی بہت مانگ تھی۔ مغربی ممالک کے معالجوں کے ایک اجتماع میں اس کی تقریر سننے کے بعد ایک سائنسدان نے سیبن کی تقریر پر داد دیتے ہوئے کہا تھا: "یہ پہلی اور واحد ماہر طب عورت ہے جس کی تقریر میں نے ایک گھنٹہ تک سنی ہے"

اپنی مختلف قسم کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ فلورینس اپنے دوستوں کے لئے بھی وقت نکال لیتی تھی، اور الجھے ہوئے معاملات میں ہمیشہ ان سے مشورہ لیتی تھی۔ جنیوا میں جو بچے مقیم تھے، ان میں ایک نیڈ شیفیلڈ بھی تھا۔ نیڈ نابینا ہو گیا تھا۔ وہ نابینا ہونے سے قبل ایک ذہین اخبار نویس تھا۔ ڈاکٹر سیبن اکثر دوپہر اس سے ملاقات کے لئے جایا کرتی تھی۔ نیڈ اکثر کہا کرتا تھا: "آپ کی آمد سے مجھ میں ایک عقوبی معاملہ سا محسوس ہوتا ہے"

وہ مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والی خواتین کے بنائے ہوئے کوسموپولیٹن کلب میں بھی جاتی تھی اور راک فیلر انسٹی ٹیوٹ کے اسٹاف کے لوگوں میں سے جن سے اسے دلچسپی تھی، ان سے بھی اس کی ملاقاتیں رہتی تھیں۔ وہ ڈاکٹر مائیکل ہیڈلبرگر کے یہاں وہ مشا ایلمین اور فوشا سینڈل جیسے موسیقاروں کی موسیقی سن کر خوش گوار شامیں گزارتی تھی۔ ایک ڈنر پارٹی میں اسے البرٹ آئن اسٹائن کی قربت میسر آئی۔ اس پارٹی کے متعلق بیان کرتے ہوئے اس نے میری کو لکھا تھا: "آئن اسٹائن کے قہقہوں نے سب لوگوں کو انتہائی مسرور کیا"

ڈاکٹر سیبن پینسٹھ برس کی ہو گئی تھی لیکن راک فیلر انسٹی ٹیوٹ نے اسے ریٹائر ہونے کی اجازت نہیں دی۔ انسٹی ٹیوٹ کی اس قدر دانی پر سیبن کو انتہائی خوشی ہوئی۔ اس نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ خون کے متعلق اپنی تحقیقات جاری رکھی۔ نیز تپ دق اور میعادی بخار کا معالجہ کرنے کے نئے سے نئے طریقوں کا سراغ لگایا۔ لیکن دو برس بعد انسٹی ٹیوٹ نے اعلان کیا کہ اسٹاف کے وہ لوگ جن کی عمر پینسٹھ سال سے زیادہ ہے انہیں پنشن دے کر ریٹائر کر دیا جائے گا۔ فلورینس اپنی نئی تحقیقات کی تکمیلی منزلوں کے قریب پہنچ چکی تھی لیکن انسٹی ٹیوٹ کا اعلان سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ اس منزل تک پہنچ کر اپنے کام سے کیونکر دست بردار ہو سکتی تھی؟

تاہم اس نے اندازہ لگایا کہ ملکی بحران نے انسٹی ٹیوٹ کے بجٹ پر اثر ڈالا ہے۔ ان دنوں نیویارک کی

مرکزوں پر بہترین تربیت یافتہ اشخاص جن میں سائنس داں بھی شامل تھے۔ بے روزگاری کے سبب غذا حاصل کرنے کے لئے قطاروں میں کھڑے رہتے تھے۔ سیبن نے سوچا کہ اسے ان نوجوانوں کا راستہ نہیں روکنا چاہیئے جو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے خواہش مند ہیں۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ وہ انسٹی ٹیوٹ کے ایک اعزازی ممبر کی حیثیت سے جب چاہے انسٹی ٹیوٹ میں آ کر اپنے پسندیدہ منصوبوں پر کام کر سکتی ہے۔ لیکن لیبارٹری اس کی اپنی نہیں رہے گی۔ اس اطلاع سے اسے انتہائی خوشی ہوئی اور انسٹی ٹیوٹ سے تعلق ختم ہونے کی مایوسی کا احساس کم ہو گیا۔

پھر اطمینان کر لینے کے بعد کہ اس کے تمام اسسٹنٹ اچھے عہدوں پر فائز ہو چکے ہیں اس نے ڈینور منتقل ہونے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ڈینور میں وہ میری کی گرہستی چلانا چاہتی تھی۔ روانگی سے قبل اس نے بہت سے الوداعی جلسوں میں شرکت کی۔ سب سے زیادہ شاندار اور خلاف توقع جلسہ وہ تھا جو جون ۱۹۳۰ء میں انسٹی ٹیوٹ کے کارکنان نے راک فیلر پلازہ کے 'خیل روم' میں اس کے اعزاز میں منعقد کیا تھا۔ اس جلسہ میں اس کے بالٹی مور کے قدیم دوستوں سے لے کر ممتاز سائنس داں تک شریک تھے۔

خیر مقدمی رسومات کے بعد ڈاکٹر سیبن نے پھولوں کا گلدستہ گہری عقیدت کے ساتھ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا، "وہ فرد جو ایک مختصر سے فاصلے کو عبور کرنے کے لئے آگے آگے چل کر مشعل برداری کا کام کرتا ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، بلکہ اہم چیز تو علم کی ترقی ہے۔"

اس جلسے کے شرکا نے سفید چمڑے کے ایک فائل کے پہلے صفحے پر اپنے دستخط کئے۔ بہت سے اشخاص نے اپنے دستخطوں کے ساتھ اس قسم کے پیغامات بھی درج کئے، جیسے، "میں نے ہمیشہ سائنس میں آپ کو اپنی روحانی ماں سمجھا ہے...." "ریسرچ آپ کا شغل ہے، اور آپ کا پیشہ نوع انسانی کے احساس کی گہرائی کو ناپنا۔"

ان جلسوں کی حرارت ڈینور تک اس کے احساس پر چھائی رہی۔ ڈینور پہنچ کر اس نے اپنے اور میری کے لئے چیزمین پارک کے قریب ایک مکان لے لیا۔ اپنے سکونتی کمرے کو ان دونوں نے نادر ایرانی قالینوں سے آراستہ کیا۔ کمرۂ طعام میں سرخ اور نیلے رنگ کا عکس دینے والا ترکی قالین بچھایا، اور اسے جاپانی تصویروں اور چینی ظروف سے آراستہ کیا اور گھر میں چاروں طرف الماریاں کتابوں سے بھر دیں۔

کچھ عرصہ کم ڈاکٹر سیبن کلب کی تفریحات میں شریک ہوتی رہی۔ میری کی خواہش کے مطابق آہستہ کہ وہ کی سیاحت کی اور تفریحات میں شامل ہوئی لیکن جلد ہی اس میں ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس وقت یورپ پر دوسری جنگ عظیم کی پرچھائیاں پڑنے لگی تھیں۔ میری کا الاسکا کی سیاحت کا پروگرام بنا ہی تھی، لیکن سیبن سیاحت کے بجائے کچھ مزید تعمیری کام انجام دینے کے لئے بیتاب تھی۔

پھر سیبن نے بے شمار جلسوں میں تقریریں کیں۔ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے تعلقات عامہ کی مشاورتی کمیٹی میں کام کیا اور کینسر کی روک تھام کے لئے کام کرنے والے فلنے ہاول فاونڈیشن میں چیرمین کے عہدے پر فائز ہوگئی۔ کچھ وقت نکال کر وہ انسٹی ٹیوٹ میں اپنی ریسرچ جاری رکھنے کے لئے ایسٹ بھی جاتی رہتی تھی۔ لیکن فلورینس کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان تمام سرگرمیوں کے باوجود وہ بہت کم کام انجام دے سکی ہے۔ پھر اسے یہ فکر لاحق رہنے لگی کہ وہ کولوریڈو کے عوام کے لئے کیا کرسکتی ہے؟

خلاف توقع اسے ایک موقع میسر آگیا۔ ہوا یوں کہ دوسری جنگ عظیم ختم ہونے کے آثار نمایاں ہوتے ہی گورنر ویوین نے ایک بعد از جنگ منصوبہ بندی کمیٹی کی تنظیم کردی، تاکہ فوجیوں کو آسانی کے ساتھ شہری زندگی میں واپس لایا جاسکے۔ گورنر نے ڈاکٹر سیبن سے صحت سے متعلقہ ضمنی کمیٹی میں چیرمین کا عہدہ سنبھالنے کی درخواست کی۔

فلورینس نے یہ عہدہ قبول کرلیا، اور اپنے کاموں میں اس قدر منہمک ہوگئی کہ ریاست والوں نے اس کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر سیبن ایک ایسی نفیس معمر خاتون ہیں جن کے بال جوڑے کی صورت میں گندھے رہتے ہیں۔ وہ بالوں کو اس لئے نہیں کھولتیں کہ ان کے کسی کام میں خلل نہ ہو۔ سیبن کولوریڈو کے صحت عامہ سے متعلق حقائق کی صحیح تصویر ذہن نشین کرنے کے لئے بے شمار رپورٹوں کا مطالعہ کیا۔ صحت عامہ افسروں سے گفت و شنید کی، اور پانی کے ذخیروں میں گندگی مل جانے، نیز گندے پانی کی نکاسی کے ناکافی انتظامات اور گندگی ملے دودھ کے متعلق خبریں سن کر اس نے کاشتکاروں اور گندے پانی کی نکاس کا کام کرنے والے کارکنان کو جمع کیا۔ اس نے صحت عامہ کے افسران سے درخواست کی، "وہ امریکن پبلک ہیلتھ ایسوسی ایشن کو اجمالی جائزے کے لئے بلانا چاہتے ہیں۔"

ایک برس تک تحقیقات کرنے کے بعد اس ایسوسی ایشن نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ کولوریڈو میں اسپتالوں کی بے حد کمی ہے، اور معالج بھی بہت کم ہیں۔ ریاست میں بعض مقامات پر پچھلے قانون کے

ذریعے گندہ پانی دریاؤں میں مل جاتا ہے جس سے پانی کا ذخیرہ گندگی آلود ہو جاتا ہے۔ اس گندے پانی کی سینچائی سے پیدا ہونے والی سبزیاں بھی خراب ہو جاتی ہیں۔ صحت عامہ کے ضابطے بہت پرانے ہیں اور صحت سے متعلق پروگرام سیاسی پیرہ دستیوں کا شکار ہیں۔

ڈاکٹر سیبن پچھتر برس کی ہو چکی تھیں۔ ایسوسی ایشن کی رپورٹ دیکھ کر سیبن کو یہ خوف محسوس ہوا کہ شاید اس رپورٹ کو ارباب حل و عقد قائل کر کے فراموش کر دیں۔ چنانچہ اس نے ان خامیوں کا ازالہ کرنے کے لئے ایک مہم شروع کر دی۔ اس نے تنہا اور ڈاکٹر رائے کلیر، ڈائریکٹر آف دی اسٹیٹ ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ اصلاحات کو عام کرنے کے لئے تمام ملک کا طوفانی دورہ کیا۔ وہ پہاڑی اور میدانی علاقوں میں آندھی کی طرح سفر کرتی رہی اور سفر کے تمام احتیاجات بھی خود ہی برداشت کئے۔ طوفانی موسم میں اپنے بالوں کو ایک رومال سے باندھ کر، اور طوفان سے بچانے کے جتن کرتی ہوئی تابناک نگاہوں اور دمکتے ہوئے رخساروں کے ساتھ جلسہ گاہوں میں پہنچتی رہی۔ ایک بار وہ اور ڈاکٹر کلیر ایک انتہائی ڈھلوان پہاڑی سڑک پر موٹر سے جا رہے تھے کہ اچانک ان کی کار کے پچھلے پہیئے سڑک کی اس جانب مڑنے لگے جدھر انتہائی گہرا کھڈ تھا۔ سیبن نے شرارت کے طور پر ڈاکٹر کلیر سے پوچھا، "کیا آپ ہمیشہ ترائی کی طرف سے پہاڑ کی چوٹی پر جاتے ہیں؟"

نوے منٹ اپنے گھر پڑے رہنے کے لئے کبھی انہوں نے سیدھی تاریخوں کا سہارا نہیں لیا تھا۔ ایک دن ایک جلسے کو خطاب کرنے کے لئے، اس کا اسٹرلنگ جانے کا پروگرام تھا۔ لیکن صحت سے متعلق کمیٹی کے ایگزیکٹو سیکرٹری ہربرٹ منڈی۔ موصوف نے اسے ٹیلیفون پر اطلاع دی، "اسٹرلنگ میں آٹھ انچ برف پڑ گئی ہے جس سے شاہراہیں بند ہو گئی ہیں۔ سڑکوں سے گزرنا ناممکن ہے۔ آپ کے خیال میں کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم آپ کے اس دورے کی منسوخی کا اعلان کر دیں۔"

"نہیں مجھ سے ملئے" ڈاکٹر سیبن نے انتہائی مستعدی سے کہا۔

وقت مقررہ پر سیبن اسٹرلنگ پہنچ گئی۔ سروس کلب، کسانوں کی انجمن، پی۔ ٹی۔ اے، میڈیکل ایسوسی ایشن، کلیسائی انجمن اور خالص عوامی جلسوں کو خطاب کرتے ہوئے اس نے انتہائی پرسکون اور مستحکم انداز سے کہا، "دوسری بہت سی ریاستوں کی نسبت ہماری ریاست میں اموات زیادہ ہوتی ہیں۔ ہمیں اپنی صحت کو اپنے پہاڑوں جیسی بنانے کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔"

فلورینس نے اپنی تقریروں میں اکثر دینے جانے والے اعداد و شمار کے بجائے جراثیم ملے دودھ سے بیمار ہونے والے نومولود بچوں اور تپ دق کا شکار ہونے والے بچوں کا ذکر کیا۔ سامعین نے فلورینس کی تقریر میں اس مزاح کو بے حد پسند کیا جو کہیں کہیں نمایاں ہو جاتا تھا۔ ٹرینی ڈاڈ میں ایک شخص فلورینس سے مختصر سی ملاقات کا خواہش مند تھا۔ اس نے راستے میں فلورینس کو روک لیا اور ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: "ڈاکٹر سیبن کو اس طرح راہ میں روکنا میرے لئے مسرت کا باعث ہے۔"

ڈاکٹر سیبن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: "معلوم ہوتا ہے آپ اور ہماری مجلس قانون ساز کے کچھ نمائندے آپس میں اتحاد کئے ہوئے ہیں کہ سیبن کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔"

جب بھی ممکن ہوتا ڈاکٹر سیبن ممبران اسمبلی اور سیاست دانوں کی مخالفت کر کے انھیں کاری زک پہنچاتی تھی۔ لیکن اپنے شدید سے شدید مخالف سے بھی اس کا رویہ شریفانہ ہی رہتا تھا۔ اور وہ اس مخالفت کے سلسلے میں مخاصمت سے کبھی کام نہیں لیتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی عوام کا اعتماد حاصل کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت نے عوام میں صحت مند مخالفت کے لئے زمین ہموار کر دی۔

اخبارات نے بھی اس پستہ قد ڈاکٹر کی تائید کرنی شروع کر دی تھی۔ اسمبلی کے وہ ممبران جنھوں نے سیبن کے قوانین صحت کی مخالفت کی تھی، انتخابات میں شکست کھا گئے۔ پھر ۱۹۴۶ء میں مجلس قانون ساز نے سیبن کے تجویز کردہ آٹھ قوانین میں سے سات منظور کر لئے۔ ان قوانین کے باعث ڈیپارٹمنٹ آف ہیلتھ سیاسی اثرات سے آزاد ہو گیا۔ ہیلتھ کے ذمہ دار افسران اب پانی اور گندے پانی کی نکاسی کے ذرائع، گوشت کے ذخیروں اور اگائی ہوئی سبزیوں کی جانچ کر سکتے تھے۔

قوانین صحت کی منظوری کے بعد بھی ڈاکٹر سیبن کی سرگرمیاں ماند نہیں پڑیں۔ عالمی امن سے دلچسپی رکھنے کے باعث اس نے مقامی طور پر اقوام متحدہ کے لئے کام کیا۔ مضامین لکھے شہری صحت عامہ سے دلچسپی رکھنے والی جماعتوں کو خطاب کیا۔ مزید اعزازات حاصل کئے۔ کولوریڈو اسٹیٹ کالج آف ایجوکیشن میں تقسیم اسناد کا خطبہ پڑھا۔ امریکی خواتین کی انجمن نے اسے ایک انعام پیش کیا۔ عیسائی اور یہودیوں کی نیشنل کانفرنس نے امریکن برادر ہڈ کی طرف سے اس کو سند دی۔ اور اس کی صحت عامہ کے کاموں میں مسلسل جدوجہد کے اعتراف میں الی نوئس کے ناکس فورڈ کالج نے اسے جین ایڈم میڈل عطا کیا۔

جنوری ۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر سیبن ڈینور میں صحت عامہ کے شعبہ کی نگراں مقرر ہوگئی۔ لیکن اس نے تنخواہ لینا منظور نہیں کی۔

مقامی افسروں نے اس کے اس رویے پر اس طرح کے خیالات ظاہر کئے کہ "جو تنخواہ نہیں لیتا وہ کام بھی نہیں کر سکتا" بالآخر اس نے تنخواہ لینا منظور کر لیا۔ لیکن وہ اپنی تنخواہ کی رقم کولوریڈو یونیورسٹی کو تحقیقی کاموں کے لئے دے دیتی تھی۔

ایک بار اس کے ایک دوست نے اس سے پوچھا "آپ اسّی برس کی ہو چکی ہیں۔ کیا یہ کام آپ کے لئے بہت زیادہ نہیں ہے؟"

"انسان کو کام نہیں، بلکہ کام کرنے سے روکنے والی قوت بوڑھا کرتی ہے" فلورینس نے جواب دیا

پھر وہ سماجی تحفظ کے لئے کام کرنے والی سینیٹر میکنز ایڈ وائنڈی کونسل کی ممبر منتخب ہوگئی۔ کونسل کے کاموں کے لئے اُسے بار بار واشنگٹن کا دورہ کرنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ مصروفیت ڈینور کی جانب سے اس کی توجہ نہ ہٹا سکی۔ اپنی سہ سالہ ممبری کے عرصے میں اس نے شہر کو چوہوں کی آفت سے نجات دلائی۔ گندے پانی کی نکاسی کے انتظامات کو بہتر کرایا۔ اور اس امر کی نگرانی کی کہ ڈینور شہر میں صرف جراثیم سے پاک کیا ہوا دودھ ہی ملایا جائے۔ اس کی کوششوں کے نتیجے میں ڈینور میں بڑے پیمانے پر مفت ایکسرے کرنے والے مراکز قائم ہو گئے۔ ان کے قیام کے بعد اس نے ان کے انتظامات میں بھی مدد دی۔

نیشنل ٹیوبرکلوسس فاؤنڈیشن کی جانب سے ہر سال تپ دق کے اسباب، علاج یا حفظ ما تقدم کے لئے قابل تحسین خدمات انجام دینے والوں کو ٹروڈیو میڈل دیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر سیبن یہ میڈل بھی حاصل کر چکی تھی۔ ۱۹۵۱ء میں اس نے صحت عامہ سے متعلق البرٹ اینڈ میری لاسکر فاؤنڈیشن کا ایک ہزار ڈالر کا انعام بھی حاصل کیا۔ امریکہ کی خواتین مدیران جرائد نے اپنی ملک گیر شماری کے بعد اسے سال کی بہترین سائنس داں، کا خطاب عطا کیا۔ پھر اس کی نمایاں عوامی خدمات کے اعتراف میں جنرل صدر ہوسپٹل نے بھی اسے خطاب سے نوازا۔ اور ذی مرتبہ اشخاص نے شیرے ہیوا ہوٹل میں اسے ایک شاندار دعوت دی۔

ڈاکٹر سیبن کی اسّی ویں سالگرہ کے موقع پر ایک اخباری نمائندے نے اس سے ملاقات کی

اور گفتگو کے درمیان محسوس کیا کہ سیبن اُس زمانے میں بھی نئے آئیڈیوں کو ہلاک کرنے کے لئے ان کی تلاش میں تھی۔ اُس نے اخباری نمائندے کو بتایا کہ سائینس میں ایسی بہت سی شخصیتیں گمنامی کی زندگی گزار رہی ہیں۔

اخباری نمائندے کو حیرت تھی کہ اس عمر میں بھی سیبن میں نوجوانوں کے سے دم خم برقرار تھے ؟

جب اخباری نمائندے نے اس بارے میں سیبن سے سوال کیا تو اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی ۔ اس نے کہا، " جو انسان ایک بہتر مستقبل کے لئے کام کر رہا ہو، اسے ذہنی اور روحانی ضعیف العمری مس بھی نہیں کر سکتی۔ نوجوانی کا سرچشمہ خود فراموشی میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ "

سالگرہ کے موقع پر اسے جو بے شمار خطوط اور مبارکبادیں موصول ہوئیں ان میں ایک خط راک فیلر انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر پیٹن رائنڈ کا بھی تھا۔ ڈاکٹر رائنڈ نے اپنے خط میں سیبن کے عمل کا رناموں کی تعریف کے علاوہ یہ بھی لکھا تھا کہ، " آپ کے پڑھائے ہوئے وہ سبق کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے اور کیسے کرنا چاہئے، آج بھی ہمارے دل کی گہرائیوں میں محفوظ ہیں۔ " سیبن کے دوسرے شاگردوں نے بھی اسی انداز سے لکھا تھا کہ اس نے کس طرح انہیں کتابوں سے، کام سے اور زندگی سے محبت کرنے کا سبق سکھایا تھا۔

کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر سیبن نے اکیڈیمک لباس پہن کر کولوریڈو یونیورسٹی کے جشن میں شرکت کی، جو یونیورسٹی کے میڈیکل اسکول کے لئے ملنے والی امداد میں ایک لاکھ ڈالر کے اضافے کی خوشی میں منعقد کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر سیبن کی صبر آزما کوششوں اور قربانیوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے خیال سے بانیان یونیورسٹی نے خلیاتی حیاتیات کے تحقیقی ادارہ کی نئی عمارت کو "فلورینس آر۔ سیبن کے نام سے منسوب کیا، اور اس کا نام " فلورینس۔ آر۔ سیبن بلڈنگ فار ریسرچ اِن سیلولر بائیولوجی " رکھا۔ اس موقع پر تمام ملک سے صحت، سائینس اور تعلیمات کی نامور ہستیاں سیبن کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئی تھیں۔

سیبن کے ایک سابق طالب علم ڈاکٹر ایڈتھ بوائنڈ نے بہت سے دوستوں کی جانب سے نئی عمارت میں لگانے کے لئے، گلیب الیمن کی بنائی ہوئی ڈاکٹر سیبن کی ایک تصویر پیش کی۔ انعامات اور عوام

کی جانب سے اعزاز ملنے پر سیبن ہمیشہ حیرت و استعجاب میں ڈوب جاتی تھی۔ اس نے بار بار کہا تھا کہ "سائنس داں کو جھاڑ جھنکار دور کرنے کے لئے اور آنے والوں کے لئے راہ کو نسبتاً آسان بنانے پر ہی قناعت کرنی چاہیئے" اس نے بھی اپنی تمام تر جبلی جذبے اور طاقت کے ساتھ یہی سب کچھ کیا تھا اور کبھی اپنے نام کے حقیقی ثمر کا دل میں خیال تک نہیں لاتی تھی۔

۳ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو ٹیلی ویژن پر ورلڈ سیریز کا کھیل دیکھتے ہوئے ڈاکٹر سیبن کا حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث انتقال ہو گیا۔ امریکن ایسوسی ایشن آف یونیورسٹی ویمن کے راکی ماؤنٹین سیکشن نے اس کی یادگار کے طور پر ایک خصوصی وظیفہ قائم کیا اور ڈینور میں ایک پبلک اسکول کو سیبن اور میری کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔ "سیبن کے لئے سینٹ" کی ایک مہم چلائی گئی، جس میں شہری، وطنی اور زراعتی جماعتوں نے، سائنس دانوں، شہری باشندوں اور اسکول کے بچوں نے حصہ لیا، اور واشنگٹن کے اسٹیچوری ہال میں کولوریڈو کے لئے مقررہ خالی گوشے میں سیبن کا مجسمہ نصب کرانے کے لئے چندہ جمع کیا۔ کانسی کے اس نازک اور شفیق چہرے والے مجسمے پر یہ الفاظ درج کئے گئے، "معلم، سائنس داں اور انسان دوست۔"

اس مجسمے کی پیش کش کے موقع پر صدر آئزن ہاور نے کولوریڈو کے سینیٹر گورڈن الاٹ کو تار کے ذریعے یہ پیغام ارسال کیا تھا "اس نے اس سرزمین کو انسانوں کے لئے بہشت بنانے کی آرزو میں انتہائی دانش مندی اور خلوص دل سے کام کیا ہے۔"

کولوریڈو کی اس عہد ساز خاتون نے جن کاموں کی ابتدا کی تھی، ان کا فائدہ آج بھی جاری ہے۔ کیونکہ اس نے ایک معلم کی حیثیت سے اپنے جوش اور دیانت داری سے دوسروں کی شخصیتوں کو بھی متاثر کیا تھا۔ سیبن نے نامعلوم حقائق کو معلوم کرنے کے جذبات سے لبریز ہو کر اور مصیبت زدوں کو دکھ سے نجات دلانے کی آرزو کے زیر اثر ایک سائنس داں کے طور پر اعلیٰ ترین رتبہ حاصل کیا لیکن اس کے وطن کے لوگ فلورینس سیبن کو سب سے زیادہ ایک ایسے انسان دوست کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں جس نے اپنی زندگی، طاقت اور صلاحیت اپنے ہم وطنوں کی خدمات کے لئے وقف کر دی تھی ۔۔ وہ ایک حوصلہ مند اور وسیع القلب خاتون تھی، جو اقوال سے زیادہ افعال پر اعتقاد رکھتی تھی۔

---

(۵)

ایڈتھ ہیڈ

فلمی ستاروں کی تزئین کار

ایڈتھ ہیڈ۔ پیراماؤنٹ پکچرز میں تزئین کار اعلیٰ (چیف ڈیزائنر) کے عہدے پر مامور ہے۔ اصطفانہ فلمی ستاروں کے لئے ان کے رول کے مطابق پوشاک تیار کرتی ہے۔ ایڈتھ کے گاہکوں میں بیٹی گریبل، بوب ہوپ، جیمز میسن، جینفر جونس اور ولیم ہولڈن جیسے فلمی ستارے شامل ہیں۔ اس کا سفیدی مائل بادامی رنگ کی دیواروں والا اسٹوڈیو، جو دیواروں کے ہم رنگ قالین اور چاندی منڈھے ہوئے فرانسیسی طرز کے فرنیچر سے آراستہ ہے، ایڈتھ کی خوش اسلوبی کا آئینہ دار ہے۔ فرانسیسی طرز کی کھڑکیوں میں سے آنے والی سورج کی کرنیں اس اسٹوڈیو میں رکھے ہوئے چھ اکاڈمی ایوارڈ "آسکر" کو جگمگا دیتی ہیں۔ یہ آسکر اسے موشن پکچر انڈسٹری کی جانب سے نمایاں تزئین کار ہونے کے لئے پیش کیا گیا تھا۔

لیکن جب ایڈتھ شروع شروع میں پیراماؤنٹ پکچرز میں آئی تھی، اس وقت اس کی تقرری ایک معمولی سی جگہ پر ہوئی تھی۔ ان دنوں صرف اداکاروں سے اس کی ملاقات ہوتی تھی وہ صرف معمولی درجے کے غیر معروف اداکار تھے۔ فیشن کی اعلیٰ تزئین کار کا یہ عہدہ اسے پندرہ برس تک پورے انہماک کے ساتھ جدوجہد کرنے کے بعد حاصل ہوا تھا۔

ایڈتھ لاس اینجلس میں پیدا ہوئی تھی، لیکن اس کی نشوونما فیشن کی دنیا سے دور کان کنوں کے کیمپوں میں ہوئی۔ میکسیکو کے ایک مقام پر اس نے ایک کم عمر ہم جولی سے ہسپانوی زبان سیکھی تھی۔ پھر ایڈتھ کا خاندان سرچ لائٹ (نیواڈا) سے چار میل کے فاصلے پر ایک کیمپ میں منتقل ہو گیا تھا، جہاں ایڈتھ کا سوتیلا باپ ایک کان کے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر مامور تھا۔

اس بے برگ و بار جگہ میں ان لوگوں کا بے رنگ لکڑی اور ٹین کی چھت والا مکان اور نوکیلی چمنی والا چولہا صحرا کے ایک پتھریلے خطے پر بنا ہوا تھا۔ ایڈیتھ کی سیاہ بالوں اور نیلی آنکھوں والی پستہ قد ماں نے اس مکان کی اندرونی بے ربطی کو ختم کر دیا تھا۔ اس نے کھڑکیوں پر بہترین تہذیب کے پردے لٹکا رکھے تھے اور بہترین اشیاء مثلاً اصلی چاندی کے زیورات اور ہیوی لینڈ کے بنے ہوئے چینی کے برتن روزمرہ استعمال میں لاتی تھی۔

کیمپ میں چونکہ کوئی اسکول نہیں تھا اس لئے ایڈیتھ کی ماں ہی اسے پڑھایا کرتی تھی۔ ایڈیتھ کو صحرا کی تنہائی سے سخت کوفت ہوتی تھی اور وہ دور دراز کے ان شہروں میں جانے کے لئے بیتاب رہتی تھی، جہاں اسے ہم جولی میسر آ سکتے تھے۔ لیکن صحرا کی تنہائی سے نفرت کے باوجود اسے صحرا میں پیدا ہونے والے کیکٹس کی عجیب و غریب شکلوں سے عشق تھا۔ وہ گریز ووڈ کی لکڑی کے چھلکے ٹکڑے لے کر ان سے ہاتھ پیروں والی چھوٹی چھوٹی شکلیں بناتی اور انھیں ریت میں گاڑ کر اپنا دل بہلایا کرتی تھی۔ بعض اوقات اسے ایسی ٹہنیاں بھی مل جاتی تھیں جن کی شکلیں قدرتاً آدمی کے ڈھانچے سے ملتی جلتی ہوتی تھیں، وہ ایسی ٹہنیوں کے لئے بہار کے پھولوں سے ٹوپیاں بنایا کرتی تھی۔

ایڈیتھ کو ریت کے تودوں پر اگے ہوئے سیج برش کی جھاڑیوں میں سیر کر کے بڑا مزا آتا تھا۔ اسے یکا[1] کے ایک ہی لمبے ڈنٹھل پر کھلنے والے چکنے پھولوں کے خوشے بہت پسند آتے تھے۔ لیکن صحرا میں چونکہ سورج کی شدت، ٹیڑھے سانپ، بچھو یا ٹرنٹولا[2] کا خطرہ رہتا تھا۔ اس لئے ایڈیتھ کی ماں اسے بار بار آواز دے کر گھر بلا لیا کرتی تھی۔ ایک بار ایڈیتھ کرسی کے ایک شہتیر پر ستانے کے لئے لیٹی ہوئی تھی اس کی ماں نے دیکھا کہ ایک ٹیڑھا سانپ اس کے قریب کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ ایڈیتھ کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر ماں سانپوں سے اس قدر کیوں ڈرتی ہے۔ اس نے ضد کرتے ہوئے ماں سے کہا "اگر میں سانپوں کو نہیں چھیڑتی تو وہ بھی مجھے نہیں چھیڑیں گے"۔

گھر کے باہر جانے کی محفل جمانے کے لئے ایڈیتھ کے پاس کرسی کی بیٹی کی میز تھی۔ جس پر وہ لیمن کا سرخ دھاری دار میز پوش بچھا دیتی تھی۔ اس میز پر وہ چھوٹے چھوٹے سینڈوچز

---

[1] سفید پھولوں والا سوسن نما پودا۔

[2] ایک قسم کی مکڑی، جس کے کاٹنے سے آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔

اور بوڑی لینیٹ کے ننھے ننھے مینڈک کے پیالوں میں زیادہ دودھ والی چائے رکھ دیتی تھی۔ چونکہ اس کے ہم جولی صرف جانور ہی تھے اس لئے وہ انھیں ہی اپنا مہمان بنایا کرتی تھی۔ اس دعوت کے لئے وہ اپنی کالی بلی ٹام اور سفید کتے ڈاچشا کو گڑیوں کے کپڑے پہنا دیتی تھی۔ کبھی کبھی وہ کیمپ کے اطراف میں گھومنے والے گدھوں میں سے کسی ایک کو اس دعوت میں شامل کرلیتی تھی۔ جب ایڈتھ ان جانوروں کا سنگھار کرنے کے لئے ان کی کمر پر ربن باندھنے کی یا ان کے سر پر رومال منڈھنے کی کوشش کرتی تو بعض اوقات وہ سرکشی سے اس کا مقابلہ بھی کر بیٹھتے تھے۔ لیکن ریت کے رنگ سے ملتے جلتے سینگ والے مینڈک اسے بہت کم ستاتے تھے۔ اپنے ان مہمان مینڈکوں کی نشست کے لئے وہ سگار کے خالی ڈبے پر کپڑا چڑھا دیتی یا اپنی لکھنے کی تختی پر سینے کی کھال کے اپنے پرانے سفید دستانوں کے ٹکڑے ٹھونک کر مینڈک کے لئے مسند بنا دیتی تھی۔

گرمی کے دنوں میں ایڈتھ اپنی جمع کی ہوئی وھسکی کی خالی بوتلیں کیمپ کی سڑک پر ایک قطار میں رکھ دیتی اور خود گھر میں چھپ جاتی تھی۔ پھر جب سورج کی کرنیں ان بوتلوں پر پڑتیں تو مختلف قسم کے خوبصورت رنگ جھلکنے لگتے تھے۔

ایڈتھ کا سوتیلا باپ کبھی کبھی اسے اپنے ہمراہ کانوں کے اندر لے جایا کرتا تھا۔ زمین کی سطح سے نیچے ہی نیچے مرطوب اور سرد تاریکی میں اترتے ہوئے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ لیکن جب وہ سورج کی طمانیت بخش حرارت میں واپس آجاتی تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگتا تھا۔ واپس آنے کے بعد اسے سورج پہلے سے بھی زیادہ تابناک نظر آتا تھا۔

سردی اور آندھیوں کے دنوں میں ایڈتھ اپنے گھر میں پڑی پڑی کھڑکی پکی ہوئی روٹی یا پھل بھرے میٹھے سموسوں کی خوشبو سے دل کو کھانے کے لئے بے تاب ہو جاتی تھی تو اس کی ماں اسے تاش کے کھیلوں سے بہلانے لگتی تھی۔

ایڈتھ کو بے تابی کے ساتھ چھٹیوں کے دنوں کا انتظار رہتا تھا۔ چھٹیوں میں بعض اوقات یہ خاندان بگھی میں بیٹھ کر (جسے ان کا موٹا تازہ گھوڑا چارلی کھینچا کرتا تھا) اپنی برادری کے میلے میں چلا جاتا تھا۔ اس میلے میں بیل رتیلے گڑھوں میں پھنسے پھنسے تھوتھو کیا کرتے تھے۔ مختلف کانوں سے، سرچ لائٹ سے اور میلوں تک پھیلے ہوئے ریگستان سے آتے ہوئے لوگ جوش کے

درختوں کے نیچے جمع ہو کر آپس میں بات چیت کرتے اور کھانے اور مستم بھنے ہوئے بیل کا لطف اٹھاتے تھے۔ کرسمس کے موقع پر ایڈتھ کے یہاں کا ان کنول اور ان کے خاندان کے لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ ایڈتھ کا باپ مہمانوں کو سگار وغیرہ پیش کرنے میں مصروف رہتا اور ایڈتھ اپنی ماں کے ساتھ چمکتے ہوئے گرینڈ پیانو، میووں اور سنگتروں سے عورتوں اور بچوں کی تواضع میں مصروف رہتی تھی۔

شہر کے دورے میں ایڈتھ کو کرسمس سے بھی زیادہ لطف آتا تھا۔ جنرل اسٹور میں ایڈتھ کی نگاہیں رنگین کھلونوں سے لے کر گوند کی شیشی تک، ہر چیز پر مرکوز ہو جاتی تھیں۔ عام طور پر ایسا ہوتا تھا کہ ایڈتھ کے والدین خریداری کے لئے چلے جاتے اور وہ ایک مقامی ڈاکٹر کی دو لڑکیوں، مارجوری اور ہیلن کے ساتھ کھیلتی رہتی تھی۔ ایڈتھ کو ان لڑکیوں کے گھونگھریالے سنہری بالوں پر رشک آتا تھا۔ اس کے اپنے سیاہ چمکیلے بالوں میں اس قسم کے گھونگھریالے خم صرف اسی موقع پر پڑتے تھے جب اس کی ماں اس کے بالوں کو تیل سے تر کر کے رات بھر کے لئے دھجیوں سے باندھ کر چھوڑ دیا کرتی تھی۔

یہ تینوں نو عمر لڑکیاں اکثر ڈرامے کا کھیل بھی کھیلا کرتی تھیں۔ ایڈتھ کاغذ کی گڑیا اور کترنوں سے بھرا ہوا اپنا عزیز ترین تھیلا اپنے ساتھ شہر لایا کرتی تھی۔ وہ اس تھیلے میں سے کترنیں نکال کر ڈرامے کے لئے پوشاک بنایا کرتی تھی۔ پھر تھیلے کو دوبارہ اپنے ذخیرے سے پر کرنے کے لئے اسے گھر گھر جا کر ان بے کار کترنوں کو جمع کرنا پڑتا تھا، جو اس کے والدین کے دوست اس کے لئے بچا کر رکھ چھوڑتے تھے۔

ایڈتھ جب آٹھ برس کی تھی، اس کے والدین اسے نیو یارک لے آئے۔ یہاں والڈورف اسٹوریا میں اسے پہلی بار ایک حقیقی ٹب میں غسل کرنے کا تجربہ ہوا۔ اپنے گھر وہ باورچی خانے کے چولھے کے قریب ٹین کے ایک ٹب میں نہایا کرتی تھی۔ خریداری کے دوران میں ایڈتھ کی ماں نے اسے نیلی سرج کا لمبے گھیر اور سادگی آستینوں والا، پیشتر تھا سن، ملاح کا لباس خریدا۔ یہ لباس پہن کر جب اس نے آئینہ دیکھا، تو اسے ایک سیاہ آنکھوں اور لمبی لمبی چوٹیوں والی چھوٹی سی لڑکی نظر آئی۔ ایڈتھ کو یقین نہ آیا کہ یہ وہ خود ہے۔ بعد ازاں اس نے ایک ریستوران میں جھینگا مچھلی کھائی۔ یہ اس کی عام غذا مرغی، بشیر اور گوشت کے مقابلے میں انتہائی انوکھی چیز تھی۔

جس وقت ایڈتھ بارہ برس کی تھی، اس کے گھر والوں نے لاس اینجلس منتقل ہونے کا ارادہ

گریلیڈ اور ایڈیتھ کو پبلک ہائی اسکول میں داخلہ لینے کے لئے جلدی جلدی تاریخ اور ریاضی کی تیاری کرنی پڑی۔ ایڈیتھ اپنے اس نئے گھر میں اپنی عمر سے چھوٹے بچوں سے بھی زیادہ شرم اور بے اطمینانی کا شکار رہتی تھی۔ اس پر آنے والے دنوں کا خوف طاری تھا۔ اسے یہ فکر بھی لاحق تھی کہ کیا وہ امتحانات پاس کرنے کے قابل ہو سکے گی۔

سماجی اعتبار سے بھی وہ اپنی صلاحیتوں سے مایوس تھی۔ پھر جب اسے دو سہیلیاں مل گئیں تو اسے کچھ آسودگی میسر آئی۔ یہ اس کی سرچ لائٹ کی ہی دو سہیلیاں، مارجری اور ہیلن تھیں۔ جو اب لاس اینجلس آگئی تھیں۔

شہر آنے کے بعد ایڈیتھ کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اسے کچھ کرنا ہے۔ چنانچہ اس نے امکانی ذرائع پر طبع آزمائی شروع کردی۔ اس کی سہیلی مارجری ایک مشہور موسیقار، اولگا اسٹیب سے پیانو سیکھ رہی تھی۔ ایڈیتھ کو بھی پیشہ ور پیانو نواز بننے کی سمائی، اور اس نے اپنے والدین سے اصرار کیا کہ اسے بھی اولگا اسٹیب سے پیانو کی تعلیم دلائی جائے۔ اس نے پوری طرح مستغرق ہو کر پیانو کی مشقیں شروع کر دیں۔ لیکن کچھ ہی دن بعد اولگا اسٹیب نے ایک خط کے ذریعے انتہائی خوش اسلوبی سے ایڈیتھ کے والدین کو مطلع کیا کہ ایڈیتھ کو پڑھائے ہوئے سبق ضائع ہو رہے ہیں پیانو اس کے بس کا نہیں ہے۔

پھر اس نے اپنا مطمع نظر بدل کر کھلاڑی (جمناسٹ) بننے کا ارادہ کیا، اور وائی، ڈبلیو، سی، اے میں تیراکی، والی بال اور ٹینس کی کلاسوں میں داخلہ لے لیا۔ ایڈیتھ اس وقت تیرہ برس کی تھی لیکن اپنی عمر سے چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے ان خواتین کے ساتھ وزن اٹھانے اور باضابطہ ورزش کرنے کی مشق شروع کر دی جو بنیادی طور پر اپنا وزن گھٹانے کے لئے ورزش کرتی تھیں لیکن اسے اپنے ہم عمر ساتھی میسر نہیں تھے، چنانچہ وہ اس روزمرہ کی باضابطہ ورزش سے بھی اکتا گئی اور اس نے کھلاڑی بننے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کی قوت حافظہ اچھی تھی۔ چنانچہ اس نے اسکول میں اپنے سبق اچھی طرح یاد کئے اور لاطینی زبان کی بہترین طالب علم بن گئی۔ اس نے ایک لاطینی ڈرامے "اینیاس" میں ایک رول بھی کیا۔

پھر جب اس کے والدین ایک کان میں کام کرنے کے لئے ڈیتھ ویلی میں منتقل ہو گئے تو

ایڈتھ اپنی ماں کی ایک سہیلی خالہ متی مارگن کے یہاں سو سیٹ پلیس میں رہنے لگی۔ گرمیوں میں وہ اٹوپیا میں اپنے والدین کے پاس چلی جاتی، جہاں درجۂ حرارت روزبروز سو ڈگری سے بھی اوپر چڑھتا رہتا تھا۔ وہاں تفریح کے مواقع بھی بہت کم تھے۔ لیکن ہائی اسکول سے امتحان پاس کرنے کے بعد، وہ گرمیوں کے موسم میں۔ کولوریڈو کے رہنے والے ایک طالب علم کے ساتھ رقص کرتی رہی۔ یہ طالب علم وہاں خام دھات کو صاف کرنے کا ہنر سیکھ رہا تھا۔ ۴ جولائی کی تقریب کے دن کیمپ میں رقص کے ایک مقابلے میں اس جوڑے نے کامیابی حاصل کی اور ایڈتھ نے چاندی کا ایک تین فٹ لمبا، خوبصورت کپ انعام میں حاصل کیا۔

آنے والے موسم خزاں میں وہ برکلے میں کیلی فورنیا یونیورسٹی میں داخل ہوگئی۔ اسپینی زبان میں وہ پہلے ہی مہارت حاصل کر چکی تھی۔ اب اس نے دیگر زبانوں میں امتیاز حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ طالب علمی کی زندگی میں تو اسے محض معمولی معمولی دشواریاں ہی پیش آتی تھیں۔ لیکن اپنی سماجی حیثیت کی جانب سے اسے اطمینان نہیں تھا۔ یونیورسٹی کے وسیع احاطے اور کلاس کے طویل کمروں نے اسے ایک قسم کے تذبذب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اب اس نے اپنی آنکھوں کی حفاظت کے خیال سے چشمہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ پہلے وہ چشمہ لگانے سے گریز کرتی رہی تھی۔

خود کو چاق چوبند رکھنے کے لئے وہ کشتی کی دوڑ میں حصہ لینے کے لئے جایا کرتی تھی، لیکن ٹیم کے دوسرے ساتھیوں کی نسبت وہ اپنے قد و قامت کے اعتبار سے آدھی نظر آتی تھی۔ تاہم اس کمزوری کے باوجود وہ ہمت نہیں ہارتی تھی، حالانکہ چپو چلاتے چلاتے اس کے ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے تھے۔ ایک بڑی دشواری یہ بھی تھی کہ جس وقت وہ اوک لینڈ سے، جہاں وہ کشتی رانی کے لئے جاتی تھی، برکلے میں اپنے سونے کے بڑے کمرے میں واپس آتی۔ اس وقت تک شام کا کھانا تقسیم ہو چکا ہوتا تھا۔ آخر کئی راتیں بغیر کھائے گزارنے کے بعد ایڈتھ نے کشتی رانی سے بھی توبہ کر لی۔

ایک بار گرمیوں کی چھٹیوں میں ایڈتھ کو اس کے باپ کے دوست میبل اور فرینک اسپینسر نے نیو میکسیکو میں اپنے پاس بلا لیا۔ وہاں مسٹر اسپینسر نے ہوپی ہاؤس کرائے پر لے رکھا تھا۔ کیونکہ میں ایڈتھ نے امریکی قبائلی کی پوشاک دیکھی، اسے ان پوشاکوں کے ڈیزائن بے حد پسند آئے۔ اور اس نے خوشی خوشی یہ پوشاک پہن کر دیکھی۔ ایک روز وہ قبائلی لباس زیب تن کئے ہوئے ہوپی قبیلے کی ایک

روایتی تقریب دیکھنے میں محو تھی۔ اسی اثنا میں ہوپی ہاؤس کی برساتی میں سے پیانو نواز اگینس پینڈ یوڈی کی نیچے اترا، اور ہر ایک قبائلی کو ایک ایک کوارٹر پیش کیا، اور ایڈتھ کے ہاتھ میں بھی ایک کوارٹر تھما دیا۔ اس تقریب سے واپس آکر ایڈتھ نے مسٹر اور مسز اسپینسر سے کہا کہ، "آج تو میرے سیاہ لمبے بال میرے کام آگئے۔"

ایڈتھ کو ہوپی قبیلے کی مصوری اور کپڑا بننے کا انداز بھی بے حد پسند آیا اور اس نے ان کی صحبت میں بہت اچھا وقت گزارا۔ جوئے سیکا کو کوتا می ایک قبائلی نے اسے قبائلی رقص بھی سکھا دیا تھا۔

ایک بار وہ ہوپی قبیلے کے اپنے دوستوں کی دعوت پر ہوپی قبیلے کا سانپوں والا رقص دیکھنے کے لئے گئی جو ایک ریتیلی چٹان والی سڑک پر ہو رہا تھا۔ ان دنوں قبیلے سے باہر کے لوگ شاذ و نادر ہی یہ رقص دیکھ سکتے تھے، کیونکہ نامحرموں کے سامنے ہوپی لوگ یہ رقص نہیں کرتے تھے۔ ایڈتھ نے دیکھا کہ سانپ کے پجاریوں کے کڑھے ہوئے گھاگروں میں ٹیڑھے سانپ بھرے ہوئے تھے اور ان سانپوں کو وہ عقاب کے پروں کی جھاڑیوں سے چھیڑ رہے تھے۔ ان کی ہمت دیکھ کر ایڈتھ حیران رہ گئی۔ انتہائی طوالت سے رقص مکمل کرنے کے بعد ان سانپوں کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ایڈتھ کو ایک ہوپی قبائلی نے بتایا، "ہمارا عقیدہ ہے کہ بارش کے لئے کی جانے والی دعاؤں کو عالم اسفل تک پہنچنے کے لئے راستہ ملنا چاہئے۔ عالم اسفل میں وہ روحیں آباد ہیں جو زمین پر بارش کو بھیج سکتی ہیں۔"

ایڈتھ اپنے ایسے تجربات۔ مثلاً الکالی اٹکے نے اسے کس طرح خچر پر چڑھنا سکھایا، اپنے والدین کو بتانا چاہتی تھی۔ لیکن اس مقصد کے لئے اس نے اپنے والدین کو خطوط کے ذریعے مطلع کرنے کی بجائے چھوٹی چھوٹی تصویروں کے ذریعے ان تجربات کی عکاسی کی اور انھیں والدین کے پاس بھیج دیا۔ ایک دن ایڈتھ اور بائرن ہاروے نے، جو مسٹر ہاروے کا بیٹا اور سنتا فی ایل روڈ کا وارث تھا، کچھ انسپکٹروں کا پیچھا کیا جو ایک گہرے حصے میں نیچے جا رہے تھے۔ جب ان انسپکٹروں نے ہیبل شپ نامی جگہ کی پیمائش شروع کی تو بائرن نے ایڈتھ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا، "کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس جگہ کی پیمائش آج تک کسی نے نہیں کی؟"

ایڈتھ نے کنکھیوں سے ان سیڑھیوں اور رسیوں کی جانب دیکھا جنہیں انسپکٹروں نے تھوڑے سے فاصلے پر ریت میں پڑا چھوڑ دیا تھا، اور خود ہیبل شپ کی جانب چلے گئے تھے۔ اس نے بائرن سے پوچھا، "ہم بھی چلیں؟"

سیڑھیوں اور رسیوں سے ان کے ارادے کو تقویت ملی، اور وہ بڑی آسانی سے اوپر چڑھ گئے۔ لیکن جب انھوں نے واپس نیچے اترنے کا ارادہ کیا تو انھیں نیچے پہنچانے کے لئے کوئی سہارا نہ مل سکا۔ خوش قسمتی سے جانسن ہاروے کا استاد اُسے گھر نہ پاکر اس کی تلاش میں نکل پڑا تھا اور ندی کے کنارے سے ہی ان دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ بالآخر ایک امدادی پارٹی نے رسیوں کی مدد سے انھیں نیچے اتارا۔

کینیٹ میں چھٹیاں گزارنے کے بعد جب ایڈتھ اپنے کالج واپس آئی تو کالج میں اس کا دل نہیں لگا۔ جن دنوں اس نے امتحان پاس کیا، اس وقت تک اس کے گھر والے لقی کی کانوں کی ایک ویران بستی میں منتقل ہو چکے تھے۔ ایڈتھ کی ماں نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا: "تم اپنی تعلیم جاری رکھو گی۔ ایم۔ اے کیوں نہیں کر لیتیں؟" چنانچہ ایڈتھ نے ماں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے فرانسیسی زبان میں ایم۔ اے کرنے کے لئے اسٹین فورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

اگلے سال اکتوبر میں اس نے لڑکیوں کے بشپ اسکول میں فرانسیسی پڑھانے والی قائم مقام معلمہ کے طور پر ملازمت کر لی۔ جب وہ سرخ رنگ کی ایک چمچماتی ہوئی کار میں لاجولا کے لئے روانہ ہوئی تو اس نے شوق اور فخر سے لبریز ہو کر سوچا کہ وہ ایک ظفر مند خاتون بن گئی ہے۔ اس کی پیشانی لٹکتے ہوئے تراشیدہ بالوں کی اوٹ میں جگمگا رہی تھی۔ جب اس کی کار بشپ اسکول کے سامنے پہنچی تو اس نے محسوس کیا کہ کار اسکول کے اس ڈھانچے کے لائق نہیں ہے جو بھورے رنگ کی کچی اینٹوں کا بنا ہوا تھا اور بظاہر کوئی تبلیغی مرکز معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ اس نے کار کو شہر کے وسط میں لا کر کھڑا کر دیا۔

بشپ اسکول میں اسے جو کمرہ ملا، وہ تہ خانے میں تھا جہاں سے وہ بحر الکاہل کا نظارہ کر سکتی تھی۔ اسکول میں کام سنبھالنے کی پہلی صبح کو ایڈتھ کھریا مٹی کی چاکوں، ترشی ہوئی پنسلوں اور نئے نئے ڈھلے ہوئے بلیک بورڈوں کی خوشبو محسوس کرتی ہوئی ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ آج وہ پہلی بار ملاحوں کے سے کالر والی وردیاں پہننے والی پینتیس لڑکیوں کے سامنے آئی تھی۔

کلاسیں کامیابی سے چلتی رہیں۔ لیکن دوپہر کے وقت جب ایڈتھ فرانسیسی زبان کی بارہ طالبات کے ساتھ ایک میز کے گرد بیٹھی اس وقت اسے ایک نازک صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ دراصل ہوا یہ کہ فرانس میں پیدا ہونے والی اور وہیں کی پروردہ سوزان نامی ایک لڑکی نے ایڈتھ سے کہا: "آپ کی رائے میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم لنچ کے اوقات میں صرف فرانسیسی میں بات چیت کریں؟"

اسے فرانسیسی زبان کا صرف تین برس کا تجربہ تھا۔ وہ بمشکل ہی اس کے تمام صیغوں کے ساتھ گردان کر سکتی تھی البتہ تم نیکی کی طرح تم فرانسیسی کتابیں بآسانی پڑھ سکتی تھی۔ لیکن اس کا لہجہ پیرس کی طرز کا قطعاً نہیں تھا۔ اس نے اس لئے اس تجویز کو رد کر دیا اور دوسری لڑکیوں سے دریافت کیا۔ جس کا جواب تھا کہ ان کے [illegible] زیادہ بہتر ہوگا [illegible] کے اوقات میں اسے انگریزی کی مشق [illegible] دی۔

ولیم لیسلے ایمرسن نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ ہفتے کے روز لڑکیاں دوپہر کا کھانا کھا کر محفل نغمہ سرائی یا کنسرٹ میں شرکت کے لئے جایا کرتی تھیں۔ ایڈیتھ اس موقع پر ان کی نگران کے طور پہچان کے ساتھ جاتی تھی۔ لیکن اسے ان محفلوں میں لڑکیوں کی نگرانی کے کام سے سخت کوفت ہوتی تھی۔ سکول کے ذمہ دار لوگ سینٹ ولکیو سے وقت خاص بلایا کرتے تھے۔ وہ رقص گاہ میں شامل ہونے کے لئے اندر چلی گئی رہتی تھی۔ لیکن اسے رقص گاہ کے ایک کنارے پر ہی بیٹھا رہنا پڑتا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بھی ان مجبوروں کی طرح ہے جنہیں اپنا ہم رقص میسر نہیں آتا۔

ششماہی ختم ہونے کے بعد اسکول کا فرانسیسی کا پرنسپل رٹائر ہو گیا: اپنی زندگی پیرس میں آ گیا تھا۔ اس کی جگہ فوراً ہی ایڈیتھ کو جو اس وقت کے لڑکیوں کے اسکول میں پانچویں جماعت سے ہائی اسکول تک کے لئے فرانسیسی اور مصوری سکھانے کی ملازمت مل گئی۔ چنانچہ اس نے خود کو مصوری سکھانے کے قابل بنانے کے لئے اوٹس آرٹ انسٹی ٹیوٹ میں، اور اس کے بعد شوئی نار آرٹ اسکول میں مصوری کی تعلیم، تصویری مناظر، ونڈو کلر کی تصاویر، میکانکی نقاشی یا پینٹنگ میں حاصل کر لی۔

ایڈیتھ اسکول کی تمام لڑکیاں سیلفیا، کیتھرائن اینڈ ایگنیس فلٹے وغیرہ فلمی صنعت سے تعلق رکھتی تھیں۔ جب بھی پیراماؤنٹ یا کسی بڑے سٹوڈیو کی فلم بندی ہوتی تو اسکول کی انتظامیہ ان کو فلم بندی دیکھنے جایا کرتی تھیں۔ اس طرح ایڈیتھ کو فنکاروں کی شکل و صورت اور ملبوسات کا مطالعہ کرنے کا موقع میسر آ جاتا تھا۔

ان فلمی محفلوں ہی میں ایڈیتھ نے جانا کہ فنکار کی آسامی کے لئے پیراماؤنٹ کا ایک اشتہار دیکھا۔ اس میں یہ جاننے کا اشتیاق پیدا ہوا کہ اس آسامی کے لئے کیا کیا چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ فنکارانہ صلاحیت تو اس میں یقیناً موجود تھی، لیکن مصوری میں اس نے کوئی امتیاز حاصل نہیں کیا تھا۔

تاہم وہ ذہین تھی اور اس میں کام کرنے کی امنگ تھی اور وہ باذوق بھی تھی۔ اس نے اسے یہ جگہ مل جانے کی امید ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ کم از کم وہ اسے حاصل کرنے کے لئے کوشش تو کر ہی سکتی ہے۔

پھر ایک ایسے لباس کی جستجو میں جس میں وہ فن کار نظر آ سکے، اس نے سیاہ سوٹ، سفید بلاؤز اور ایک غیر معمولی بڑی ٹائی کا انتخاب کیا۔ اس نے یہ لباس پہنا اور اپنے بنائے ہوئے خاکوں کا ایک فائل بغل میں دبا کر ایک ٹیکسی میں بیٹھی اور پیراماؤنٹ کے تزئین کار اعلیٰ، ہانس ڈریئر سے ملاقات کرنے کے لئے روانہ ہو گئی۔ فلمی دنیا کے علاوہ دیگر شعبوں میں ایڈتھ کو بہت سے مواقع مل سکتے تھے، لیکن اسے فلموں سے دلچسپی تھی۔ اس میں کسی حد تک ایسی صفات ضرور موجود تھیں جو ایک تزئین کار کے لئے لازمی ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس نے خود کو ڈھارس دیتے ہوئے سوچا کہ اس کے پاس وسیع تعلیم، تخئیل اور دستکارانہ مہارت کا سرمایہ موجود ہے۔

ہانس ڈریئر نے ایڈتھ کے بنائے ہوئے خاکوں کا جائزہ لینے کے بعد اسے جگہ دے دی۔ لیکن جب اسے پہلا کام تفویض کیا گیا تو اس کی خوشیوں پر پانی پھر گیا۔ پہلے کام کے طور پر اسے ایک ہاتھی کی کمر کی ایسی پیٹی بنانے کا کام دیا گیا تھا جو ہاتھی کی پشت پر لگائے جانے والے ہودے کو سنبھال سکے۔ بہت دنوں تک ایڈتھ پوڈلز[1]، افریقی لنگور، گھوڑے اور دیگر جانوروں کے ساز اور کلغیوں کے ہی نقشے بناتی رہی۔ ہاتھی اپنی سونڈ سے اپنا ساز اتار کر پھینک دیا کرتے تھے، اور اونٹ غضبناک ہو کر ایڈتھ پر خرخرانے لگتے تھے۔ جب اس کے پاس جانوروں کو کپڑے پہنانے کا کام نہ ہوتا تو وہ کلغیوں کے پروں پر نقطے لگانے یا جوتوں کے فیتے بنانے میں مصروف رہتی تھی۔ ایڈتھ کبھی خود سے مطمئن نہیں ہوتی تھی، اور اکثر خود کو ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے ناقابل محسوس کرتی تھی۔ پھر بھی اسٹوڈیو میں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو ایڈتھ کے متعلق یہ کہہ سکتا ہو کہ وہ فلاں کام انجام نہیں دے سکتی۔

بعض اوقات اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہر کام غلط کر رہی ہے۔ ایک بار جب اس سے موتیوں اور زیورات کی فہرست تیار کرنے کے لئے کہا گیا تو اس نے شمار کرنے کے اس تھکا دینے والے کام میں کئی دن لگا دیئے اور یہ تاخیر اس لئے ہوئی کہ وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ اسے موتیوں کو الگ الگ شمار کرنا چاہیے یا موتیوں کی لڑیوں کا شمار ہی کافی ہوگا۔ تاہم دو چیزیں ایسی تھیں جن کے باعث وہ اپنے کام میں

[1] ایک قسم کا کتا جس کے بال لمبے اور گھونگھریالے ہوتے ہیں۔

گی رہی، ایک تو اس کا تزئین کار بننے کا مصمم ارادہ، اور دوسرے ہاورڈ گریئر اور ان کے اسسٹنٹ ٹریوس بینٹن کا اسے اشتیاق دلانا۔ شام کے وقت وہ اب بھی متواتر شو سنار جاتی تھی اور انسانی اشکال کی خاکہ نگاری کا فن سیکھتی تھی۔

اسٹوڈیو کے کام سے اس میں کپڑوں کی بناوٹ، رنگ، لائین اور ڈیزائنوں کا اور زیادہ واضح احساس نشوونما پاتا گیا۔ اس نے بھرپور غور وفکر کے ذریعے بینٹن اور گریئر کے اسلوب میں خاکے بنانے سیکھ لئے۔ پھر اس کی دلچسپی اس قدر بڑھ گئی کہ معمولی سے معمولی کام بھی مہارت سے انجام دینے لگی۔ لیکن اب بھی وہ پچھلے کمرے میں ہی بیٹھا کرتی تھی اور اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے وہ سب کچھ کرتی رہتی جس کے لئے دوسرے کسی شخص کے پاس نہ وقت ہوتا تھا اور نہ دلچسپی، وہ خود کو تسلی دیتی رہتی تھی کہ کم از کم وہ دوسروں کے ساتھ کام کرنے کا طریقہ تو سیکھ رہی ہے اور اسے یہ بھی تجربہ ہو رہا ہے کہ فنی مہارت کے افق تک کس طرح پہنچا جاتا ہے۔

ایک عرصہ بعد اسے ترقی ملی اور اسے "بی ویسٹرن" کے لئے گھاؤں اور گوانوں کے سنگار کا کام دیا گیا ہاورڈ گریئر جس انداز سے بڑے بڑے فلمی ستاروں کی تزئین کا کام کرتے تھے، ایڈتھ اس انداز پر برابر غور کرتی رہتی تھی اور اسے یہ تجربہ حاصل ہوا تھا کہ خاکہ نگاری میں ناپ وغیرہ محض ابتدائی حیثیت رکھتے ہیں بہترین تزئین کاری کے لئے، اسے اپنے گاہک کے انداز و اسلوب، چہرے کے خط و خال اور اس کے کردار کا جائزہ لینا چاہیے۔

پھر جب ہاورڈ گریئر نے اپنا ذاتی اسٹوڈیو کھولنے کے لئے پیراماؤنٹ سے استعفیٰ دے دیا تو ان کی جگہ ٹریوس بینٹن کو مامور کر دیا گیا اور ایڈتھ کو بینٹن کا اسسٹنٹ بنا دیا گیا۔ آخر اسے "ڈولف سونگ" میں پہلی بار ایک بڑی اداکارہ لیوپ ویلیز کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ لیوپ کے چاندنی رات میں فلمائے جانے والے ایک طویل منظر کے لئے اس نے پورے کینوس پر سفید رنگ کے انتہائی دیدہ زیب لباس کا ڈیزائن بنایا۔

ایک نقاد نے اس فلم پر رائے دیتے ہوئے لکھا کہ "اگر اس فلم میں اتنے زیادہ لباس نہ ہوتے تو کچھ مناظر اور بہتر ہو سکتے تھے" ایڈتھ نے چونکہ اپنے تجربے سے یہ سیکھا تھا کہ کردار کو ذہن نشین کرانے کے لئے کپڑوں سے کیونکر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اس لئے وہ اس تنقید سے آزردہ خاطر نہیں ہوئی۔

ایڈتھ کو بہترین موقع اس وقت ملا جب ٹریوس بینٹن "ڈالمنڈ ہل" کے لئے مائے ویسٹ کی تزئین کاری کا کام ایڈتھ کے سپرد کر کے یورپ چلے گئے۔ پوشاک کا منصوبہ بنانے کے لئے ایڈتھ خود اداکار

کے گھر پہنچی۔ اس وقت ماے سفید ساٹن کا پیچھے لٹکتے ہوئے دنبلے دار دامن والا ڈھیلا ڈھالا باس پہنے ہوئے تھی۔ ایڈتھ نے جب اس کے کمرے میں قدم رکھا تو سفید ریچھ کے بالوں کے بنے ہوئے نمدے میں اس کے پیر ٹخنوں تک دھنس گئے۔

ماے کو "ڈائمنڈ لل" میں ایک بے تکلف، ہنس مکھ اور ذہین عورت کا کردار ادا کرنا تھا۔ وہ ہیروں کی عاشق تھی لیکن موتیوں کے متعلق اسے یقین تھا کہ ان سے بدبختی نازل ہوتی ہے اور اس لئے موتیوں کو ناپسند کرتی تھی۔ ایڈتھ نے اس کے لئے "جڑاؤ کام والے" مسئلے حل کرتے ہوئے کپڑوں کے ڈیزائن بنائے سفید ساٹن کے باس پر پرندوں کے پروں کی گوٹ لگانے کے لئے پر اور جھالردار زنانی چھتری حاصل کرنے وہ جنوبی پیساڈینا کے ایک شتر مرغ خانے تک گئی۔ وہاں اس نے چھوٹے چھوٹے پہیوں والی اس گاڑی کی سواری بھی کی جسے سدھائے ہوئے شتر مرغ کھینچتے تھے۔

ماے اور دوسرے اداکاروں کی تزئین میں ایڈتھ کی کامیابی سے، اسے ایک مؤثر اور مہذب شخصیت کے طور پر نمایاں ہونے میں مدد ملی۔ پھر جب ۱۹۳۸ء میں ٹریوس بینٹن پیرامانٹ سے مستعفی ہوئے تو ایڈتھ کو تزئین کار اعلیٰ کا عہدہ مل گیا۔ وہ فلمی دنیا میں یہ عہدہ حاصل کرنے والی پہلی خاتون تھی۔

ایڈتھ کے مالک سیسل بی۔ ڈی مل نے اس خیال سے کہ ماہر استادوں کے فن سے ایڈتھ واقفیت حاصل کر سکے، اسے پیرس بھیج دیا۔ پیرس میں پیرامانٹ کے آفس کی نگران لیلین اور فرینک فرے نے اس کی رہبری کی۔

لیلین ایک ماڈل گرل تھی، اس سے ایڈتھ نے باس کا فن بھی سیکھا اور اس کے ہمراہ دیوان خانوں کی سیر بھی کی۔ نیز فیشن کے طرز نگار ایلیکس اور شیاپریلی سے ملاقات کی۔ ایڈتھ کو پیرسی طرز اور اس کے واضع پہ مدہوں۔ آے اور اس پر ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ لیکن وہ کچھ وقت شہر کی سیاحت، آرٹ گیلریوں اور تھیٹروں کی تفریح میں بھی گزارنا چاہتی تھی۔ لیلین اس سے کہتی رہی، "یہ تمام تفریحات تم بعد میں بھی کر سکتی ہو"

رفتہ رفتہ ایڈتھ کے ذہن میں فیشن کے متعلق ایک فلسفہ نشو و نما پا گیا۔ اسے کامل یقین ہو گیا تھا کہ باس، زندگی کے متعلق عورت کے نظریے کے تعین، اور تجارت اور محبت کے مقابلے میں کامیاب ہونے کے لئے اس کی صلاحیت کو ابھارنے میں معاون ہوتا ہے۔ بے ہنگم باس حد سے زیادہ بدسلیقگی کی نشاندہی کرتا ہے، لیکن بھڑکیلا باس زیادہ گراں نہیں ہونا چاہیئے۔

بمبئی میں قیام کے دوران میں ایڈتھ نے لباس کے اعتبار سے خود کو بھی بہتر بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے نئے طرز کے بال بنوائے اور شیاپریلی کے یہاں سے گلابی اور زرد رنگ کے کڑھاؤ کے کام والا سیاہ رنگ کا ایک ڈنر سوٹ خریدا۔ اپنے ہوٹل کے کمرے میں واپس آ کر اس نے یہ سوٹ پہنا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ آئینے میں خود کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ وہ شکل و صورت اور اپنی حرکات میں اپنی حقیقی شخصیت سے کچھ آگے نظر آ رہی ہے۔ اس کے مقابل جس ایڈتھ ہیڈ کا عکس تھا وہ نئی تو تھی لیکن حقیقی نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے یہ سوٹ اتار دیا اور بالوں میں کنگھا کر کے ان کو دوبارہ اپنے سابق طرز کے مطابق بنا لیا۔ اسے ہمیشہ کے لئے یہ سبق حاصل ہوا کہ عورت کو اپنی طرز کے مطابق ہی بننا سنورنا چاہئے اس لئے اس نے خود کو تسلی دی کہ یہ سوٹ قیمت کے مطابق نادر تو ہو سکتا ہے، لیکن اس کے پہننے کے قابل نہیں ہے۔

پھر جیسے ہی وہ ہالی وڈ واپس پہنچی، اس نے اپنا اسٹوڈیو قائم کر لیا۔ معاونت کے لئے اس کے پاس انتہائی قابل کٹر، برانڈ یوٹ کا کام کرنے والے اور درزی موجود تھے۔ ان میں سے بیشتر شیوس جینٹس سے تربیت یافتہ تھے۔ ان لوگوں نے ایڈتھ کو بے انتہا تعاون دیا لیکن مس ہیڈ کو اپنے عظیم مقاصد کے لئے ضابطہ بنانا تھا، اس لئے وہ اپنے کارکنوں کی سرگرمیوں کی نگرانی رکھتی، اور ایک مستری کی طرح کام کرتی تھی۔

ان دنوں فلم کار زرق برق اور عالی شان پوشاک کا حد سے زیادہ استعمال کرتے تھے۔ ہیروئنیں سفید ساٹن کی عمدہ ہی پہنتی تھیں اور سیکریٹری منک[1] کی سمور کے کوٹ پہنا کرتے تھے۔ ایڈتھ نے اس پر احتجاج کیا اور یہ دلیل پیش کی کہ حقیقی زندگی میں سیکریٹری ایسی پرتکلف چیزیں نہیں خرید سکتے۔ لیکن عارضی طور پر اس نے اس وقت کے رجحانات کا بھی ساتھ دیا اور کلیوپیٹرا کے لئے لباس کا ایسا ڈیزائن تیار کیا جسے اس ایکٹریس نے "بلوریں فانوس" سے تعبیر کیا۔

مگر ہم ایڈتھ ہیڈ کی غیر حقیقی ملمع سازی سے بے حد متنفر ہوتی گئی۔ اس نے ایکٹروں، ڈائرکٹروں اور اسٹیج گرافروں پر تجربات شروع کئے تاکہ وہ پردۂ سیمیں پر بھی کسی حد تک ایسے ہی نظر آ سکیں جیسے وہ اپنی عام زندگی کے حقیقی روپ میں ہوتے ہیں۔ فلم سازوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ تماشائیوں سے

[1] منک۔ نیولے کی قسم کا ایک جانور۔

ان اہمیت کی حامل پینٹنگز بنا کر وہ مشہور ہو گئے [illegible]
اسٹوڈیو سے باہر ایڈتھ [illegible] سے بے حد [illegible] لینے لگی [illegible] ووسٹون
پیپلز کے نام سے مشہور تھا ایڈتھ کے ساتھ ہی [illegible] میں [illegible] کی حیثیت سے شامل
ہو گیا تھا [illegible] بے تکلفی [illegible] کی تیاریوں کے دوران میں دونوں
ایک دوسرے کے اور بھی زیادہ قریب آ گئے تھے اور عام طور پر ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے

ایڈتھ پال کی شخصیت [illegible] کی [illegible] ایڈتھ کی خواہشات کو ملحوظ خاطر رکھتے
[illegible] اپنے پاس بلاتا اور [illegible] طرح مخاطب ہوتا جیسے وہ کسی اجنبی سے بات کر رہا ہو" اخبارات
میں ایک [illegible] دکھانے لے جا رہا ہوں [illegible] دعوت دینے کے لئے مجھے [illegible] بھیجے جا سکیں۔"

دسمبر ۱۹۲۰ء کو ان دونوں نے لاس ویگس (نیواڈا) جا کر شادی کر لی شادی کے بعد ایڈتھ
نے اپنا کام تو جاری رکھا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ [illegible] آگے [illegible]
ترجیح نہیں دے گی۔

اپنے گھر میں آ جانے کے بعد ایڈتھ اور پال کے درمیان [illegible] کی تکرار شروع ہو گئی
پال نے شادی سے قبل [illegible] طرز کا [illegible] فرنیچر خریدا تھا جو ایڈتھ کے فرانسیسی طرز کے فرنیچر
کے ساتھ بے جوڑ سا معلوم ہوتا تھا۔ اس تکرار میں ایک برس گزر گیا۔ پھر ایڈتھ نے فیصلہ کیا کہ وہ پال
کو اس کی مرضی کرنے دے گی اور ایک بیڈ روم سیٹ کے علاوہ اپنا تمام فرنیچر [illegible]

پہلے ان دونوں نے ایک [illegible] بستی میں مکان خرید لیا جس کی [illegible] پہاڑی طرز کے
سبزہ زار والا باغیچہ بھی شامل تھا۔ پال [illegible] کا عادی تھا۔ [illegible] ایڈتھ [illegible]
ایک [illegible] خصوصیات نمایاں کرنے کے لئے انھوں نے مکان کے
اندرونی حصے کی [illegible] چینی کے برتن، تانبے کی [illegible] میکسیکن طرز کے [illegible]
جمع کر لئے۔ [illegible] اور ایڈتھ کے [illegible] کے [illegible] اور
[illegible] بنا لیا۔

دوسری جنگ عظیم [illegible] ایڈتھ کی [illegible] زندگی [illegible]
[illegible] کے ساتھ ہی [illegible]

سے تعلقات ختم کردیئے گئے۔ اس پابندی کو ایڈیتھ نے ایک عطیۂ رحمت سمجھا، کیونکہ کپڑوں کے کنٹرول نے فلم سازوں اور ڈیزائن بنانے والوں کو اب زمین پر لا کھڑا کیا تھا۔

جن خواتین کو کپڑے کی قلت کے باعث دشواریاں پیش آتی تھیں، ان کے لئے ایڈیتھ نے عملی نکات سے بھرپور مضامین تحریر کئے۔ ان مضامین میں اس نے مشورہ دیا کہ سوٹ کو جمپر میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ جنگ کے زمانے میں خود اس کے کپڑوں کی الماری میں صرف چار سوٹ تھے، جنھیں وہ بلاؤز بدل بدل کر یا ان کے ساتھ کوئی سادہ سا زیور پہن کر استعمال کرتی تھی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ایڈیتھ نے گورنمنٹ کے مسودۂ قانون کے مطابق یو۔ سی۔ ایل۔ اے۔ میں بحری اور بری افواج کے سپاہیوں اور ملاحوں کو فلموں کے لباس کے ڈیزائن سکھانے شروع کر دیئے۔ لیکن یہ کام اور اس کے ساتھ اسٹوڈیو کی مصروفیات اسے حد سے زیادہ بوجھل محسوس ہوئیں چنانچہ اس نے طے کیا کہ اسے اپنے گاہکوں کے کام پر ہی قناعت کرنی چاہئے۔

'دی ایریس' کے لئے اولیویا ڈی ہیوی لینڈ کی پوشاک پر کام کرتے ہوئے اسے بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک دشواری اسے یہ تھی کہ فلم کے ابتدائی مناظر میں اولیویا کو بدصورت دکھانا تھا۔ اس مقصد کے لئے ایڈیتھ نے بھدے رنگوں کے موٹے کپڑے استعمال کئے اور قمیصوں کے گلے سادے ہی بنائے۔

اس فلم کا ماحول چونکہ انیس ویں صدی کے پہلے عہد کا تھا، اس لئے کچھ دوسری مشکلات بھی پیش آئیں۔ فلم ہنری جیمس کے ناول 'واشنگٹن اسکوائر' پر مبنی تھا۔ ایڈیتھ نے فلم کے مسودے اور ناول دونوں کا مطالعہ کیا۔ اس فلم میں رول کرنے والی اولیویا اور ایڈیتھ نے اس عہد کے زیر جاموں کر کے نیچے سے چھاتیوں تک پہنچ جانے والی پیٹیوں، غلافوں، بالوں کے طرز، دامن کش اور اسکرٹس کے متعلق تفصیلات جمع کیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے نیویارک کے عجائب خانے کھنگال ڈالے۔

پوری تحقیق کے بعد ایڈیتھ نے جو ڈیزائن تیار کئے وہ تمام تر باریکیوں کے ساتھ تاریخی اعتبار سے بالکل صحیح تھے۔ ان ڈیزائنوں کی وجہ سے فلم بے حد مقبول ہوئی، اور مستند سمجھی گئی۔ لیکن ایڈیتھ کو یقین نہیں تھا کہ فلم بین حضرات اور نقاد اس کی تحقیق کو سراہ سکیں گے۔ ۱۹۴۸ء میں موشن پکچر اکاڈمی نے فلمی ستاروں کے علاوہ پہلی بار تزئین کاروں کو بھی آسکر ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس سے قبل

اس نے 'دی ایمپرر والٹز' کے لئے جون فونٹین کا جو لباس تیار کیا تھا، اس کی کسی نے قدر نہیں
کی تھی، لیکن 'ایزلس' پر ایڈیتھ کو آسکر ایوارڈ پیش کیا گیا۔ ججوں نے اپنے فیصلے میں کہا تھا کہ اس
ایوارڈ کی بنیاد کپڑوں کی خوبصورتی کی بجائے اس اہمیت پر ہے کہ ایڈیتھ نے لباس کو کہانی کا تکمیلی
جز بنا دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ انعام پیش کیا جا رہا ہے۔

آسکر ملنے پر ایڈیتھ کو جس مسرت کی توقع تھی وہ اسے حاصل نہیں ہو سکی۔ یہ اعزاز حاصل کرتے
ہوئے اس نے صرف یہ سوچا کہ آسکر چونکہ سونے کا ہے اس لئے اس کے پسندیدہ چاندی کے کپ کی
طرح کالا نہیں پڑے گا۔ پھر وہ دوسرا اعزاز حاصل کرنے کے امکانات کی جانب متوجہ ہو گئی لیکن
اس نے اپنی ازدواجی زندگی کو کبھی فراموش نہیں کیا۔

بل اور ایڈیتھ، دونوں کو تیراکی، ٹینس، بحری مناظر کی تصویر کشی اور گھر کے اطراف میں آرائشی
کام کرنے کا شوق تھا۔ ہر سال وہ ساؤتھ ویسٹ اور میکسیکو کا سفر کرتے تھے۔ اس سفر کے
دوران میں وہ امریکی قبائل کے اصلی زیورات اور تانبے کے زیورات کی تلاش میں دور نکل جاتی
تھی۔ دوسرے ملکوں میں ایڈیتھ چینی مٹی کی بلیاں، منقش تصویریں، قدیم طرز کی سلائی کی مشینیں
اور سلائی کے قدیم طریقے فراہم کیا کرتی تھی۔ گھر پر اسے بدیسی کھانوں پر تجربات کرنے کا شوق تھا۔
اور اطالوی میکرونی اور گھونگے، اسپینی طرز کا سبزیوں کا سوپ اور ٹھنڈا کر کے کھایا جانے والا
گز پیچو تیار کیا کرتی تھی۔

جن دنوں ایڈیتھ بیس بال ٹیم کی کھلاڑی اور ایک تیز مزاج عورت کی کہانی 'روبرب' پر کام
کر رہی تھی، اس نے یہ ذمہ داری محسوس کی کہ اسے اس کھیل کے قواعد سیکھنے چاہئیں، چنانچہ وہ
بیس بال کی دلدادہ بن گئی۔ ان تفریحوں سے ایڈیتھ کو ہالی ووڈ میں اپنی شدید ترین ارتقائی جدوجہد
میں مدد ملی۔

پوشاک کی ضروریات سے واقف ہونے کے لئے، ایڈیتھ کو فلم کا مسودہ پڑھنے کے بعد فلم ساز،
ہدایت کار، آرٹ ڈائریکٹر، سیٹ ڈائریکٹر، کیمرہ مین، کلر ایکسپرٹ اور اداکاروں سے مشورہ کرنا
پڑتا تھا کیونکہ اس کے بغیر صدا بندی کرنے والا اعتراض کر سکتا تھا کہ "یہ لباس سرسراتا ہے" یا آرٹ
ڈائریکٹر کسی سرخ رنگ کے لباس کو یہ کہہ کر نا منظور کر سکتا تھا کہ وہ کلر اسکیم سے متصادم ہوتا ہے۔

... فلم میں لباس کے ذریعے کردار کی وضاحت ہمیشہ ایک مشکل حکمت عملی ہوتی ہے۔ لباس کو کردار کی
خصوصیات کا عکاس ہونا چاہئے مگر اس کے ساتھ ہی یہ ضروری ہے کہ لباس اتنا نمایاں نہ ہو کہ توجہ
کہانی سے ہٹ جائے۔ اگر ممکن ہو تو لباس کو اداکار کے مزاج میں رچا بسا ہونا چاہئے۔ ہچکاک کی فلم ریئر ونڈو
جنٹری گرل، اس فلم کے لئے گریس کیلی کا ایسا لباس تیار کیا گیا تھا جس میں وہ ایک الھڑ دوشیزہ نظر آئے۔
گریس کیلی نے وہ لباس پہن کر کیمرہ ٹیسٹ کے لئے آئی تو اس نے بچوں کی طرح لپٹے ہوئے مگر یہ لباس
نے اسے عکس دی اور پہلے بھی نظر آتی ہے ... جیسے اسے اپنی محبت کا
عمر مل گیا ہو۔

بعض اوقات لباس صحیح طور پر کام نہیں دیتا۔ ایک بار ایڈتھ ہیڈ نے جنجر راجرز کے لئے ہیروں کے
ہونے کے بعد والا ایک لباس تیار کیا تھا۔ یہ لباس پہن کر جب جنجر راجرز نے ریہرسل کے ساتھ رقص
کیا تو کیمرے کے رقص کے سیٹ پر ... کپڑوں سے ... گیا اسے جب کیمرے کے سامنے کو سیٹ پر
بلایا گیا تو وہ لوگوں کے قہقہوں کے درمیان اپنے سوٹ پر لگی ہوئی خراشوں کو چھپانے کی کوشش کرنے
لگی۔ یہ منظر دیکھ کر ایڈتھ کے چھکے چھوٹ گئے لیکن اس نے فوراً ایک تدبیر ڈھونڈ نکالی اور ایک گاڑی
کو سٹوڈیو کی رنگ کی دکان پر بھیج کر فوراً رنگ چڑھانے والا سپرے منگوایا اور رنگ کرنے
کی مشین منگا لی۔ رنگ کرنے سے کرانٹ کے سوٹ پر پڑی ہوئی خراشیں چھپ گئیں۔

عام طور پر پوشاک اپنی جگہ کوئی مسئلہ نہیں ہوتی، بلکہ فلم ساز کسی اداکار کو جس قسم کی پوشاک
پہنانے پر اصرار کرتا ہے ... مثلاً فلم ... میں ...
گورے چٹے ... کو ایک ایسے سوٹ میں دکھانا چاہتا تھا جو سان فرانسسکو کا ...
کا ہی ایک حصہ معلوم ہو ... سے سوٹ ... نہیں چاہتا تھا۔ اصفا کستری رنگ کا سوٹ
کے تو قطعی خلاف تھا۔ ایڈتھ نے کم ناوک کو کپڑوں کے بہت سے نمونے دکھائے، پھر اس نے خاکستری
رنگ کا ایک نمونہ دکھا ... یہ خوبصورت نہیں ہے ...
... قسم کا خاکستری رنگ ٹھیک رہے گا۔ کم ناوک نے اس نمونے کو پسند کر لیا ...
... کو یا ... جس پوشاک کے پہننے میں وہ ...
... فلم کی ... لیکن کپڑوں کا ... کر ...۔

ایڈیتھ نے بیدبرا کے خوبصورت اتفاقیہ حسن سے متاثر ہو کر ان میں اعلیٰ ترین فیشن کا ذوق پیدا
کرنے کی کوششیں کیں جو پیشہ ورانہ طور سے تدریجاً مختلف تھی۔

ایڈیتھ کی کوئی بھی دشواری فلم ساز پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ مرحوم سیسل بی ڈی مل،
جو ہر وقت عظیم پیمانے پر فنی کمال کی انتہا کو پیش نظر رکھتے تھے، ہر ایک سے معمولی تفصیل کی بھی سند طلب
کیا کرتے تھے۔ ایڈیتھ کو بعض اوقات فرانسیسی اور دیگر زبانوں میں تحقیق کرنی پڑتی تھی۔ "سیمسن
اینڈ ڈیلیلا" میں ڈی مل نے ہیڈی لامر کے لئے مور کے پروں کا لباس بنوانے کا ارادہ کیا تھا۔ ان کا
یہ مطالبہ ایسا تھا جس پر عمل کرنا ناممکن معلوم ہوتا تھا لیکن اس کے لئے ڈی مل نے خود اپنے ذاتی
مور کے پر فراہم کر دیئے، جس سے ایڈیتھ نے پوشاک بنائی اور اسی پوشاک پر اسے دوسرا اکاڈمی ایوارڈ
دیا گیا۔ اسی سال ایڈیتھ کو "آل اباؤٹ ایو" میں بیٹ ڈیوس کی پوشاک پر تیسرا آسکر ایوارڈ ملا۔
ایڈیتھ کہا کرتی تھی کہ یہ فلم تو شروع سے ہی ایک تماشہ بنی ہوئی تھی۔ بیٹ انتہائی سخت اور غیر معمولی
ذہین تھی، اور کبھی اضطراب کا شکار نہیں ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے ایڈیتھ اسے اپنا ایک دلچسپ
گاہک سمجھتی تھی۔ تیسرا آسکر ملنے کے بعد ایڈیتھ کو "اے پلیس ان دی سن"، "رومن ہالی ڈے" اور
"سبرینا" کے لئے بنائی گئی پوشاکوں پر بھی انعامات پیش کئے گئے۔

بعض اوقات جدید طریقِ کار میں ابتدا ہی سے مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً جب ٹیکنی کلر
کی ابتدا ہوئی تو پیرا ماؤنٹ نے اپنی رنگین فلم "دی ورجینین" کو ٹیکنی کلر میں بنانے کا ارادہ کیا۔
چنانچہ میڈلین کیرول کے لئے اب تمام رنگین پوشاک کی ضرورت پڑی، کیونکہ سفید و سیاہ فلم کے
لئے بنائی گئی بیشتر پوشاک بے کار ہو گئی تھی۔ اس وقت میڈلین لندن سے واپس آ رہی تھی۔
اس سے ملنے کے لئے ایڈیتھ کو نیویارک کے لئے روانہ کیا گیا۔ انہوں نے والڈورف ہوٹل کے ایک کمرے کو درزی خانے
میں تبدیل کیا، اور ہیٹی کارنیگی کے یہاں سے ایک فرم مستعار لے کر تین دن کے اندر ہی پوشاک کا ذخیرہ
تیار کر لیا۔ اس فلم کے لئے ایڈیتھ کے تیار کئے ہوئے شب عروسی کے گاؤن کی تصویر "ووگ" کے پورے
صفحات میں شائع کیں۔

جیسے جیسے شہرت بڑھتی گئی، ایڈیتھ کے شب و روز انتہائی مصروفیت کے عالم میں
بسر ہوتے رہیں۔ اس کی روز مرہ کی مصروفیات میں ورکشاپ کی نگرانی، فلموں کے لئے تیار ہونے والے کپڑوں

کا انتخاب، پوشاک کے ذخیروں کی منصوبہ بندی اور ڈاک کا مطالعہ شامل رہتا ہے۔ ان مصروفیات کے درمیان میں عام طور پر اس کے گاہکوں کے ٹیلی فون بھی آتے رہتے ہیں اور وہ اپنا کام چھوڑ کر ان سے بھی نپٹتی ہے۔ ان میں سے کوئی اپنے متعلق دریافت کرتی ہے کہ "وہ کون سی پوشاک پہنے گی؟" تھوڑے تھوڑے وقفے سے اس کے ٹیلی فون پہ ایک سرخ لائٹ جل جاتی ہے، اور ایڈتھ پھرتی سے کسی اسٹیج کی جانب دوڑ پڑتی ہے، تاکہ پارٹ[1] پہنتی ہوئی کسی جھلائی ہوئی ایکٹریس یا ڈائریکٹر کو پیش آنے والی کسی نگہبانی دشواری سے بچاکر ان دونوں کے غصے کو رفع کر سکے۔

کبھی کبھی پیرا ماؤنٹ میں ایک وقت میں صرف ایک ہی فلم کا کام ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسے موقع پر ایڈتھ فرانس کے کسی جنگی فلم یا وکٹوریہ کے عہد کے انگلستان سے متعلق کسی فلم یا جزیرہ ساؤتھ سی میں فلمائے جانے والی کسی نمائشی فلم کی تیاریوں کے لئے وقت نکال لیتی ہے۔ کام کے دباؤ کے باوجود وہ بیشتر اوقات پرسکون رہتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی وہ اپنے کام سے اس لئے اکتا جاتی ہے کہ اس سے دوستوں کے لئے بہت کم وقت میسر آتا ہے۔

خوش قسمتی سے اس کے بیشتر گاہک اس کے دوست ہو گئے ہیں۔ اس لئے بعض اوقات ایڈتھ کام اور تفریح کو یکجا بھی کر لیتی ہے۔ فرانس میں "ٹو کیچ اے تھیف" کے لئے پوشاک کے ڈیزائن بنانے کے دوران میں گریس کیلی سے اس کی ملاقاتیں رہیں، جسے اس نے انتہائی مہذب، پرخلوص اور پرجوش شخصیت کا حامل پایا۔ ان دونوں نے ایک ساتھ خریداری کی، ٹینس میچ اور تھیٹر ہال میں ڈرامے دیکھے۔ اس کے بعد ہالی وڈ میں بھی گریس کیلی ایڈتھ کے پاس آتی رہی اور اس کے ہمراہ تیراکی اور پکنک کے لئے جایا کرتی تھی۔ اب تو وہ مناکو کی شہزادی ہے لیکن ایڈتھ سے اس کی خط و کتابت اب بھی جاری ہے، اور اسے اپنے بچوں کی تصویریں بھیجا کرتی ہے۔

فلمنگ کے موقع پر جس طرح ایڈتھ فلمی ستاروں کا جائزہ لیتی ہے، اس انداز سے کوئی اور جائزہ نہیں لیتا۔ پردہ سیمیں پر غیر ملکی اور جذبات خیز نظر آنے والی مارلین ڈیٹرچ، صبح ساڑھے چھ بجے اسٹوڈیو پہنچ جاتی ہے، وہ میک اپ کر کے نہیں آتی۔ لیکن اس کی شخصیت سے بھرپور توانائی جھلکتی ہے۔ اسٹوڈیو پہنچ کر وہ اپنی گاڑی میں سے کتابیں، مسودے اور جوتوں کا ایک فاضل جوڑا نکالتی ہے۔ ایڈتھ اور

---

[1] ایکٹروں کے پہننے کی وردی۔

دیگہ اشیاف کے لئے وہ اکثر گاؤ کا تھرمس اور سات چھوٹی دانی پیسٹری لایا کرتی ہے۔ اس کے کپڑوں کا ایک ایک ٹانکا، ایک ایک کاج بالکل درست ہونا چاہئے، لیکن وہ کبھی تنگ مزاجی کا مظاہرہ نہیں کرتی اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے آدمی تھک تو سکتا ہے، لیکن اکتاتا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی قربت انتہائی سرور انگیز ہوتی ہے۔

ایڈتھ کے کچھ گاہک ایسے بھی ہیں جو اس کے اسٹوڈیو میں بے انتہا شور مچاتے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور خودسری کے عالم میں کپڑوں میں نقص نکالتے ہیں۔ دوسرے کچھ گاہک منکسر مزاج، ایڈتھ کے مداح اور اس کی تعظیم کرنے والے ہوتے ہیں۔ ایڈتھ کہا کرتی ہے کہ "کسی اداکار کی عظمت کا انحصار اس پہ ہے کہ اس کے ساتھ کام کرنا آسان ہو۔" مثال کے طور پر وہ اینجل بیری مور کا حوالہ دیا کرتی ہے، جس کی رحم دلی اور سوجھ بوجھ مشہور ہے۔

ایڈتھ عام طور پر اپنے گاہکوں کے دل میں جگہ بنا لیتی ہے۔ صوفیا لورین سے اس کی اتنی دوستی ہے کہ وہ دونوں ایک ساتھ جِن راشک کھیلا کرتی ہیں۔ جو شیلا کم نادک اس کے ساتھ سبزیاں کھایا کرتا ہے اور جب یہ دونوں ایک ساتھ گاجریں کھاتے ہیں تو ایڈتھ تبصرہ کرتے ہوئے کہتی ہے، "گاجریں تمہارے اعضا کے لئے مفید ہیں۔" خم دار کاکلوں والی میری مارٹن جب پہلی بار ہالی ووڈ آئی تھی تو ایڈتھ نے اسے "انتظامیہ" کا خطاب دیا تھا، جس سے وہ ناراض ہو گئی تھی۔ پھر جس انداز سے وہ اپنے بال کٹوانا چاہتی تھی، اس خطاب کے مل جانے کے بعد اس طرز کے بال بھی نہیں کٹوا سکی، چنانچہ جب کبھی اسے موقع ملتا، وہ ایڈتھ سے لڑ پڑتی تھی۔

ایڈتھ محسوس کرتی ہے کہ اس نے فلمی اداکاروں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ صوفیا لورین نے اسے اطالوی زبان سکھائی، اور گلوریا سوانسن نے اسے مالی امور کی جانب متوجہ کیا۔ علاوہ ازیں وہ اداکار جو معمولی صلاحیتوں کے حامل ہیں، انھوں نے بھی اسے کچھ نہ کچھ ضرور سکھایا ہے۔

ایڈتھ گو مشہور و معروف شخصیتوں کے لئے کام کرتی ہے، لیکن عام خواتین اور ان کی پوشاک سے متعلقہ مسائل میں بھی ہمیشہ دل چسپی لیتی ہے۔ وہ اصرار کرتے ہوئے کہا کرتی ہے کہ معمولی آمدنی میں اپنا گذارا چلانے والی خواتین کو بھی جدا جدا لباس پہننے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ پیراماؤنٹ میں، اسٹوڈیو میں کام کرنے والی خواتین، ویٹرس، ٹیلی فون آپریٹرز وغیرہ کو بے تکلفی سے مشورے دیا کرتی ہے۔

۱۹۴۴ء میں آرٹ لنک لیٹر نے اپنا شو ہاؤس پارٹی پیش کیا اور ایڈیتھ سے درخواست کی کہ وہ شو میں آنے والی خواتین کو خطاب کیا کرے اور انہیں پوشاک کے بارے میں مشورے دے۔ چنانچہ اس نے یہ درخواست منظور کر لی۔ پہلی بار مائیک پر وہ بے حد گھبرائی۔ تاہم اس کا یہ پہلا شو ایک ناخوشگوار تجربہ ثابت ہوا۔ لیکن اس دہشت اور کرب کے باوجود ایڈیتھ کو یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ خواتین اپنی شکل و صورت کے موضوع پر اس قدر الجھنوں میں مبتلا تھیں کہ وہ لوگوں کے درمیان کھڑی ہو کر اپنی شکل و صورت اور وضع قطع کے متعلق تنقید سننے کی خواہش مند تھیں۔ اس کے چند بار مائیک پر آنے کے بعد خواتین نے ایڈیتھ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس نے ان پر احسان کیا ہے۔ خواتین کے اس اعتراف سے ایڈیتھ کی ہمت بندھ گئی اور وہ بے تکلف ہو گئی۔ وہ خواتین کو مشورہ دیتے ہوئے کہتی "ایسا لباس پہنیے جو زیادہ چست نہ ہو۔" یا کسی عورت کے دریافت کرنے پر اس سے کہتی "تمہارا سوٹ تو عمدہ ہے، لیکن یہ شور کرنے والے جوتے اور یہ زیورات مت پہنو۔"

لنک لیٹر نے ریڈیو پر بھی اپنا یہ ڈرامہ پیش کیا۔ پھر سات برس بعد اسے ٹیلی ویژن پر بھی دکھایا۔ ایڈیتھ سیاہ چشمہ لگا کر ٹیلی ویژن کے پروگرام میں شامل ہوئی، لیکن اپنے چشمے کے باوجود وہ اپنی جانب مرکوز کیمرے کے سامنے خود کو لاچار سا محسوس کرتی تھی۔ ٹیلی ویژن کے تماشائیوں نے اپنے خطوط میں ایڈیتھ کے کپڑوں پر، اس کی کارکردگی اور سیاہ چشمے پر نکتہ چینی کی۔ چنانچہ ایڈیتھ اس ٹیلی ویژن ڈرامے سے دست بردار ہونے کے لئے تیار ہو گئی، لیکن اسے ان تمام خواتین کا خیال آیا جو انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ اس کے مشوروں کی طالب تھیں، اور ان پر عمل کر رہی تھیں۔ چنانچہ اس نے ہلکے رنگ کا چشمہ لگایا اور اپنے انداز میں کچھ نرمی پیدا کی۔ اس طرح اس کی موثر اور متحرک شخصیت نمایاں ہو گئی۔ اس تبدیلی کے بعد جب وہ ٹیلی ویژن پر پیش ہوئی تو لاکھوں خواتین نے اس کے پروگرام کا لطف اٹھایا۔

ایڈیتھ ہیڈ کے مضامین، خواتین کے بہت سے رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔ اس طرح بھی اس کی آواز دور دور تک پہنچتی رہتی ہے۔ اپنے مضامین میں وہ ہمیشہ یہ استدلال پیش کرتی ہے کہ "اپنی طرز کے مطابق لباس پہنو۔" مثال میں وہ باربرا اسٹین وایک کا حوالہ دیتی ہے کہ وہ صبح، دوپہر یا شام کے لئے اپنے مخصوص طرز سے سلے ہوئے کپڑوں میں انتہائی حسین

نظر آتی ہے۔ لیکن اگر وہ ملاوی طرز کا سارنگ پہنے تو وہ اس پر زیب نہیں دے گا۔ اس کا مشورہ ہے کہ عورت ان لڑکیوں کو اپنی جسمانی اور ذہنی خصوصیات کے مطابق ہی کپڑے پہننے چاہئیں، اور دوسروں کی نقل نہیں کرنی چاہیے

جاسکا عمر خواتین کو نمایاں رنگ، چست بیلٹ اور وی کی شکل کے گلے والا لباس پہننے کا مشورہ دیتی ہے۔ ایسی عورتوں کو ڈھیلے ڈھالے اور زیادہ چست کپڑے نہیں پہننے چاہئیں۔ انتہائی دبلی پتلی عورتوں کو رنگین، چھوٹا گلا، چوڑے بیلٹ اور پوری آستینوں کا لباس پہننا چاہیے۔ ایڈتھ لڑکیوں کو ترغیب دلاتی ہے کہ انھیں خود اپنے کپڑے سینے سیکھنے چاہئیں کیونکہ سلائی سیکھنے کے بعد وہ خود اپنے سلے ہوئے کپڑوں کے عیب کو بھی دور کر سکتی ہیں۔

بعض اوقات لوگ ایڈتھ سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا فلمی ستاروں کے ساتھ کام کرتے ہوئے کبھی اسے بھی اداکاری کرنے کی خواہش ہوتی ہے؟ دراصل ایڈتھ نے فلمی دنیا کے ایک مختصر سے قصے پر ہی دکھاوا کر لیا تھا۔ ایک بار مشہور ہدایت کار جین نامی مین نے ایڈتھ سے درخواست کی کہ وہ فلم "دی گیلنٹ" کے ایک فیشن شو میں ستارے کا رول انجام دے۔ اس فلم میں جین کیرول کی دکان کی مالکہ کا رول کر رہی تھی۔

"میں ایکٹریس نہیں ہوں" ایڈتھ نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمھیں سکھا دوں گی۔"

ایڈتھ ریہرسل اور تمام ریہرسل پر پیش ہو چکی تھی۔ اس نے فیشن شو منعقد کیے تھے انسان میں تقریریں بھی کی تھیں۔ لیکن جب اس منظر کی فلم بندی کا وقت آیا تو وہ جیسے گھبرا سے مکالمے دہرانے لگی، گھبراتی گھبراتی سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر جیسے ہی وہ اپنی جانب کی طرف بڑھتے کیمرے کے سامنے کھڑی ہوئی تو مختلف افراد اسے مسلسل ہدایتیں دینے لگے۔ سر سیدھا، جھکاؤ ..... اس انداز سے دیکھو......

اس کے بعد اسے کبھی اداکاری نہیں کی، لیکن کبھی کبھی اسٹوڈیو کی دیگر سرگرمیوں میں حصہ لیتی رہی۔ اس نے اپنا شو پیش کرنے کے لیے بہت سے ڈیزائن بنائے اور اس کی آواز [illegible] نقل کرنے والی تھوڑے تھوڑے عرصہ بعد ریڈیو سے جنوبی امریکہ کے سننے والوں

کے لئے فیشن کے نکات بھی نشر کرتی رہی۔

ایڈتھ کے میز پر خطوط کا انبار لگا رہتا ہے۔ برسوں سے اس کا یہ دستور ہے کہ ہر خط کا جواب دینے کی کوشش کرتی ہے۔ لباس کے متعلق مشورہ طلب کرنے والے نوعمروں کو وہ لکھتی ہے کہ "عمر اور حد سے زیادہ پُرتصنع لوگوں کی نقل مت کرو۔ اپنی پوشاک کو سادہ رکھو۔ ایک موزوں لباس کو کئی بار استعمال کرو۔ ہر نئی تقریب کے لئے نئے لباس کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

جو لڑکیاں خاکہ نگاری کو پیشے کے طور پر اختیار کرنے کے بارے میں ایڈتھ سے مفید مشورے طلب کرتی ہیں، وہ ان سے کہتی ہے کہ پہلے اپنا مصوری، موسیقی، تاریخ اور ادب کا پس منظر بنانے کی کوشش کرو۔ وہ انھیں آگاہ کرتے ہوئے کہا کرتی ہے کہ، "یہ ایسا کام ہے جس پر تمھیں بہت عرصے تک محنت کرنی پڑے گی تم میں استقلال اور لوگوں کو سمجھنے کی صلاحیت ہونی چاہیئے۔" ایڈتھ نوعمروں کے لئے اپنے مشورے جاری رکھنے کی خواہش مند ہے اور خواتین کو کوئی پارٹی یا شادی کی تقریبات کے لئے لباس کے انتخاب میں مسلسل تعاون دینا چاہتی ہے، لیکن یہ مطالبات اب حد سے زیادہ بڑھ چکے ہیں۔

ایڈتھ اپنے کام کے دوران میں ہلکے رنگ کے کپڑے اور درمیانی یا نیچی ایڑی کے جوتے پہنتی ہے۔ اسے ایک ہی رنگ کے تین مختلف شیڈ پسند ہیں۔ مثلاً گہرے خاکی سوٹ کے ساتھ ہلکے کتئی اور بھورے رنگ کے لواحقات استعمال کرتی ہے۔ اس کے ساتھ سادگی، پرکاری اور نفاست اس کے لباس کی خصوصیت ہے۔ شام کے وقت وہ کڑھے ہوئے سوتی لباس اور سیاہ سمور کا حاشیہ لگی ہوئی چھوٹی سی جیکٹ پہن کر نکلتی ہے۔ اور اس لباس میں انتہائی حسین نظر آتی ہے۔ گھر میں پہننے کے لئے اسے میکسیکن طرز کے ہاتھ کے بنے ہوئے، شوخ زرد اور سرخ رنگ کے کپڑے پسند آتے ہیں۔

۱۹۵۴ء تک ایڈتھ ہیڈ کے اسٹوڈیو میں، اس کے ایک پرانے دوست بنگ کراسبی کے علاوہ بے شمار مرد آ چکے ہیں۔ بنگ کو ٹیپ ٹاپ سے نفرت ہے، لیکن بوب ہوپ کو نواب یا بادشاہ کی طرح بننے سنورنے میں مزہ آتا ہے، اور وہ اپنی نجی زندگی میں بھی اتنا ہی دلکش دکھائی دیتا ہے، جتنا فلموں میں نظر آتا ہے۔ ڈینی کے، ایڈتھ کے اسٹوڈیو میں داخل ہو کر کھانا کہاں ہے، کی رٹ لگاتا ہوا سیدھا ادیبہ کی جانب دوڑتا ہے۔ ایڈتھ نے آج تک جو دشوار ترین کام انجام دیئے ہیں، ان میں ڈینی کے

گلینڈا کو بکتر پہنانے کے لیے پھسلانے کا کام بھی شامل ہے۔ یہ زرہ بکتر 'دی کورٹ جیسٹر' کے رول کے لیے لچک دار ایلومینیم سے تیار کیا گیا تھا۔

چارلس لاٹن کی 'ہیرو' کے رول کے لیے تزئین کاری کے کام میں ایڈتھ کو بڑا مزا آیا تھا ایڈتھ اور ڈیل بریئر گھنٹوں کپڑے کی نفسیات پر گفتگو کرتے ہیں۔ ایڈتھ اسے عورت کے جسم، دماغ اور جذبات پر رنگوں کے اثرات کے بارے میں بتایا کرتی ہے، اور ڈیل بریئر اسے بتاتا ہے کہ مرد زیادہ اونچے یا نیچے کپڑے پسند نہیں کرتے، کیونکہ ایسے کپڑے پہن کر وہ تماشا بن جاتا ہے۔

ایڈتھ کی تیار کردہ پوشاکیں صرف فلموں تک ہی محدود نہیں ہیں۔ اس نے کورنیلیا اوٹس اسکنر کے کپڑوں کا ڈیزائن بنانے کے لیے نیو ہیون (کنیکٹیکٹ) کا بھی سفر کیا تھا۔ کورنیلیا کو یہ لباس پہن کر 'دی پلیژر آف ہز کمپنی' نامی ڈرامے میں پارٹ کرنا تھا۔ ڈورتھی کرسٹن نے جب ایڈتھ کا تیار کردہ لباس پہن کر سیاٹل میں 'ٹوسکا' نغمہ گایا تو 'دی اوپیرا نیوز' نے اس کے لباس کی خصوصیت کے ساتھ تعریف کی۔ خوبصورت ڈورتھی کے ڈرامے 'بھورے بالوں والی سیاہ فام عورت' کے رول کے لیے ایک خوبصورت لباس تیار کرتے ہوئے ایڈتھ نے ہیرے جڑے شاہی یاقوتی مخمل استعمال کی تھی۔ اس پوشاک کے اوپر اسی کپڑے کا بغیر آستین کی قبا بھی تھی۔ ایڈتھ نے کوانسن کے افتتاحی تقریبات کے سوٹ، ٹیلی ویژن پر پیش ہونے والوں کی پوشاک اور آسکر کی تقریب میں انعام پیش کرنے والوں کے لیے بھی خاص قسم کی پوشاک کے ڈیزائن بنائے، وہ شعوری طور پر ایسے فیشن ایجاد نہیں کرتی جو رواج پا جائیں تاہم اگر اس کی بنائی ہوئی کوئی چیز بے شمار خواتین کو پسند آتی ہے تو اسے خوشی ہوتی ہے۔ ایڈتھ لڑکیوں کو کسی ایسے دور از کار طرز کی نقالی کرتے ہوئے دیکھ کر نفرت کرتی ہے، جو کسی ایکٹریس کے رول کو نمایاں کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے، لیکن ان نقال لڑکیوں کے لئے مناسب نہیں ہوتا۔

ایڈتھ اب ان فلمی ستاروں کی طرح سے ہی مشہور ہو چکی ہے جن کے لئے وہ پوشاک کے ڈیزائن بناتی ہے۔ ایک بار جب ایڈتھ اور ڈیل جرمنی میں چھٹیاں گزارنے جا رہے تھے، ایک ہوائی اڈے پر اسے فوٹو گرافروں اور اخباری نمائندوں نے تین گھنٹے تک گھیرے رکھا۔ ایک نوجوان نامہ نگار لڑکی اس سے ایک بلا قیمت کا ڈیزائن لینا چاہتی تھی۔ اس نے کہا، "ایسا ڈیزائن بنا دیجیے جو تمام جرمن خواتین کے لئے مناسب ہو۔" بعد ازاں ہالینڈ میں تین سو پچاس خواتین نے اپنے ایک ترجمان کے ذریعہ ایڈتھ سے

رابطہ قائم کیا، اور اس کے متعلق اس سے مشورے لئے۔

ہر ملک کی خواتین کے بعض سوالات کا جواب دینے کے لئے ایڈیتھ نے ایک کتاب "ڈریس ڈکٹر" تحریر کی، جو ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا ایک باب اس موضوع پر ہے کہ "کپڑے آپ کے لئے کیا کرسکتے ہیں" اور ایک باب میں "آپ کپڑوں کے لئے کیا کرسکتی ہیں" کے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ایک دوسرے باب میں اس پر بحث ہے کہ مختلف تقریبات پر کیسا لباس پہننا چاہئے۔ ایڈیتھ کی یہ تصنیف ایک باصلاحیت اور حساس عورت کی سوانح عمری بھی ہے، جو ایک مستحکم ازدواجی زندگی کے ساتھ ایک شاندار مستقبل کی مالک ہے۔ ایڈیتھ کہا کرتی ہے کہ اپنی زندگی کے ڈرامے میں اس کا اپنا پارٹ دو رول ہے، دبل انہیں کی بیوی۔

یوں تو زندگی کے کسی شعبے میں کامیابی حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔ لیکن فنون لطیفہ میں کمال حاصل کرنا نہایت دشوار ہے۔ آخر ایڈیتھ ہیڈ اس بلندی تک کیونکر پہنچی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ رنگ، کپڑے اور طریق عمل کے معاملے میں اس کی زود حسی اس کے کام آئی۔ لیکن یہ سب کچھ تو کم از کم جزوی طور پر اس کی شدید تربیت کا ثمر ہیں۔ اس کی مستعدی، طرز عمل کی عمدگی، چیزوں کو بہتر طریقے سے ترتیب دینے کا سلیقہ، وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے ایڈیتھ ہیڈ کو ایک کامیاب تزئین منتظم کے علاوہ ایک فن کار، تاریخ داں اور بارسوخ بنایا ہے۔ شکل و صورت کے اعتبار سے معمولی، لیکن مؤثر شخصیت کی حامل ایڈیتھ بے انتہا طاقت کی حامل ہے، وہ اپنی کسی ایک کامیابی سے کبھی مطمئن نہیں ہوتی۔ بلکہ ثابت قدمی کے ساتھ مزید کامیابیاں حاصل کرنے کے لئے ارتقا کی راہوں پر گامزن رہتی ہے۔

ایڈیتھ کہا کرتی ہے کہ بہترین کپڑے محض اتفاق سے نہیں بن جاتے، بلکہ ان لوگوں سے مکمل ترین آگاہی کا نتیجہ ہوتے ہیں جن کے لئے لباس تیار کیا جاتا ہے۔ ایک تزئین کار کے روپ میں وہ سیاست دانوں کی طرح انسانی فطرت کی سوجھ بوجھ رکھتی ہے، اور پرانے فلمی اداکاروں کی طرح سے پوری آزادی کے ساتھ اس سوجھ بوجھ کو نئے چہروں کے لئے بھی بروئے کار لاتی ہے۔

ایک بار ایک تنک مزاج ایکٹریس آندھی کی رفتار سے ایڈیتھ کے اسٹوڈیو میں داخل ہوئی۔ ایڈیتھ نے اس سے کہا، "تمھارا انداز اور تمھارا مزاج بگڑتا جا رہا ہے۔" اس سے پہلے کہ ایکٹریس

پیش کر جو ایسا دیتی، ایڈتھ نے شفقت کے ساتھ اس کا رُخ ایک کرسی کی جانب موڑ دیا۔ پھر اس ایکٹریس اور اس کے فلم ساز کے مابین ہونے والے اختلاف کی روداد سننے کے بعد وہ فلم ساز سے ملنے گئی اور سمجھا بجھا کر اسے رضامند کر لیا۔ جس سے ایکٹریس اور فلم ساز کے درمیان اتحاد ہو گیا۔

اس ایکٹریس نے ایڈتھ سے کہا تھا "ایڈی! میں تم سے عشق کرتی ہوں"

ایڈتھ کا اسٹوڈیو ایک ایسا گوشۂ عافیت بن گیا ہے، جہاں لوگ بے تکلفی کے ساتھ کافی پینے کے لئے آجاتے ہیں، یا ایکٹریس ایسی گفتگو کے لئے پہنچ جاتی ہیں جو عورتوں کے درمیان ہی ہو سکتی ہے۔ ایک بار اولیویا ڈی ہیو ی لینڈ نے کہا تھا، "ایڈتھ کے پاس ذہانت بھی ہے اور مہارت بھی، لیکن اس کی مقبولیت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ جانتی ہے کہ فنکاروں کو کب تقویت دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

فلم کی فلک بوس دنیا سے تعلق رکھنے کے باوجود ایڈتھ نے حقائق سے اپنا تعلق برقرار رکھا ہے، اور سادگی اور خوش مذاقی کے احساس کو بھی جگائے ہوئے ہے۔ اس میں اب بھی کبھی کبھی اس لڑکی کی جھلک نظر آجاتی ہے، جس نے کانوں کے کیمپ میں پرورش پائی تھی۔ حال ہی میں ایک کرسمس کے موقع پر موٹر کے ذریعہ ایک ریگستانی خطے کا سفر شروع کرنے سے پہلے اس نے درختوں کی آرائش کا سامان خریدا، اور گرینڈ کے ایک چھوٹے سے درخت کو سجانے کے لئے راہ میں رک گئی۔

فلمی دنیا میں ہر روز فلم ساز، ڈائریکٹر، اور اداکار، اچھے خاصے آدمی کو بھی انتہائی دشوار الجھنوں میں مبتلا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ایڈتھ ہیڈ کے مزاج میں ایسا توازن اور ذہنی اطمینان موجود ہے، جو اسے ان سطحی پریشانیوں سے دور رکھتا ہے۔ شاید دوسرے امور کی طرح اس کی شہرت کا باعث وہ عشق ہے، جو اسے اپنے کام سے ہے۔ اپنے اس عشق کو وہ "دنیا کا سب سے زیادہ ہیجان انگیز کام" بتاتی ہے۔

(۸)

مارتھا بیری

پوسم ٹروٹ کی انواری خاتون

مارتھا بیری کے قائم کردہ اسکول روم کے قریب جارجیا میں واقع ہیں۔ ان اسکولوں کا رقبہ دنیا بھر کے اسکولوں میں سب سے زیادہ وسیع ہے۔ ان کی ابتدا الکرٹی[1] کے ایک چھوٹے سے کیبن میں ہوئی تھی۔ اس کیبن کا کل اثاثہ ایک گھوڑا، ایک بگھی اور رنزوڈ کا بنا ہوا ایک میلوڈیون[2] تھا۔ ان اسکولوں کے بانی کا ۱۹۴۲ء میں انتقال ہو چکا ہے، لیکن یہ اسکول آج بھی ان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں جو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

مارتھا بیری نے آرام و آسائش کی زندگی ترک کر کے ہزاروں پہاڑی بچوں کو غربت، جہالت اور تنہائی کے عذاب سے نجات دلائی تھی۔

مارتھا بیری ۱۸۶۶ء میں اوک ہل میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ بستی سرخ مٹی کے علاقے جارجیا میں دریائے اوسٹا نالہ سے بلندی پر واقع ہے۔ یہاں بیری کی پیدائش سے ایک برس قبل ہی خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا تھا۔ اس لڑائی میں اوک ہل کے غلاموں کے مکانات، غلہ بھرنے کے کوٹھے اور فصلیں تباہ ہو گئی تھیں۔ لیکن سفید ستونوں والا وہ عظیم الشان مکان جس کے ایک جانب شاہ بلوط کے پرشکوہ درخت اور کشادہ میدان تھے، یکسر تباہ ہونے سے بچ گیا تھا۔

خانہ جنگی ختم ہونے کے بعد کیپٹن تامس بیری رفتہ رفتہ اس عمارت اور اپنی تجارت کو دوبارہ درست حالت میں لے آئے تھے۔ مارتھا، اس کے دو بھائی اور پانچ بہنیں ...

۱؎ ایک قسم کی خوشبودار لکڑی۔ ۲؎ ایک ساز کا نام ہے۔

اور نقش ونگار سے آراستہ لکڑی کی چھراتی ہوئی بگھیوں کی سواری میں نشوونما پا رہی تھیں۔
مارتھا کی چھوٹے قد اور سیاہ آنکھوں والی ماں ٹی پارٹی، محفل رقص اور گھریلو دعوتوں کے موقع
پر ایک حسین میزبان نظر آتی تھی۔ مارتھا کے گھر ان تقریبات میں نوجوان اور بڑی عمر کے لوگ یکساں
ذوق وشوق کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔

یوں تو ٹامس بیری کے تمام بچے پر جوش تخیل کے حامی تھے۔ لیکن مارتھا جو سب سے
بڑے بچے سے چھوٹی تھی، طفلانہ شرارتوں میں اکثر سب سے بازی لے جاتی تھی۔ ایک بار روئی
کا ایک بہت بڑا بیوپاری اوک ہل آیا ہوا تھا۔ ان بچوں نے اس کے بستر میں ایک بکری کو بٹھا دیا
تھا۔ ایسے موقعوں پر بیری کے بچوں کو ان کی محبوب نیگرو دایہ ¹ خالہ مارتھا فری مین تنبیہ
کرتے ہوئے کہتی تھی "اے بیری، ایسا نہ کرو"

مارتھا شکل وصورت سے چھریرے بدن کی چھوٹی سی نواب زادی لگتی تھی اکثر اوقات وہ
اپنے بھائیوں کے ساتھ مچھلی اور پوسم کا شکار کھیلنے بھی جایا کرتی تھی۔ اپنے ارادوں اور اپنی مرضی
پر پختگی سے قائم رہنے والی مارتھا نے دور فاصلے پر واقع اسکول میں جانے سے انکار کر دیا تھا۔
چنانچہ کیپٹن بیری کو اس ٹیلے کے نیچے، جس پر ان کا مکان تھا، لکڑی کے کیبن کا ایک اسکول بنوانا
پڑا۔ مس ایڈا میک کلو بچوں کو پڑھانے کے لئے آتی تھی، اور اسی استانی سے مارتھا نے شاعری
اور نیچر کا ذوق حاصل کیا تھا۔

کیپٹن بیری نے مارتھا کو "ڈاون" نامی ایک تیز رفتار گھوڑی بھی لا دی تھی۔ اس گھوڑی کے
آنے کے بعد گھوڑا سواری اس کا پسندیدہ مشغلہ بن گیا۔ مارتھا کا دراز قد اور شفاف آنکھوں
والا باپ اسے اکثر اپنے ہمراہ پہاڑوں میں لے جاتا تھا۔ اس سفر میں جب وہ نیلے رنگ کی
ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں کے سامنے سے گزرتے تو مارتھا سوچنے لگتی تھی کہ ان شکستہ جھونپڑیوں
کے تنگ وتاریک کمروں میں رہنے میں کیا مزا آتا ہوگا۔ کچھ جھونپڑیوں میں تو اتنے بڑے بڑے
شگاف تھے جن میں سے اس کا کتا چھلانگ لگا کر گزر سکتا تھا۔ کیپٹن بیری کو ان فاقہ زدہ لوگوں
کی ضروریات کا احساس تھا، چنانچہ وہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ان لوگوں سے اظہار ہمدردی

¹ ایک قسم کا جانور جو پانی میں یا درختوں پر رہتا ہے

کرنے یا کوئی تحفہ دینے کے لئے شہر جاتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ جب مارتھا اپنے گھر لوٹی تو اس کے بالوں کا کوئی ربن یا کوٹ گم ہو گیا، کیونکہ یہ چیزیں وہ کسی بچے کو دے آتی تھی۔

جب مارتھا سولہ برس کی ہوئی تو والدین نے اسے پالٹی مور میں مادام لی فیبور کے فنشنگ اسکول میں داخل ہو جانے کی ترغیب دی مارتھا خوبصورت چہرے اور تیکھے نقوش کی مالک تھی، لیکن اس کی پرتصنع ہم جماعت لڑکیاں، پڑھنے بھونڈے بھوئے بھوئے سایوں میں سج کر اسکول آتی تھیں ان کے درمیان مارتھا اپنے لباس کو بد وضع محسوس کرنے لگی تھی۔ چنانچہ اس ماحول میں خود کو ناموزوں پاکر اس آفت سے چھٹکارا پانے کے لئے اس نے اپنے والدین کو لکھا کہ وہ گھر واپس آنا چاہتی ہے۔

جواب میں مارتھا کے باپ نے اسے تار سے مطلع کیا کہ، "اگر تم پڑھائی مکمل کر لو تو تمہیں فوراً واپس بلایا جائے گا۔ اس سے پہلے نہیں۔" تار بھیجنے کے بعد بیری نے مارتھا کو ایک تفصیلی خط بھی روانہ کیا جس میں اس بات پر زور دیا تھا کہ کوئی کام جب ایک بار شروع کیا جائے تو اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ضروری ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں کیپٹن بیری نے مادام لی فیبور سے نجی طور پر درخواست کی کہ وہ مارتھا کو اپنے ہمراہ خریداری کرانے لے جائیں۔ اس کے بعد مارتھا نے بہت سی سہیلیاں بنالیں۔ بعد ازاں مارتھا نے اپنی بہن جینی کو لکھا، "...... لیکن مجھ میں شہری زندگی کی خصوصیات موجود نہیں ہیں۔"

مارتھا کا تعلیمی سال ختم ہونے سے پہلے ہی کیپٹن بیری پر فالج کا حملہ ہو گیا۔ چنانچہ مارتھا فوراً گھر واپس پہنچ گئی۔ پھر باپ کے جزوی طور پر صحت یاب ہو جانے کے بعد بھی وہ اس کا دل بہلانے اور صحت افزا مقامات پر باپ کے ہمراہ جانے نیز تجارتی معاملات میں باپ سے تعاون کرنے کے لئے وہیں مقیم رہی۔

باپ کی خدمت کے علاوہ وہ انتہائی شوق کے ساتھ ان لطیفوں اور قہقہوں میں بھی شریک رہتی تھی جن سے تمام گھر گونج اٹھتا تھا۔ لڑکوں نے اس کی خوش اخلاقی اور حاضر جوابی کو بے حد پسند کیا تھا۔ جو لڑکے مارتھا سے دوستی کرنے کے خواہش مند تھے۔ ان میں اس کا ایک پسندیدہ لڑکا ورجینین بھی شامل تھا۔ ورجینین عمر میں مارتھا سے پانچ سال بڑا تھا۔ مارتھا کو ہر وقت اپنے باپ کی فکر لاحق رہتی تھی، جو ہر وقت پہیوں والی کرسی پر بیٹھا رہتا تھا۔ ورجینین کی

قربت سے اسے جو مسرت حاصل ہوتی تھی اس پر بھی اسی اضطراب کی گھٹا چھائی رہتی تھی۔ ایک رات مارتھا اپنے باپ کے ساتھ بیٹھی آتش دان میں اٹھنے والی لپٹوں کو تک رہی تھی۔ باپ نے اس سے کہا، "تم ہمیشہ ایک فرماں بردار بیٹی رہی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد مشرک پارک کی جنگلاتی زمین تم کو ورثے میں ملے"

اس پیش کش سے مارتھا کو کچھ مسرت ہوئی، لیکن باپ کی متانت سے رنجیدہ ہو کر اس نے کہا، "اوہ، ڈیڈی — تم ابھی تیس برس تک زندہ رہو گے"

لیکن کچھ ہی عرصہ بعد کیپٹن بیری کا انتقال ہو گیا۔ باپ کی وفات کے بعد مارتھا نے چھوٹے بھائی بہنوں کی بہت سی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اس کی تو یہ شکل اندھا ضرر دماغ ماں جائے اور کی دیکھ بھال کا کام کرنے لگی۔

گرمیوں میں مارتھا کو اس کی ایک سہیلی نے اپنے خاندان کے تفریحی پہاڑی مکان میں کچھ ہفتے گزارنے کے لئے مدعو کیا۔ پہاڑ پر یہ دونوں سہیلیاں دن دن بھر گھوڑ سواری کرتی تھیں۔ اس آوارہ گردی کے دوران میں مارتھا دبلے پتلے، پریشان حال سر اور کندھے جھکا کر چلنے والے اور اپنی عمر سے پہلے بوڑھے نظر آنے والے پہاڑی مرد عورتوں کو دیکھ کر انتہائی رنجیدہ ہو جاتی تھی۔ خستہ جھونپڑیوں کے دروازوں میں ان پہاڑی باشندوں کے زرد رو بچے، کتوں، سوروں اور مرغیوں کے ساتھ کھڑے ہوئے، خوف زدہ چہروں سے جھانکتے رہتے تھے۔

شروع شروع میں پہاڑی لوگوں نے انھیں قہر آلود نگاہوں سے دیکھا، لیکن مارتھا اور ایما ان سے دوستانہ انداز سے پیش آتی رہیں۔ چنانچہ پہاڑی لوگ ان سے گھل مل گئے اور کبھی کبھی انھیں کھوکھلی تونبیوں میں ٹھنڈا پانی یا ایسا کھانا بھی پیش کیا جس میں عام طور پر چربی اور گوشت اور مکئی کی روٹی شامل ہوتی تھی۔ یہ لوگ اس کھانے کو چولھے پر پکایا کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر وہ ان لڑکیوں کی شربت وغیرہ سے تواضع کرتے تھے۔ ان لوگوں کے بیشتر گھروں میں بستر کے طور پر صرف ایک غلیظ سی چٹائی ہوتی تھی جسے یہ ننگی زمین پر بچھا دیتے تھے۔ ہر ایک گھر میں قدیم طرز کی ایک بندوق دیوار پر لٹکی رہتی تھی۔

بعد میں ایما نے ایک پہاڑی لڑکے سے شادی کر لی۔ مارتھا جب اس سے ملنے گئی تو اس نے

دیکھا کہ ایما کی وضع قطع بالکل بدل گئی ہے۔ گھریلو کام کاج مثلاً کنوئیں سے پانی بھرنے اور چھت پر پوال ڈالنے کے کاموں نے ایما کو پہاڑی باشندوں جیسا ہی بنا دیا تھا۔ اپنی سہیلی کو اس عالم میں دیکھ کر مارتھا کو اپنی زندگی بے مقصد محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا کہ جب اس کے پڑوس میں رہنے والے پہاڑی باشندے اس قدر مفلسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو وہ عیش و آرام اور سماجی مصروفیات کے بے مقصد چکروں میں کیونکر گھری رہ سکتی ہے۔؟

اکثر و بیشتر مارتھا ان حقائق پر غور کرنے کے لئے لکڑی کے اس قدیم جھونپڑے میں خلوت نشین ہو جاتی تھی جو پہلے اس کی بازی گاہ تھا۔ وہاں بیٹھ کر وہ مطالعہ کرتی تھی یا اپنے خیالات میں مستغرق ہو جاتی تھی۔ یا پھر وہ قدیم روز وڈ کا بنا ہوا میلوڈیون اٹھا لیتی اور اس پر کوئی راگ بجانے لگتی تھی۔ ۱۹۰۰ء کی اپریل میں ایک گرم دوپہر کو مارتھا اس جھونپڑے میں بیٹھی مطالعہ کر رہی تھی اچانک اسے محسوس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے کتاب سے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ تین غلیظ چہروں والے لڑکے کھڑکی میں سے جھانک رہے تھے۔

مارتھا نے ان سے اندر آنے کے لئے اصرار کیا تو انھوں نے یہ حساس ہرن کی طرح چوکڑی بھری لیکن اس کے متواتر اصرار کرنے پر وہ ننگے پیر اور پیوند لگے چیتھڑے پہنے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔

مارتھا کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لڑکے کبھی اتوار کی اسکول میں بھی نہیں گئے تو اس نے ان سے پوچھا "تم بائبل کی کچھ کہانیاں سننا چاہتے ہو؟"

"کیا وہ کہانیاں اس کتاب میں ہیں؟" ایک لڑکے نے حیرت سے پوچھا۔

مارتھا سے ڈینیل اور ڈیوڈ کے زندہ بچ جانے کی کہانی سن کر یہ لڑکے حیرت زدہ رہ گئے۔ جھٹ پٹا ہو جانے پر مارتھا نے خالہ مارتھ کے پاس سے اڑائے ہوئے ادرک کے کیک ان لڑکوں کو پیش کئے اور انھیں رخصت کر دیا۔

دوسری اتوار کو یہ لڑکے اپنی بہنوں کو بھی ساتھ لے آئے۔ لڑکیاں لڑکوں سے زیادہ ہیبت زدہ تھیں۔ تاہم ان سب کی آنکھوں سے گہرائی اور ذہانت جھلک رہی تھی۔ مارتھا نے ان بچوں کو منھ ہاتھ دھونے پر آمادہ کیا، اور پھر انھیں بائبل کی کہانیاں سنائیں۔

کچھ دن بعد بچوں کے ماں باپ بھی آنے لگے۔ مارتھا نے میلوڈیون کے سامنے بیٹھ کر

انھیں مناجات سکھائی اور کہانیاں سنائیں۔ بعد ازاں اس کی تعلیم کا یہ سلسلہ اتنا مقبول ہو گیا کہ کیبن اور صحن پہاڑی طالب علموں سے کھچا کھچ بھرنے لگے اور اس نے اپنے اس اسکول کو پوسم ٹروٹ کے ایک قدیم مسمار شدہ کلیسا میں منتقل کر دیا پھر مارتھا نے صنوبر کے تختوں سے بنے ہوئے ویران جھونپڑوں میں رہنے والے خاندانوں کو آوارگی سے اسکول میں شرکت کے لئے آمادہ کرنے کی غرض سے پہاڑی علاقے کے چکر لگائے اور گھر گھر جا کر لوگوں کو ذاتی طور سے اسکول میں آنے کی دعوت دی۔ جیسے ہی وہ کسی جھونپڑے کے پاس پہنچتی بچے چلا اٹھتے "پوسم ٹروٹ کی اتواری خاتون آرہی ہے۔"

مارتھا کے محبوب ورجینین کو اس کا اتواری اسکول پر وقت صرف کرنا پسند نہیں تھا، چنانچہ اس نے مارتھا سے صاف کہدیا، "مجھے توقع ہے کہ تم شادی کے بعد پہاڑی لوگوں کے لئے اپنے ان منصوبوں کو ختم کر دو گی"۔ مارتھا نے ان لوگوں کی درماندگی کی وضاحت کرنے کی کوشش کی، اور کہا کہ جب وہ خود اپنی مرضی کی مصروفیات جاری رکھتا ہے تو کیا اسے اپنا کام جاری رکھنے کا حق نہیں ہے؟ دونوں کے درمیان تند و ترش گفتگو ہوئی۔ ورجینین چاہتا تھا کہ مارتھا یا تو خود کو اس کے لئے وقف کر دے یا پھر قطع تعلق کر لے۔

ورجینین سے اسے قطع تعلق کرنا پڑا۔ اور جدائی کے اس صدمے سے خود کو آزاد رکھنے کے لئے مارتھا کرسمس کی تقریب کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ یہ تقریب وہ ان بچوں اور بڑوں کے لئے کرنا چاہتی تھی، جنھوں نے کبھی سانتا یا کرسمس شجر نہیں دیکھا تھا۔ اس پارٹی میں مارتھا نے جتنے لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ اس سے زیادہ تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ تقریب کے دوران میں سانتا کلاز کی ڈاڑھی کو ایک موم بتی سے آگ لگ گئی۔ مارتھا کے معاونین نے اس کو بارش کے پانی سے بھرے ہوئے ایک ٹب میں ڈبو کر بجھا دیا۔ اور مارتھا جلدی سے اسکول کی اوپری منزل سے دوسرے تحفے وغیرہ دکھانے کے لئے آئی۔ غرض یہ کہ تمام شرکائے انتہائی خوش گوار وقت گزارا۔

اس تقریب پر مارتھا نے اپنی وہ رقم بھی خرچ کر دی جو اس نے اپنی پسند کے ایک خوبصورت لباس کے لئے بچا کر رکھی تھی، اور اس تقریب کی وجہ سے ہی وہ اٹلانٹا میں چھٹیاں گزارنے کے لئے نہیں جا سکی۔ پارٹی کے خاتمے پر جب اس کے مہمان رخصت ہو رہے تھے۔ اس وقت مارتھا کو

اپنے لباس اور اثاثا کا خیال آرہا تھا۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ زندگی میں اس سے زیادہ طمانیت بخش کرسمس اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

کرسمس کے بعد مارتھا نے اپنی بہن فرانسس کے تعاون سے کچھ اور اتواری اسکول قائم کئے اسے اسکول میں آنے والے بدسلیقہ اور فریک بچوں کی جہالت کا بار بار خیال آتا تھا۔ ان کی آنکھوں سے ذہانت جھلکتی تھی۔ لیکن ان میں سے بہت کم بچے ایسے تھے جنھیں اسکول جانے کا موقع ملا تھا اور پھر جنھیں اسکولوں میں جانا نصیب بھی ہوا ان کے اسکولوں کی عمارتیں شکستہ تھیں، استاد پوری طرح تربیت یافتہ نہیں تھے اور جو مضامین انھیں پڑھائے گئے تھے وہ ناقابل عمل تھے۔

مارتھا نے اپنے والد کی عطا کردہ زمین پر معمولی سا ایک کمرے والا اسکول بنانے کے لئے اتواری اسکول کے بچوں میں سے مزدوروں کی ایک جماعت بنائی اور ان کی سربراہی کے لئے ایک بڑھئی ملازم رکھ لیا۔ اس نے طے کیا کہ اسکول میں آنے والے بچوں کو وہی مضامین پڑھانے گی جو عمدہ طریقے سے ان کے کام آسکیں۔ اگرچہ کلاس کو پڑھانے کا اسے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لیکن اس میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو ایک معلمہ کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اس میں برداشت کا مادہ، خوش مذاقی اور اپنے طالب علموں سے حقیقی لگاؤ کی صفات موجود تھیں۔

لیکن اپنی ان خصوصیات کے باوجود مارتھا کو شروع شروع میں جان توڑ کوشش کرنی پڑی۔ بیشتر بچے ایسے تھے جو نہ پڑھ سکتے تھے اور نہ وہ اعداد کو جمع کر سکتے تھے۔ لڑکیاں بے حد شرمیلی تھیں بڑی عمر کے لڑکوں کو جم کر بیٹھنے کی عادت نہیں تھی۔ چنانچہ وہ اپنی اکتاہٹ کا اظہار کرنے کے لئے قہقہے لگاتے، ہنسی مذاق کرتے اور تمباکو چبانے لگتے تھے۔ مارتھا عادتاً انتہائی خوش خلق تھی۔ لیکن لڑکوں کی اس روش سے اسے تجربہ ہوا کہ طالب علموں کو قابل پسند معیار کے مطابق رکھنے کے لئے ان کے ساتھ سختی برتنی چاہئے۔

بعد ازاں مارتھا نے مقامی اسکول بورڈ کے تعاون اور مزید معلموں کی مدد سے تین اسکول اور قائم کر دیے۔ اپنے کاموں میں تعاون کے لئے اس نے مس ایلزبیتھ بریوسٹر کی خدمات حاصل کیں۔ ایلزبیتھ بریوسٹر لیلینڈ اسٹین فورڈ کی سند یافتہ تھی اور اسے ان پڑھ بچوں میں تقریباً مارتھا کی طرح ہی دلچسپی رکھتی تھی۔

لیکن یہ دونوں عورتیں انتہائی کاوشوں کے باوجود اپنی توقع کے مطابق کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ اکثر و بیشتر بچے راستوں کے خراب ہوجانے یا ناکافی کپڑوں کی وجہ سے یا اپنے گھریلو کام مثلاً سور وغیرہ ذبح کرنے کے لئے اسکول سے غیر حاضر رہتے تھے۔ ان دنوں جارجیا کے اسکولوں میں چھ ماہ کی چھٹیوں کا رواج تھا۔ چنانچہ جب مارتھا کے اسکولوں میں بھی چھ ماہ کی چھٹیاں ہوئیں تو طالبات نے جو کچھ سیکھا تھا اس کا بیشتر حصہ بھلا بیٹھے۔

پھر مارتھا نے ایک ایسے بورڈنگ اسکول کا خواب دیکھنا شروع کر دیا، جہاں لڑکوں کو ان کی تعلیم مکمل ہونے تک مناسب ماحول میں رکھا جا سکے اور انھیں یہ تعلیم دی جا سکے کہ پہاڑوں کی بنجر زمین پر بہترین فصلیں کیسے اگائی جا سکتی ہیں۔ جب اس نے اس منصوبے کے متعلق اپنے گھر والوں کو بتایا تو انھوں نے سخت اختلاف کیا۔ مسز بیری نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا، "اس طرح تو تم اپنے آپ کو ختم کر ڈالو گی۔"

"تمھاری شادی کا کیا ہوگا؟" اس کی ایک بہن نے دریافت کیا۔

"پانچ، چھ لڑکوں میں سے کوئی تم ہی منتخب کر دینا" مارتھا نے جواب دیا۔

پھر مارتھا اپنے موٹے تازے معتبر قانونی جج مورینہ رائٹ کے پاس پہنچی تاکہ اپنی جائداد اسکول کے نام کرانے کے لئے دستاویز تیار کرا سکے۔ لیکن مورینہ نے بھی اس کی مخالفت کی۔ مارتھا نے انتہائی جوش و خروش اور خوش آئند توقعات کے ساتھ اس سے کہا، "میری زمین سے اب جیسی فصل اُگتی ہے میں اس سے بہتر فصل اگا لوں گی۔"

مارتھا نے اس نئے اسکول کے لئے ایک تعلیمی سال کی فیس پچیس ڈالر مقرر کی جس میں کھانا بھی شامل تھا۔ پھر وہ چودہ سال اور اس سے بڑی عمر کے بچوں کو بھرتی کرنے کے لئے نکل پڑی۔ جو والدین اپنے بچوں کو اسکول میں بھیجنے کے لئے راضی نہ ہوتے، مارتھا ان سے کہتی تھی کہ "اگر تمھارا لڑکا فیس نہیں دے سکتا تو میں اس کی کفالت کے لئے اسے کوئی کام دے دوں گی۔"

۱۴ جنوری ۱۹۰۲ء کو مارتھا نے لڑکوں کا صنعتی اسکول بھی کھول دیا جو بعد میں بیری اسکول کے نام سے مشہور ہوا۔ مارتھا کے خاندان نے اسے اعتراضات سے تنگ کر رکھا تھا، چنانچہ وہ اپنی ہم کار ایلزبیتھ بریور کے ساتھ لڑکوں کے سکونتی ہال میں منتقل ہوگئی۔ اس ہال کو بیری کے

گھر سے لائی ہوئی اور دوستوں کی پیش کردہ متفرق چیزوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ ایک دوست نے اس ہال کے لئے ایک عمدہ سا پیانو پیش کیا تھا۔

پہلے پہل مارتھا نے باورچیوں کی نگرانی کا کام سنبھالا اور عام طور پر مکئی اور جئی کے دلیوں جیسی غذائیں تیار کرائیں۔ کھاتے وقت وہ دسترخوان کے آداب کی نگرانی کرتی تھی اور غلط انگریزی بولنے والوں کی اصلاح بھی کرتی جاتی تھی۔

رفتہ رفتہ مارتھا نے اپنی کوششوں سے شائستگی کا ایک ضابطہ بنا دیا۔ چولہا جلانے والوں کے کام کی ابتدا صبح ساڑھے چار بجے اور خچروں کو چارہ دینے والوں کے کام کی شروعات پانچ بجے ہو جاتی تھی۔ چھ بجے سب لڑکے اٹھ جاتے اور بستر لپیٹ کر کمرہ صاف کرنے کے بعد ساڑھے چھ بجے ناشتے پر حاضر ہو جاتے تھے۔ کلاسیں سات بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک ہوتی تھیں۔ اس دوران میں کلیسا میں حاضری اور دوپہر کا کھانا بھی ہو جاتا تھا۔ پھر اس کے بعد مزید کلاسیں اور متفرق کام ہوتے تھے۔

جو لڑکے فیس دینے کے قابل تھے انہیں بھی روزانہ دو گھنٹے باورچی خانے کا کام، صفائی، دھلائی، منجھائی، لکڑی کی کٹائی اور گائے کا دودھ دوہنے کا کام کرنا پڑتا تھا۔ مارتھا لڑکوں سے کہا کرتی تھی کہ جائز مشقت سے اکتانا نہیں چاہئے۔ شام کے وقت لڑکے آتش دان کے گرد جمع ہو جاتے، جہاں مارتھا اور ایلز بیتھ ان کو سبق یاد کراتیں اور بائبل کی آیتوں کے معنی سمجھاتی تھیں۔

مارتھا ہر طالب علم کی نجی مسرت اور غم میں شریک رہتی تھی اس لئے وہ اس کی بے حد عزت کرتے تھے۔ اس کی خوش مزاجی نغموں اور کھیلوں کی سربراہی نیز داستان گوئی کی محفلوں کے لئے ایک بیش بہا سرمایہ ثابت ہوئی۔ ہر اتوار کو مارتھا لڑکوں کے کوٹوں کے بٹن اور جوتوں کے پالش کا جائزہ لیتی تھی، اس کے بعد دو میل کا سفر پیدل طے کر کے روم کے کلیسا میں عبادت کے لئے جایا کرتے تھے۔

بہار کے موسم میں لڑکے باغبانی اور کھیتی کرتے تھے اور پھلوں کے درختوں کو لگاتے تھے۔ اسکول میں داخلہ لینے کے لئے لڑکے زیادہ سے زیادہ چلے آ رہے تھے۔ بہت سے لڑکے اپنا تمام مال و متاع کاغذ کے تھیلوں میں بھر کر اپنے گھر والوں سے یہ کہہ کر چل پڑتے تھے کہ "تعلیم حاصل کرنے جا رہے ہیں" کوئی اپنے سامنے اپنی طرح کمزور اور کیچڑ میں لت پت سور لے کر آتا تھا اور کوئی بیلوں کا جوڑا لئے چلا آتا تھا۔

مارتھا نے طالب علموں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھ کر پرجوش طریقے پر اپنے آپ سے کہا کہ اس قسم کے لڑکوں کے لئے اسکول کو مزید ترقی یافتہ ہونا چاہئے تھا۔ تاہم بعض اوقات وہ یہ بھی سوچتی تھی کہ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایک بار تمام طلبا کو خسرہ نکل آیا۔ چنانچہ تمام طلبا کو تیمارداری کے لئے ایک ایسے بڑے کمرے میں منتقل کرنا پڑا جس میں نہ بجلی تھی اور نہ پانی تھا۔ ان دشوار حالات پر قابو پانے کے لئے مارتھا نے ہر امکانی طریقے سے کفایت شعاری کی۔ چادروں کو رفو کر کے قابل استعمال بنایا اور صابن بنانے کے لئے چربی پگھلائی اور اسکول ہی میں صابن تیار کیا۔ لیکن اس میانہ روی کے باوجود آمدنی سے زیادہ بڑھتے ہوئے اخراجات نے اسے پریشان کر دیا۔

مارتھا نے خالہ مارتھا کو اپنا ہمدرد سمجھتے ہوئے جب تمام حالات اسے بتائے تو انھوں نے جھڑکتے ہوئے کہا، "تم بے ہودہ لڑکوں پر اپنی زندگی برباد کر رہی ہو۔ خود کو اپنا گھر بسانے میں صرف کیوں نہیں کرتیں؟"

اسکول کے لئے چندہ جمع کرنے کی غرض سے مارتھا نیویارک چلی آئی۔ یہاں پہلی بار اسے بے حد تنہائی محسوس ہوئی۔ اس سے پہلے وہ کسی بڑے شہر میں تنہا نہیں رہی تھی اور نہ اس نے کبھی لوگوں کے مجمع میں تقریر کی تھی۔ نیویارک میں اس نے ایک مکان کی بالائی منزل پر ایک سستا سا کمرہ کرائے پر لیا اس کے بالٹی مور کے سابق ہم جماعتوں نے اسے ان اشخاص کے پتے بتائے تھے جو اسے کچھ تعاون کر سکتا تھا۔ مارتھا نے سینکڑوں لوگوں کو خطوط لکھے، اور جہاں کہیں لوگ اس کی بات سننے کے خواہش مند تھے وہاں اس نے تقریریں بھی کیں۔ وہ ان تقریروں میں جھجکے بغیر اپنی اثر انگیز آواز سے پہاڑی بچوں کی کیفیت بیان کرتی تھی۔ مارتھا کی پرخلوص اور دلفریب شخصیت کے باعث بہت سے لوگ اس کے دوست ہو گئے۔ اسے جو چندے موصول ہوئے وہ معمولی رقم کے تھے، لیکن وال اسٹریٹ کے ایک سرمایہ دار، آر فلٹن کٹنگ نے اسے پانچ سو ڈالر کا ایک چیک پیش کیا۔ چنانچہ کرسمس سے کچھ ہی دن قبل وہ واپس آ گئی۔ اس سفر میں اس نے ایک ہزار ڈالر سے کم سرمایہ جمع کیا تھا لیکن اس رقم سے فوری ضروریات پوری ہو سکتی تھیں۔

۱۹۰۵ء کے موسم بہار میں ایک رات اسے "آگ، آگ" کی آوازوں نے بیدار کر دیا۔ یہ ایک نئی مصیبت تھی۔

جلدی جلدی کوٹ اور جوتے پہن کر وہ باہر کی جانب لپکی۔ اس نے دیکھا کہ اسکول کی چھت سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ لڑکے اپنے چہروں کو بچاتے ہوئے، اسکول کی عمارت کے اندر داخل ہو کر

کرسیاں، کتابیں اور ڈیسک کھینچ کھینچ کر لا رہے تھے۔ اس طرح لڑکوں نے بیری اسکول کا جو تھوڑا بہت اثاثہ بچایا تھا وہ دھوئیں سے بالکل بے کار ہو گیا۔

دوسرے دن کلاسیں اس ہال میں لگیں جو اب تک کھانے اور کھانے کا کمرہ تھا۔ پرانی بلڈنگ کی دوبارہ تعمیر کے لئے لڑکوں نے مقررہ وقت کے علاوہ بھی تعمیری کام میں وقت لگایا، لیکن اس عمارت میں کلاسیں شروع کرنے کے لئے اسے بروقت تیار نہیں کر سکے۔ اس واقعہ کے کئی دن بعد ایک دفعہ آسمان پر بادل گھر آئے اور غضب کی موسلا دھار بارش ہوئی اور سر چھپانے کی جگہ ایک لازمی اور شدید ضرورت بن گئی۔ مارتھا، روم میں احیائے مذہب کی تحریک کے لئے کام کرنے والے ایک انجیلی مبلغ کی خوشامد کر کے اس سے ایک بڑا لیکن گھسا پٹا شامیانہ مانگ لائی۔ اس شامیانے کی ہر درز سے پانی ٹپکتا تھا۔ اسی شامیانے میں سینئر اسکالرز کو سند دیئے جانے کی تقریب منعقد ہوئی۔ جب اسکول کا ایک سینئر طالب علم، گورڈن گبسون الوداعی تقریر کے لئے کھڑا ہوا تو اسے ایک ہاتھ میں چھتری سنبھالنی پڑی، کیونکہ شامیانے میں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اس تقریب میں آئے ہوئے مرد اور عورتیں اپنے منہ میں تمباکو یا نسوار دبائے خاموش بیٹھے تھے۔ مارتھا کو ان کے چہروں پر مسرت کی کوئی جھلک نظر نہیں آئی، بلکہ ان سے رعب دار خود پسندی جھلک رہی تھی۔ اس تقریب میں اٹلانٹک سٹی کے مارٹن لوتھر روف کو تقریر کرنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ انہوں نے اس تقریب کے خاتمے پر اپنی تقریر میں کہا تھا "میں جن اسکولوں کو جانتا ہوں ان میں یہ عظیم ترین اسکول ہے۔"

۱۹۰۶ء میں مجلس قانون ساز کے ممبروں اور ماہرین تعلیم بیری اسکول کی جانب متوجہ ہوئے اور کسی حد تک اس کے طریق کار کی تقلید بھی کرنے لگے۔ ایک بار مارتھا نیویارک سے واپس آتے ہوئے چٹانوگا میں ٹھہر گئی تھی۔ یہاں اسے تار کے ذریعے اطلاع ملی کہ ملک بھر میں تعلیمی کارناموں کے لئے مشہور، رابرٹ سی اوگڈن اور دیگر ممتاز شخصیتوں کی ایک جماعت اسکول کا معائنہ کرنے کے لئے آنے والی ہے۔

مارتھا نے ٹیکسی لی اور اسٹیشن کی جانب لپکی۔ اس نے اسٹیشن کے ایجنٹ سے کہا، "مجھے معلوم ہے آج روم کے لئے کوئی اسٹیشن گاڑی نہیں جاتی، لیکن میرا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔"

اسٹیشن ایجنٹ نے اس سے کہا، "دیکھی پٹری پر ایک پرانا انجن کھڑا ہے، لیکن اس میں آپ

سفر کرنا پسند نہیں کرے گی۔

ایجنٹ نے انجن ڈرائیور اور فائرمین کا جو معاوضہ بتایا اس پر مارتھا کے اوسان خطا ہوگئے، لیکن اس نے انجن کرائے پر لے ہی لیا اور اسی پر سفر شروع کر دیا۔ راستے میں دھوئیں کی کالونچ اور راکھ سے اس کے بال، چہرہ اور کپڑے سیاہ ہوگئے تھے۔ لیکن اسکول میں آنے والوں نے اسکول دیکھ کر جس جوش و خروش اور مسرت کا اظہار کیا اس کے مقابلے میں سفر خرچ اور سفر کی پریشانی اسے غیر منطقی اور بے ربط معلوم ہوئی۔

جب صدر امریکہ تھیوڈور روز ویلٹ نے مارتھا کے اسکول سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تو مارتھا ان سے ملنے کے لئے واشنگٹن روانہ ہوگئی۔ ایک ملاقات کے دوران میں انھوں نے مارتھا سے اپنے پرجوش تاثرات کا اظہار کیا، اور دوسرے دن وہائٹ ہاؤس کے ایک ڈنر میں اسے ان لوگوں سے متعارف کرایا جو اس کے مقاصد میں معاون ہو سکتے تھے۔ مارتھا کو رخصت کرتے ہوئے صدر روز ویلٹ نے فرمایا کہ، "صدارت کے منصب سے الگ ہونے کے بعد میں تمھارا اسکول دیکھنے آؤں گا"

واشنگٹن سے مارتھا نیویارک کے لئے روانہ ہوگئی۔ وہاں اس نے فولاد کے ایک بڑے بیوپاری اینڈریو کارنیگی سے ملاقات کی کئی لاحاصل کوششیں کیں۔ بالآخر اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہوگئی۔ اینڈریو کارنیگی نے مارتھا سے وعدہ کیا کہ اگر وہ پچیس ہزار ڈالر کی رقم اپنے طور پر جمع کرنے میں کامیاب ہو جائے گی تو اتنی ہی رقم وہ بھی بطور عطیہ پیش کرے گا۔ اس پیش کش سے اسے خوشی تو ہوئی، لیکن اتنی رقم جمع کرنے کے خیال سے اس پر دہشت غالب آگئی۔

یہ کام تو ناقابل تکمیل نظر آتا تھا۔ لیکن مارتھا اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ان سوداگروں کی تلاش میں سفید پوش سڑکوں پر میلوں پیدل گھستی رہی، جو ۱۹۰۷ء کی مالی دہشت کے باعث اپنا سرمایہ بچا کر رکھ رہے تھے۔ اس مہم کے دوران میں اس پر ٹھنڈ کا اثر ہوگیا اور سستا کھانا کھانے کے باعث اس کا وزن گھٹ گیا۔ اس سال کرسمس کے موقع پر وہ نیویارک کے ایک کمرے میں انتہائی رنج و غم کے عالم میں بستر علالت پر پڑی رہی۔

اس نے کرسمس کے دوسرے دن اپنی سرگرانی اور کمزوری کے باوجود خواتین کے ایک بڑے مجمع کو خطاب کیا۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا کہ، "اگر اسکول بند ہوگیا تو تعلیم حاصل کرنے کے لئے

تڑپنے والے لڑکوں کو علم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔" جیسے ہی اس نے تقریر ختم کی، اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

جب وہ ہوش میں آئی تو اس نے خود کو ایک انجان کمرے میں پایا اور پرشفقت چہرے والی ایک خاتون نے اس سے مخاطب ہو کر کہا، "آپ کو کاریگی کے عطیے کے مطابق جو رقم درکار ہے، اس کی باقی کی تم پوری کر رہے ہیں۔"

مارتھا نے ڈوبتی ہوئی آواز سے پوچھا، "تمام کی تمام رقم؟"

"ہاں" اس خاتون نے جواب دیا۔

مارتھا جب اسکول واپس پہنچی تو اس نے لڑکوں کو تمام واقعہ سنایا اور کہا کہ "خاتین کی اس گراں قدر پیشکش پر میں دوبارہ تقریباً بے ہوش ہو گئی تھی۔"

کچھ عرصہ سے مارتھا اپنے اسکول میں لڑکیوں کو بھی شامل کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ لڑکیوں کو تعلیم دینے کی ضرورت ہے کہ گھر کا انتظام کس طرح کیا جائے۔ کھانا کیسے پکایا جائے اور کیا پکایا جائے۔ پہاڑی باشندے خصوصی سور اور مکئی کی روٹی کی جو خوراک استعمال کرتے تھے اس سے انھیں ویلان معدہ (پیٹ کے کیڑے) اور ایک قسم کی ایسی بیماری ہو جاتی تھی جس میں جسم پیلا پڑ جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بیری اسکول سے نئے معیار کے مطابق تعلیم حاصل کر لینے والے نوجوان ان پڑھ لڑکیوں سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ نیز لڑکیوں نے مارتھا سے سیکھا تھا کہ انھیں اپنی بہنوں کو بھی تعلیم دلانی چاہیے اور ان کے اپنے اسکول سے کچھ فاصلے پر لڑکیوں کے لئے بھی اسکول قائم ہونا چاہیے۔

لڑکیوں کا اسکول کھولنے سے قبل مارتھا نے البرٹا پیٹرسن کو اپنے یہاں بلایا۔ البرٹا کو اسکول میں داخل ہونے والی لڑکیوں کی مدد کے لئے شعبۂ نسواں کے صدر کی حیثیت سے کام کرنا تھا۔ پھر یہ نو عمر لڑکیوں کو بھرتی کرنے کے لئے مشکل کھڑی ہوئیں۔ پہاڑیوں کی ایک ہری پر انھیں سولہ سال کی ایک خوبصورت اور ذہین لڑکی ملی جس کا نام ڈورا مے تھا۔ یہ لڑکی ہر عمر کے بچوں کی نگہداشت کا کام کرتی تھی اور اس کا باپ چوری چھپے ناجائز شراب کشید کرنے کا کام کرتا تھا۔

ڈورا نے مارتھا اور البرٹا پیٹرسن کو بتایا کہ "میرے والدین شراب نوشی نہیں کرتے، لیکن

چوری چھپے کشید کی ہوئی شراب سے ہمیں فلاں کے لئے زیادہ رقم ملتی ہے۔"

فقدا کی ماں نے اس کی بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "جب دوسرے لوگ شراب بنانے میں مصروف ہوتے ہیں، میں بہ آواز بلند بائبل پڑھتی رہتی ہوں"

مارتھا اور مسز پیٹرسن ڈیہرامے کو بیری اسکول میں داخل کرنے کے لئے رضامند کر کے وہاں سے روانہ ہوئیں۔

بہت سی پہاڑی لڑکیوں میں جو روزانہ کھانا پکانے، ہل چلانے اور بچوں کی رکھوالی کا کام کرتی تھیں، مارتھا کو فن کار، معلمہ یا ماہر نباتیات بننے کی تمام تر صلاحیتیں نظر آئیں۔

۱۹۰۹ء میں یوم تشکر[۱] کے موقع پر مارتھا بیری کے گرلز سکول کا افتتاح ہوا۔ اس اسکول کے لئے لڑکوں کے اسکول کے مطابق ہی ضابطہ کار بنایا گیا تھا۔ لیکن کھیتی باڑی، دودھ دوہنے اور فرنیچر بنانے کے کاموں کی جگہ کھانا پکانے کا کام، صفائی ستھرائی اور ٹین کے ڈبوں میں پھل اور گوشت محفوظ کرنے کا کام شامل کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں خود مارتھا کی فطری شرافت اور شائستگی لڑکیوں کے لئے ایک مشعل راہ تھی۔ مارتھا لڑکیوں کو چائے کی دعوت دیتی رہتی تھی تاکہ لڑکیاں معاشرتی زندگی کی نفاستوں سے واقف ہو سکیں۔ پھر جب اسکول میں عملی مشقوں کے لئے کمرے اور مہمان خانے بن گئے تو لڑکیوں نے میزبانوں کے فرائض بھی انجام دینے سیکھ لئے۔

تفریح کے لئے لڑکیاں عوامی کھیلوں، تیراکی، کشتی رانی اور پکنک میں شریک ہوتی تھیں۔ لیکن ایسے موقعوں پر مارتھا کو انتہائی محتاط رہنا پڑتا تھا کیونکہ لڑکیوں کے والدین نے ہدایت کر رکھی تھی کہ "لڑکیاں نہ لڑکوں کے ساتھ رقص میں شریک ہوں، نہ ایک دوسرے سے ملیں اور نہ آپس میں ایک دوسرے سے تعلقات بڑھائیں"

مارتھا حسن کی پرستار تھی۔ اس نے اپنے طالب علموں میں بھی یہی جذبہ ابھارنے کے لئے ہر امکانی کام کیا۔ لڑکیوں کو دستکاری سکھانے کے لئے ایک اتالیق ملازم رکھا اور لڑکیوں کو لڑکوں کے بنائے ہوئے کرگھوں پر کھیس، شال، پلنگ کی چادریں اور قمیصیں بنانا سکھانے کے لئے ان پہاڑی عورتوں کو ملازم رکھا جن کی بنائی ہوئی چیزیں اسے بے حد پسند تھیں۔ لڑکیاں اسکول میں پلنے والی انگورا بکریوں

---

[۱] امریکہ تشکر کا دن جو امریکہ میں نومبر کی آخری جمعرات کو منایا جاتا ہے۔

کے گلے سے حاصل کردہ اون کو دھونے، صاف کرنے، رنگنے اور کاتنے کا بھی کام کرتی تھیں۔

استادوں کا ایک بڑا اسٹاف رکھنا ایک مستقل مسئلہ تھا۔ اسکول میں آنے والے اساتذہ کو خلوص دل کے ساتھ یہاں کے ناساعد حالات سے مطابقت پیدا کرنی ضروری تھی۔ جس طرح مارتھا نے اسکول میں آنے والے غیر تربیت یافتہ اساتذہ کی طرف دھنسی ہوئی آنکھوں والے بچوں میں بلندی و بہتری کے امکانات تلاش کئے تھے، اسی طرح اسٹاف کے لوگوں کو بھی ان میں بلندی و بہتری کے امکانات تلاش کرنے کے لئے اس کی تقلید کرنی ضروری تھی۔

ایک دن مارتھا کو تھیوڈر روزویلٹ نے مطلع کیا کہ وہ ۸ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو اسکول دیکھنے آرہے ہیں۔ مارتھا نے اس موقع پر مسلم بھنے ہوئے جانوروں کے گوشت کی دعوت اور کھیلوں کے مقابلہ کا اہتمام کیا۔ روزویلٹ کی آمد کے دن بارش کے سبب میدانوں میں پانی بھر گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسکول کے بینڈ نے ایک استقبالی دھن بجائی اور روزویلٹ نے اپنے پتلون کے پائنچوں کو اوپر اٹھاتے ہوئے زندہ دلی کے ساتھ کہا، "یہ بڑی زبردست بارش ہے۔"

پھر روزویلٹ نے بیلوں کی گاڑی میں سوار ہو کر کھیت، شفتالو اور سیبوں کے باغ، لانڈری ڈبوں میں گوشت، مچھلی اور پھل وغیرہ محفوظ کرنے کا کارخانہ، انعامی ڈیری کی بکریوں کا گلہ، غلہ بھرنے کے کھتے، بکری اور لکڑی کے کام کے کارخانے کا معائنہ کیا۔ جو کچھ انھوں نے دیکھا، اس کی بے حد تعریف کی۔ عبادت خانے میں اپنی تقریر کے دوران میں روزویلٹ نے اس بات پر زور دیا کہ آموختہ ہونے سے ترقی کا جویندہ ہونا زیادہ اہم ہے۔ دوسری صبح طالب علموں نے یہ نیا نعرہ شروع کر دیا، "سیکھنے والے نہیں، ترقی پانے والے بنو۔"

اپنی خدمات سے مارتھا نے بہترین مثال قائم کر دی۔ یہاں تک کہ جب اس کی ماں کی آنکھیں بند ہونے لگیں، اس وقت بھی وہ گھر پر اپنا زیادہ وقت گزارنے کی مجبوری محسوس کرنے کے باوجود دن میں دس گیارہ گھنٹے اسکول کے خطے میں ہی گزارتی رہی۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں اس کا وزن گھٹنے لگا اور اس کو چکر آنے لگے۔ اس وجہ سے ڈاکٹروں نے اسے مکمل طور پر آرام کرنے کی تاکید کر دی۔

مارتھا کی ایک بہن لورا تھی، جس نے اٹلانٹا کے رہنے والے مسٹر جے۔ بلوم کیمپل سے شادی کر لی تھی۔ اس بہن نے مارتھا سے اصرار کیا کہ وہ ان کی بہن جینی کے پاس چلی جائے جو روم اور اٹلی میں

شہزادی اسپولی کے نام سے مشہور تھی۔ لورا نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا کہ " اسکول کے اخراجات کی نگرانی میں کروں گی۔"

بلآخر مارتھا نے لورا کی بات مان لی اور اپنی بہن کے پاس چلی گئی۔ وہاں جاکر اس نے مطالعہ کیا۔ نئے نئے مقامات کی سیر کی، اور اجنبی لوگوں سے شکاری کتوں کی نسل کشی سے لے کر بیری اسکول تک، ہر موضوع پر گفتگو کی۔ جینی کے پاس ٹھہرنے کے بعد وہ کارلس بیڈ ہیں ایک صحت افزا مقام پر چلی گئی لیکن اس کے وہاں پہنچنے کے بعا پہلی جنگ عظیم کی ابتدا سے پہلے کے تشدد کے واقعات شروع ہوگئے اس وجہ سے اس کا قیام بہت مختصر رہا۔

پھر اپنے کام پر واپس آجانے سے مارتھا کو بے حد خوشی ہوئی۔ اسے خاص طور پر اب بڑی عمر کے لڑکوں کے لیے مواقع فراہم کرنے کی فکر تھی۔ یہ لڑکے فی الواقع جسمانی اعتبار سے تو مرد تھے، لیکن ان میں بنیادی شعور کی کمی تھی۔ چنانچہ ۴ جنوری ۱۹۱۶ء کو اس نے اپنے بورڈ کی مخالفت کے باوجود، کوہ لیونڈو کی ترائی کے جنگل میں بیری ماؤنٹین اسکول قائم کردیا۔ یہ جگہ اصل اسکول سے پانچ میل کے فاصلے پر واقع تھی، اس نئے اسکول کو وہ ہائی اسکول کے طور پر استعمال کر سکتی تھی۔ اس ماؤنٹین اسکول کے پاس اپنے مویشی، بھیڑیں اور پھلوں کے باغ تھے، اور یہاں زراعتی تعلیم کا ایک الگ شعبہ موجود تھا۔ نیلے رنگ کی چست پتلونیں پہنے ہوئے اسکول کے اساتذہ لڑکوں کے شانہ بشانہ کام کرتے تھے۔ علاوہ ازیں جنگلات کی تجدید، عمارتی لکڑی کے درخت اگانا، ہل کے لیے پانی کھینچنے کا بہت بڑا پمپ لگانا اور دو جھیلوں کی تعمیر کے خاص منصوبے بھی اس اسکول کے پروگرام میں شامل تھے۔

اپریل ۱۹۱۷ء میں امریکہ پہلی جنگ عظیم میں شامل ہوگیا۔ مارتھا نے جب خاکی وردیوں اور نیلے رنگ کی بحری فوج کی وردیوں میں ملبوس لڑکوں کو فوجی ٹرینوں میں سوار ہوتے ہوئے ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلی ہوگئیں۔ حکومت نے مارتھا کو خفیہ معاملات کے ایک مشن پر یورپ بھیجنے کی پیشکش کی، اور ریڈ کراس نے بھی اس کی خدمات طلب کیں۔ لیکن مارتھا سے صدر ولسن نے اپیل کی کہ وہ کلاسیں جاری رکھے۔ چنانچہ وہ اس اپیل پر ہی کاربند رہی۔

بیری اسکول کے لڑکوں نے محاذ پر نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ ایک افسر نے آگ اور خون کے اس طوفان میں ان کے حوصلے اور ہمہ گیری سے متاثر ہوکر اسکول کو ایک گراں قدر چیک بطور عطیہ پیش کیا۔

جنگ ختم ہو جانے پر محاذ سے واپس آنے والے لڑکوں نے جنگ میں قربانی دینے والوں کی یاد میں ایک لکڑی لیک، اور ایک یادگاری سڑک تعمیر کی اور اس کے دونوں جانب درخت اور پھولوں کے پودے لگائے۔

اب بیری اسکول میں پہلے سے بھی زیادہ طالب علم داخلہ لینے لگے تھے۔ کسی خاندان سے جب ایک طالب علم آ جاتا تو اکثر بڑے بھائی یا بڑی بہن کی تقلید میں چھوٹے بچے بھی یہیں داخلہ لینے آ جاتے تھے مس بیری اسکول کے لئے چندہ جمع کرنے کی غرض سے سینکڑوں میلوں کا سفر کرتی تھی۔ لوگ اکثر اس سے پوچھ بیٹھتے، "اگر طالب علم کام کرتے ہیں تو پھر اسکول خود کفیل کیوں نہیں ہے؟"

مارتھا وضاحت کرتے ہوئے کہتی کہ ہر طالب علم اسکول کو جو کچھ کما کر دیتا ہے، اس پر اس سے کہیں زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ اگر مارتھا ان کے عقائد کی پیروی منظور کر لیتی تو بہت سے کلیسا اس کی مدد کرنے کے لئے تیار ہو سکتے تھے۔ اگرچہ مارتھا خود اسقفی حکومت کی پیرو تھی۔ لیکن وہ اسکول کو بین المذاہبی نقطۂ نظر کا حامل رکھنا چاہتی تھی۔

وہ بیش قیمت تحائف کا شکریہ ادا کرتی تھی۔ لیکن پہاڑی باشندوں سے ان کے سخت جانفشانی سے کمائے ہوئے کوارٹرز اور پچاس سینٹ کے نوٹ بطور عطیہ وصول کر کے وہ بے حد خوش ہوتی تھی۔ ایک بار ایک پہاڑی عورت نے اسے لکھا "جو رقم میں نے سردیوں کے کوٹ کے لئے بچا کر رکھی تھی وہ اسکول کے لئے بھیج رہی ہوں۔"

مارتھا کو توسیع اور سرمایہ کی فراہمی کے کام میں، بیری اسکول کے فارغ التحصیل گورڈن کیزن کا تعاون حاصل تھا۔ گورڈن انتہائی ذہین اور مستقل مزاج کمیشن ایجنٹ تھا۔ آئی ڈی ووڈسن نامی ایک نازک اور شوخ چہرے والی سولہ سالہ لڑکی اپنا محبوب بچھڑا بیچ کر اس رقم سے بیری اسکول میں داخلہ لینے آئی تھی۔ مارتھا نے اس لڑکی کو تربیت دے کر اپنا پرائیویٹ سکریٹری بنا لیا تھا۔

لوگ غول کے غول اسکول دیکھنے آتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے اسکول کی صنعت اور طالب علموں کے اخلاق وصحت مندی، یا مارتھا کے مسرور کن قہقہوں اور اس کے ناممکن کو ممکن میں بدلنے کے فلسفے سے متاثر ہو کر گراں قدر عطیات پیش کئے تھے۔ ان میں ایک اسٹیم لانڈری، ایک عبادت خانہ اور اسکول کے نام وقف کی ہوئی کچھ جائدادیں شامل تھیں۔

۱۹۲۳ء میں ہنری فورڈ اور ان کی اہلیہ کلیمرا نے بیری اسکولوں کا معائنہ کیا۔ مارتھا نے محسوس کیا کہ اس دولت مند شخص کے شاہینی طرز کے چہرے پر اطمینان و مسرت کی کوئی لہر نہیں ہے ہنری فورڈ کو تعلیمی اداروں کی جانب سے بدگمان تھے۔ لیکن مارتھا نے طالبعلموں کی زندگی میں جس قسم کی خوش تدبیری اور کفایت شعاری کو رواج دیا تھا، اسے ہنری فورڈ نے پسند کیا۔

مجمع سے بھرے ہوئے ڈائننگ ہال میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہنری فورڈ اور ان کی اہلیہ باورچی خانے میں گئے۔ مسز فورڈ تصنع سے عاری اور قدرداں خاتون تھیں۔ انھوں نے لڑکیوں کی قابلیت اور نفاست کی بے حد تعریف کی، پھر اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہا، "ہنری! ان لڑکیوں نے نفیس کھانے اس پرانے چولھے پر پکائے ہیں"

مسٹر فورڈ نے اپنی اہلیہ کو توجہ دلاتے ہوئے کہا، "شاید تم انھیں ایک بہتر چولھا دینا چاہو۔"

آخیر میں انھوں نے جو عطیات دیئے وہ چولھے سے کہیں زیادہ تھے۔ پھر کئی برس تک مسٹر ہنری فورڈ اور ان کی اہلیہ بیری اسکولوں کے سالانہ معائنہ پر آتی رہیں اور انھوں نے بینتیس لاکھ ڈالر سے زائد خرچ کر کے لڑکیوں کے اسکول کے لئے ایک ڈائننگ ہال، ایک باورچی خانہ، سونے کے بڑے کمرے، ناٹک اور محفل شعر خوانی کے لئے ایک ہال، تفریحات کے لئے ایک عمارت اور ایک عبادت خانہ تعمیر کرایا۔ خاکستری رنگ کے سنگ خارا کی بنی ہوئی گاتھک طرز کی یہ عمارتیں، اسی طرز تعمیر کے مطابق سیاہ چوکٹوں والے جھروکوں اور پتلے پتلے میناروں کے ساتھ تعمیر کی گئی تھیں۔ عمارتوں کے وسط میں ایک چوگوشی صحن تھا، جس کے عین بیچ میں ایک تالاب بنا ہوا تھا۔ ایک روز مسٹر فورڈ نے اس چوگوشی صحن کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "میں نے اس اسکول کے لئے کس قدر کم عطیہ دیا ہے۔ اس کی مکمل تعمیر کے لئے اگر دنیا کا تمام سرمایہ دے دیا جائے تب بھی ناکافی ہے۔"

ہنری فورڈ نے لڑکوں کے لئے ٹریکٹر اور اینٹیں بنانے کا کارخانہ بھی تعمیر کرایا اور اس کے تمام لوازمات بھی خرید کر پیش کئے۔ ایک دورے کے موقع پر وہ اور ان کی اہلیہ ایک آرکسٹرا بھی اپنے ساتھ لائے اور طالبعلموں کو ایک ہفتہ تک رقص کی تربیت دلائی۔

جب ماں کا انتقال ہوا تو مارتھا کی توجہ اسکول کی جانب سے کچھ ہٹ گئی۔ غم و اندوہ کے اس عرصہ میں خالہ مارتھا نے اس کی غم گساری کی۔ بعد ازاں مس بیری کو قومی التفات کے ایک امڈتے ہوئے سیلاب نے

گھیرلیا۔ یونیورسٹیوں نے اسے اعزاز عطا کئے۔ ماہرین تعلیم، گورنر اور حکومت کے منتظمین اس سے مشورے طلب کرنے لگے۔ ان تمام امور میں مارتھا کا بے حد وقت صرف ہونے لگا۔ چنانچہ اس قسم کے مطالبات سے عہدہ برآ ہونے میں خالہ مارتھا کی نکتہ رسی اس کے بے حد کام آئی۔

مارتھا کو روز ویلٹ میموریل ایسوسی ایشن کی جانب سے تمغہ پیش کرتے ہوئے صدر کولج نے کہا، "آپ کی وجہ سے ہزاروں بچے جہالت کی قید سے آزاد ہوگئے ہیں۔" پھر ۱۹۲۷ء میں ماہنامہ 'پکٹوریل ریویو' نے اس سال امریکی عوام کے لئے نمایاں ترین خدمات انجام دینے والی امریکی خاتون کی حیثیت سے مارتھا کو پانچ ہزار ڈالر کا انعام پیش کیا۔ لیکن غاروں میں رہنے والے ان بچوں کے لئے جو مارتھا کے ان کے گھر پہنچنے کے وقت بے تکلفی سے اس کی گود میں چڑھ جاتے تھے، مارتھا ابھی تک 'پوسم ٹروٹ کی اتواری خاتون' ہی تھی۔

اسکول میں نہ صرف جارجیا سے، بلکہ الاباما، ٹینیسی اور کیرولینا تک سے طالب علم آرہے تھے ایک لڑکا انڈیانا سے پیدل چل کر یہاں آیا تھا۔

اسکول میں داخلے کے منتظر طالب علموں کی ایک طویل فہرست کے باوجود، مارتھا نے اب بھی پہاڑوں میں جاکر ہونہار نوجوانوں کی تلاش کے لئے ایک طالب علم کو اپنا ڈرائیور بنا رکھا تھا۔ بعض اوقات کسی ہوشیار لڑکی کو ہل چلاتے ہوئے دیکھ کر مارتھا اس کے سرپرستوں سے درخواست کرتی کہ اس لڑکی کو اس کے ہمراہ بیری اسکول بھیج دیا جائے۔

کوئی ماں روتے ہوئے اپنی لڑکی کو رخصت کرتے ہوئے مارتھا سے اس کی وکالت کرتے ہوئے کہتی "آپ اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کریں گی۔" مارتھا اس عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے تسلی دیتے ہوئے کہتی، "سڑک کے آگے طالب علموں کی بہت بڑی آبادی ہے"

مارتھا کو پہاڑوں کے دورے کے دوران میں اپنے اسکول کے سابق طالب علموں سے ملاقات کرکے انتہائی خوشی ہوتی تھی۔ وہ نوجوان، جنھوں نے اسکول میں زراعت کے بہترین طریقے سیکھے تھے، مارتھا کو بڑے فخر کے ساتھ اپنی لہلہاتی ہوئی فصلیں دکھایا کرتے تھے۔ مارتھا کی صفائی اور حسن پسندی کی نصیحت یاد رکھنے والی بیری اسکول کی پڑھی ہوئی لڑکیاں اپنے صاف ستھرے گھروں میں اس کا خیر مقدم کرتی تھیں اگرچہ ان لڑکیوں کے گھروں میں آرائشی چیزیں گھر کی بنی ہوئی ہوتی تھیں اور فرش پر باقاعدہ بچھے ہوئے ہوتے تھے۔ لیکن کمروں کو بڑی فنکاری سے سجایا ہوا ہوتا تھا۔

اسکا جس قدر مصروف زندگی گزار رہی تھی اس سے خالہ مارتھ کو تشویش رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ مارتھا کو تنبیہہ کرتی رہتی تھی کہ وہ اپنے دماغ کو کچھ آرام دے۔ پھر طالب علموں نے مارتھا کے لئے لیونفیلو کی چوٹی پر ایک گوشۂ عافیت تعمیر کردیا تو اسے آرام کرنے کے لئے ایک پرسکون جگہ میسر آگئی۔ طالب علموں نے جب یہ مکان مارتھا کو پیش کیا تو اس نے کھڑے ہوکر کئی ایکڑ زمین میں پھیلے ہوئے اسکولوں کے قصبہ اور اس کے ماحول، درختوں اور چاندی کی طرح جگمگاتی ہوئی جھیلوں پر نظر ڈالی اور کہا "یہ وہ جگہ ہے جہاں سے میری روح کو ہمیشہ طمانیت حاصل ہوتی رہے گی" مارتھا نے اپنے خوابوں کے محل میں آرام کیا، مطالعے سے محظوظ ہوئی، بُنائی کی، دوستوں اور طالب علموں کے ساتھ خوش گپیوں میں وقت گزارا۔

بیری اسکول سے امتحان پاس کرنے کے بعد کالجوں میں جانے والے طلبا نے بتایا کہ انھیں کالج کے نئے ماحول سے ہم آہنگی پیدا کرنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں، اور معاشرتی زندگی میں شرکت کرنے کے لئے ان کے پاس سرمایہ نہیں ہے۔ یہ اطلاع ملنے پر مارتھا نے مخلوط تعلیم کا ایک جونیئر کالج بھی قائم کردیا۔ بعد ازاں چار سالہ کورس کا ایک باقاعدہ کالج قائم کیا۔ کالج کے نصاب میں جنگلات کا انتظام، پرنٹنگ، نجاری بجلی کا کام، خودکار مشینوں سے کام لینے کا ہنر اور زراعت شامل تھے۔ اس کے ساتھ ہی سکریٹری معلم دنداں ساز کے معاون، پادری یا موسیقار بننے کے خواہش مند طلبا کے لئے بھی کورس تھے۔

کچھ طلبا نے عملی تعلیم کی مقتضیات اور سخت گیرانہ ضابطے سے سرتابی کی، لیکن مارتھا نے انھیں بتایا کہ ان کے ہاتھوں کی محنت کے ثمر سے وہ مقامات فیض یاب ہوں گے جہاں وہ پل کر بڑے ہوئے ہیں۔ کالج کے اندر گریجویٹ لڑکوں کو شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی، لیکن مارتھا چاہتی تھی کہ بیری اسکول کے طالب علم لڑکے ہیں کی طالبات میں سے اپنے لئے بیوی منتخب کریں۔ اکثر اوقات ایسا ہوا کہ کالج سے ڈگری حاصل کرنے کے دوسرے ہی دن کسی جوڑے نے شادی کرلی، اور بعد میں رسومات ادا کرنے کے لئے کلیسا میں گئے۔

بہت سی لڑکیاں جو معمولی قسم کے سوتی کپڑوں میں اسکول آئی تھیں کلیسا کی نشستوں کے درمیانی راستے سے، مارتھا کے پیش کردہ جھالردار عروسی جوڑے میں ہلکورے لیتی ہوئی خراماں خراماں واپس گئیں، ایسے موقع پر مارتھا کہا کرتی تھی "میں تم دونوں کی زندگی کے اس حسین آغاز پر اپنی بہترین خواہشات پیش

کرتی ہوں :

مارتھا کے بال چاندی کے تاج کی مانند نظر آتے تھے ۔ اور وہ خوبصورت گون پہن کر شادی کے بعد کی استقبالیہ تقریب کی صدارت کرنے آتی تھی ۔ ان تقریبات میں اس نے دیکھا کہ ہر دولہن اپنا ، اپنے دولہا کا اور شادی کے کیک کا فوٹو اتروا تی ہے ، تاکہ برسوں تک اس لمحے کو اپنے حافظے میں محفوظ رکھ سکے۔

مارتھا نے بیری اسکول کے گریجویٹوں اور اساتذہ سے اپنا تعلق برقرار رکھنے کی پوری پوری کوشش کی ۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہر پیشے میں اپنی زندگی کے لئے بہترین مواقع فراہم کرنے میں طلبا کو دشواری ہوتی ہے ۔ مارتھا نے کچھ دور افتادہ اسکولوں کا معائنہ بھی کیا ۔ ان اسکولوں میں اس نے دیکھا کہ طلبا کو بیری اسکول کے نظریات کے مطابق ڈھالا جاتا ہے ۔ اس طرز عمل کو اس نے اپنی خدمات کا عظیم صلہ سمجھا۔

برسوں تک تو اسکول کا یہ حال رہا کہ کبھی مارتھا کے پاس اتنا سرمایہ بھی نہیں ہوتا تھا ، جس سے وہ اسکول کے ایک ماہ کے اخراجات کی طرف سے مطمئن ہو سکتی ۔ رہائشی گرجی کی فروخت ، زندگی پیداوار ، ڈیری کی مصنوعات اور صنعت کاری کی چیزوں کی فروخت سے تقریباً ایک لاکھ ڈالر کی سالانہ آمدنی ہو جاتی تھی ۔ اور اوقاف سے بھی اتنی ہی رقم مل جاتی تھی ، لیکن احتیاجات پورے کرنے کے لئے اس سے کہیں زیادہ سرمایہ درکار ہوتا تھا ۔

۱۹۳۰ء کی قومی کساد بازاری نے مارتھا کے اسکولوں کو بے حد متاثر کیا ۔ معاونین اپنے وعدے پورے نہیں کر سکے ۔ اسکول میں پہلے سے زیادہ طالب علم داخل ہو چکے تھے ، لیکن ان میں ایسے طلبار کی تعداد بہت کم تھی جو فیس ادا کر سکتے تھے ۔ چنانچہ مارتھا نے سبزیوں کے نئے باغات لگانے کا حکم دیا ۔ ڈبوں میں اشیائے خوردنی بھرنے کے کارخانوں میں فاضل وقت میں بھی کام کرایا ، اور طلبا کو ہدایت کی کہ " کافی میں شکر کم استعمال کرو ، اور جہاں تک ممکن ہو کم سے کم بجلی جلاؤ " بہت دنوں تک طلبا کے طعام کی فہرست میں صرف سبزیوں کا سوپ ، مکئی کی روٹی اور سوئے کی بھجیا ہی شامل رہی ۔

مارتھا نہ صرف اپنے طلبا بلکہ پہاڑی باشندوں کی جانب سے بھی تشویش میں مبتلا تھی ۔ ایک شخص نے اس سے کہا ، " میرے معصوم بچوں کے لئے کھانے تک کو نہیں ہے ۔ نہایت بری حالت ہے " مارتھا نے اس شخص کو اسکول کی زمین پر کاشتکاری پہ مامور کر دیا ۔ دیگر اشخاص کو بھی اس نے کام سے لگایا اور انھیں معاوضے کے طور پہ اناج دیا ۔

کام سے فائدہ اٹھانے کے طرزِ عمل سے جزوی طور پر مستفید ہونے کے لئے مادر تھا نے مزید عمارتیں تعمیر کرانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے بورڈ کے ممبران سے کہا، "ہمارے پاس اپنی لکڑی کے ذخیرے موجود ہیں۔ ہماری اپنی اینٹیں ہیں۔" لیکن اس کام میں لکڑی اور اینٹوں کے علاوہ بھی بہت کچھ صرف ہوا، اور محاسب اعلیٰ ہر مہینے ہوگ کو قرض خواہوں کی بار بار تسلی کرنی پڑتی۔

پھر وہ دن بھی آئے جب اسکول کے پاس تاگریا اشیا کا ذخیرہ بھی موجود نہیں تھا۔ اور مادر تھا اس قدر علیل تھی کہ سرمایہ جمع کرنے کے لئے باہر بھی نہیں جا سکتی تھی۔ "اب تو کوئی معجزہ ہی ہمیں بچا سکتا ہے۔" مادر تھا نے آنی پیز سے کہا جو بیری اسکول کے گریجویٹ لڑکے سے شادی کرنے کے بعد مادر تھا کی سیکریٹری کی حیثیت سے یہیں مقیم تھی۔ "لیکن ہم دعائیں کئے جائیں گے"۔

آخر وہ معجزہ یوں ظہور میں آیا کہ اسکول کی ایک پرانی محسن مسز جی۔ لسٹر کالڈ ویل نے دو ماہ کے اخراجات کے لئے ایک چیک ارسال کر دیا۔

۱۹۳۰ء کے وسط تک، عام سرد بازاری کے باوجود لوگوں کی اس قدر وسیع تعداد نے رحمت کا فرشتہ بن کر اسکول کا معائنہ کیا کہ مس بیری کو آئندہ چندہ جمع کرنے پر زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن بیری کی مختلف اسکیموں کے انتظامات ایک عظیم مسئلہ تھے، کیونکہ اس میں ایک سو پچیس عمارتوں پر مشتمل ایک اسکیم اور بارہ سو سے زائد طلبا کی نگرانی کا کام شامل تھا۔

مادر تھا اب بھی ہر معاملے کی روحِ رواں تھی اور متواتر ترقی کی جانب بڑھتی جاتی تھی۔ لیکن انہیں اس بات کی ندامت تھی کہ ہر طالب علم سے فرداً فرداً اس کا تعلق برقرار نہیں رہا تھا۔ جب کبھی ممکن ہوتا وہ آتشدان کے گرد لڑکیوں کا گروہ جمع کر لیتی اور اس وقت جو بھی موضوع ان کے دل کو بھاتا اس پر گفتگو کرنے لگتی تھی۔ ان موضوعات میں غالباً سب سے اطمینان بالذات کے خطرات اور خود کفیل ہونے کی ضرورت کے موضوع زیادہ پسند تھے۔

اسکول کے علاقے میں پیدل یا سواری کے ذریعے گزرتے ہوئے، مادر تھا کسی خمیدہ تختے، عمارت کی کسی دیوار سے اکھڑے ہوئے ٹائل اور کسی نئے کمرے کے کسی میلے کچیلے پردے کو فوراً بھانپ لیتی تھی۔ معائنے کے دوران میں جن طلبا سے ان کی مڈبھیڑ ہوتی، وہ ان سے کہا کرتی تھی "ہمیں پوری طرح محتاط ہو کر قدم اٹھانے چاہئیں ـــ اور دیکھو یہ چیزیں اٹھاؤ۔"

مارتھا جب ۸۰ سفر برس کی ہوگئی تو ڈاکٹروں نے تاکید کی کہ اب اس کو آرام کی ضرورت ہے چنانچہ وہ دوبارہ اپنی بہن لورا کے تعاون سے چندہ جمع کرنے یورپ روانہ ہوگئی۔ لندن میں قیام کے دوران میں اسے کورٹ آف سینٹ جیمس میں شرکت کے لئے دعوت نامہ دیا گیا۔

اس سفر سے واپسی پہ اپنی گھنٹیوں میں اضافہ کرنے کے لئے وہ اپنے ہمراہ کچھ گھنٹیاں لائی۔ جن میں مختلف قسم کی سوئٹزرلینڈ کے طرز کی گھنٹیاں بھی شامل تھیں۔ واپس آکر وہ پھر پوری سرگرمی کے ساتھ اپنے ان فرائض میں منہمک ہوگئی جو اس کے منتظر تھے۔

۱۹۳۹ء میں مارتھا کی قدر شناسی کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اعزازی ڈگریاں تو اسے پہلے ہی مل چکی تھیں۔ اب ٹاؤن ہال کی جانب سے بہترین کارنامے سرانجام دینے پر اسے سونے کا تمغہ پیش کیا گیا اور جارجیا کی یونیورسٹی کے بورڈ آف ریجنٹس میں پہلی خاتون ممبر کے طور پر اس کو شامل کیا گیا۔ سوشل سائنس کے قومی ادارے کی جانب سے نیویارک میں ہوٹل والڈ روف اسٹوریا کی چھت "اسٹارلائٹ" پہ اسے سونے کا تمغہ پیش کیا گیا۔

اگلے سال امریکی یونیورسٹی کلبس نے انسانیت نوازی سے متعلق اپنا سالانہ اعزاز مارتھا کو پیش کیا۔ یہ تنظیم متنظمین فلم کی جانب سے ذاتی دادو دہش کو فروغ دینے کے لئے کام کر رہی تھی۔ مارتھا کے ڈاکٹر کی تجویز تھی کہ مارتھا ڈلاس میں ہونے والے کنونشن میں انعام لینے کے لئے جانے کے قابل نہیں ہے۔ کیونکہ وہ بہت کمزور ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس نے ہوائی جہاز میں اپنی نشست محفوظ کرائی۔

۱۹ اپریل کو وہ ٹیکساس پہنچ گئی۔ ڈلاس کے ہوائی اڈے پر ایک ہجوم نے اس کا پرتپاک استقبال کیا، اور استقبال کرنے والوں کے ایک نمائندے نے اسے چرواہوں کا ہیٹ پیش کیا۔ جب کاروں کا قافلہ سڑک پر روانہ ہوا تو مارتھا نے یہ ہیٹ سر پہ رکھ لیا۔ پھر جب وہ تقریب گاہ میں پہنچی تو پندرہ سو فلم سازوں اور نمائش کنندگان فلم نے کھڑے ہو کر اس کا پرجوش طریقے سے خیر مقدم کیا۔ اس تقریب میں شرکا کو محظوظ کرنے کے لئے ریڈیو اور فلم کے پیشہ ور آرٹسٹ بھی شریک تھے، لیکن اس شور میں لوگوں کی دلچسپی کا مرکز مارتھا ہی رہی۔ تقریب کنندگان نے اسے انسانی بہبودی کے نئے نمایاں کارنامے انجام دینے کے اعتراف میں دھات کی ایک منقش تختی پیش کی، اور اس کے

ساتھ ہی ایک ہزار ڈالر کا نذرانہ اس کے دل پسند خیراتی فنڈ کے لیے پیش کیا۔

پھر اپنے اسکولوں کی بستی میں واپس آنے کے بعد مارتھا کی رفتار کچھ مدھم ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد اسے زیادہ سے زیادہ آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن مارتھا نے کہا، "ہمارے ان جسموں کی حقیقت محض اتنی ہے کہ خداوند نے ہمیں اپنے اطراف میں اپنی بار برداری کے لیے یہ جسم عطا کیے ہیں، لیکن اصل حقیقت تو انسان کی روح ہے۔"

اگست ۱۹۴۱ء میں معالجوں نے اسے اٹلانٹا کے ہسپتال میں داخل کرا دیا

دن ہفتوں میں تبدیل ہوتے گئے، لیکن انتہائی کمزوری کے باوجود مارتھا بیری نے اپنی سیکرٹری آئی نیز کو ہدایت کی کہ روزانہ اسے اسکول کے مسائل اور حالات سے باخبر کرتی رہے۔ اس نے طویل خطوط اور یادداشتیں لکھوائیں۔ "بورڈ سے کہو..... شادی کی تقریب کو زیادہ سے زیادہ پُرمسرت بنانے کے لئے جو کچھ ممکن ہو ضرور کرو..... لڑکوں سے معلوم کرو کہ....."

جب مارتھا کو اسکول کے لئے اس قدر کم خدمات انجام دینے کا احساس ہوتا تو وہ سخت مایوس ہو جاتی تھی۔ پھر وہ بیری اسکول کے تعلیم یافتہ ڈاکٹروں، وکیلوں، سائنس دانوں اور سنیٹروں کی خدمات کے متعلق سوچنے لگتی۔ ان میں ایک امیوری (ایگزینڈر) تھا، جو ملک میں دیہی اقتصادیات کے ماہر کی حیثیت سے مشہور تھا۔ یہ شخص بیل گاڑی چلاتا ہوا بیری اسکول میں آیا تھا۔ یا تونی جان ہنری کارسن کو یاد کر کے اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ یہ لڑکا ایک وقت میں سرکس کا نقارچی تھا، لیکن بعد میں پادری بن گیا تھا۔

مارتھا کی مزاج پرسی کے لئے اس کے بھائی، بہنیں، دوست احباب، بیری اسکول کے اساتذہ اور طالب علم سبھی آتے رہتے تھے۔ مارتھا ان ملاقاتیوں، نرسوں اور اپنے ساتھ کے مریضوں اور پہیوں والی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے بچوں کے ساتھ گپ شپ اور ہنسی مذاق کر کے اپنا وقت گزارتی رہی۔

اکتوبر کی ۷ تاریخ کو "پہاڑی دن" منایا جاتا تھا۔ مارتھا کی سالگرہ بھی اسی تاریخ کو ہوتی تھی۔ لیکن اس بار مارتھا، ۷ اکتوبر کو ہسپتال کے بستر میں پڑی پڑی مروجہ تقریبات کے ذہنی نقش ابھارتی اور سوچتی رہی کہ "بعد میں کیا ہو گا، لوگ آگے بڑھیں گے اور اسکول کے لئے چندہ جمع

کرنے کے لئے ایک ٹوکری میں پھینک ڈالیں گے" ہال میں کسی کے قدموں کی آواز سن کر اس نے تصویرات کے نیچوں سے نظریں اٹھائیں اور دیکھا کہ اسکول کی لڑکیاں ہلکے رنگوں کا ایک تین پرت والا بڑا سا کیک اٹھائے چلی آرہی ہیں۔

ان میں سے ایک لڑکی نے شوخی سے کہا، "پچھتر شمعیں ہیں، گن کر دیکھئے۔"

یہ لڑکیاں کچھ دوسری عمدہ عمدہ چیزیں اور چاندی کے پچھتر ڈالروں کی ایک تھیلی بھی اپنے ہمراہ لائی تھیں۔ یہ رقم انھوں نے اور دیگر لڑکیوں نے فاضل وقت میں کام کر کے جمع کی تھی۔

مارتھا طالب علموں کی اس پرخلوص پیش کش پر انتہائی جذباتی ہوگئی۔ اسے ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہ مل سکے۔ دوپہر کے وقت سارے بیری اسکول کے نغمات بج اٹھے۔" ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ آواز اسکول سے آرہی ہو"۔ اس نے مسرور ہو کر کہا، "لیکن کیسے......"

آئی نیز نے اسے بتایا کہ "یہ اسکول کی گھنٹیوں کا راگ ہے۔ طالب علموں نے ایک لاؤڈ اسپیکر نصب کیا ہے، اور ایک میوزک کمپنی کے ذریعہ گھنٹیوں کی آواز کو یہاں تک پہنچانے کا انتظام کیا ہے۔"

مارتھا نے بے حد مسرور ہو کر کیک تراشا اور ملاقاتیوں، ڈاکٹروں، نرسوں اور مریضوں کو اپنی مسرتوں میں شریک کیا۔ آئی نیز نے کارڈوں، تاروں اور خطوط سے بھری ہوئی ٹوکری اس کے سامنے رکھ دی۔ یہ پیغامات ممتاز شخصیتوں اور پہاڑی دالدین کی طرف سے موصول ہوئے تھے کچھ پیغامات ایسے بھی تھے جو خاکی رنگ کے، ریپنگ پیپر پر لکھے ہوئے تھے، اور ان لڑکیوں نے بھیجے تھے جو کھیتی باڑی چھوڑ کر بیری کے اسکول میں پڑھنے آئی تھیں۔

مارتھا نے آئی نیز سے اصرار کیا کہ وہ پہاڑی دن کی تقریبات میں شرکت کے لئے روانہ ہو جائے، اور کہا، "ان لوگوں سے کہنا کہ انھوں نے اپنی محبتوں سے مجھے لازوال مسرتیں بخشی ہیں۔"

دو ماہ بعد پرل ہاربر پر جاپانیوں کے حملے نے امریکہ کو دوسری جنگ عظیم میں دھکیل دیا۔ آئی نیز اور دیگر اشخاص نے جنگ کے زمانے میں لاپتہ ہو جانے والے لڑکوں کی وحشتناک خبروں کو مارتھا سے چھپائے رکھا۔ سپھر ۲۷ فروری ۱۹۴۲ کو اٹلانٹا میں پہلی بار بلیک آؤٹ ہوا۔ مارتھا کی ہمت بندھانے کے لئے آئی نیز اس کے کمرے میں داخل ہوئی، اور اس کا

ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، لیکن اس کی زندگی کی شمع گل ہو چکی تھی۔

بیری اسکول کے عبادت خانے میں ماتمی گھنٹی بجنے لگی، اور طلبا اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر غم زدہ چہروں سے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ میلوں دور پوسم ٹروٹ اور ہوروس لیگ اور ماؤنٹینش تک، یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ اب اتواری خاتون ضلمت کی تلاش میں کبھی دوبارہ پہاڑوں کے چکر نہیں لگائے گی۔

مارتھا کی آخری رسومات میں شرکت کرنے کے لئے حکومت کے افسر اور مردوں اور عورتوں کا جم غفیر جمع ہو گیا، جو سرخ مٹی کے پہاڑوں سے افلاس، جہالت اور پس ماندگی کے مارے ہوئے پیدل چل کر بیری اسکول تک آئے اور یہاں سے اعلیٰ شہری بن کر لوٹے تھے۔

مارتھا کی وفات پر اخبار اٹلانٹا کانسٹی ٹیوشن نے اعلان کیا کہ، "ہمارے عہد کی کسی خاتون نے مارتھا بیری سے زیادہ عظیم کارنامے انجام نہیں دیئے" مارتھا بیری نے اپنے حوصلے، دیانت اور بے غرضی سے مایوس لوگوں کے لئے روشنی کا ایک مینار تعمیر کر دیا تھا۔



کچھ مصنّف کے بارے میں

ایلیا فورسی رقم طراز ہے: "ہائی اسکول اور یونیورسٹیوں میں پڑھاتے ہوئے اور دائی ٹین کیمپ میں صلاح کار کے فرائض انجام دیتے ہوئے، مجھے نوعمروں سے اور ان کی صلاحیتوں سے گہری دلچسپی ہو گئی تھی۔ پھر جب میں نے معلمی کے پیشے کو چھوڑ کر تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا تو ناگزیر طور پر ایسی کتابیں تصنیف کرنے کی سعی کی، جن کے متعلق مجھے امید تھی کہ ان کے مطالعہ سے قارئین کے خیالات میں انقلاب پیدا ہو گا۔ اور وہ ان کے مطالعے سے اپنی زندگی کو اپنے خوابوں کے مطابق بنانے کی کوشش کریں گے۔ میں ان مصنفوں میں سے نہیں ہوں جو فخر کے ساتھ، کم سنی میں لکھے ہوئے اپنے کسی ناول یا کسی ڈرامے کی نشان دہی کر سکتے ہیں۔ اور تصنیف و تالیف کا ایک طویل مرحلہ طے کر چکے ہیں۔"

مس فورسی کے بچپن کا بیشتر حصہ بیڈ کننگ (جنوبی ڈیکوٹا) میں بسر ہوا، جہاں اس کے والد معالج تھے۔ فورسی کو فرصت کے مشغلوں کے طور پر موسیقی، بسر دیوں کے کھیل، گرل اسکاؤٹنگ، کیمپنگ اور مطالعے سے رغبت تھی۔ اُسے وائلن کا بے انتہا شوق تھا۔ لیکن وائلن کی تربیت بہت تاخیر سے شروع کرنے کے باعث موسیقار کا پیشہ اختیار کرنا ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ ساؤتھ ڈیکوٹا اسٹیٹ کالج میں اس نے سائنس اور سوشل سائنس میں امتیاز حاصل کیا۔ بعد ازاں میک فیل کالج آف میوزک سے موسیقی میں بیچلر کی ڈگری حاصل کی اور یونیورسٹی آف کولوریڈو سے ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ وہ مینیسوٹا میں معلمی کے پیشے کے ساتھ ساتھ روچیسٹر سوک سمفنی اور ڈلتھ سمفنی کے آرکسٹرا کی محفلوں میں بھی شریک ہوتی رہی۔

مس فورسی کی موجودہ سکونت بولڈر (کولوریڈو) میں ہے، جہاں وہ تصنیفی کاموں سے

وقت نکال کر پکنک اور چٹانی علاقوں میں اسکاؤٹوں کے کیمپ میں شرکت کرتی رہتی ہے اور موسیقی کا ذوق بھی جاری رکھے ہوئے ہے۔

Title of the original : WOMEN WHO REACHED FOR TOMORROW

Auther : Aylesa Forsee

Original publisher : Macrae Smith Company, Philadelphia